افکارِ اقبالؒ

محمد حامد

افکارِ اقبالؒ

محمد حامد

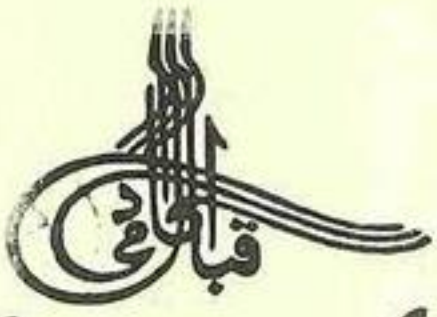

جملہ حقوق محفوظ ہیں:

ناشر ——— اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

طبع اوّل ——— جنوری ۱۹۸۶ء

مطبع ——— میسرز پرنٹرز، پنج محل، مزنگ روڈ لاہور

نگرانِ طباعت ——— فرخ دانیال

تعداد: ——— ایک ہزار

قیمت: ۸۰ روپے

فہرست مضامین

۱۔	دیباچہ	۵
۲۔	اقبال اور قرآنِ حکیم	۸
۳۔	اقبال کا نظریۂ فن	۳۹
۴۔	حضور اکرم صلعم کے تنقیدی معیارات	۴۷
۵۔	اقبال اور تحقیقاتِ اسلامی	۷۴
۶۔	اقبال اور قدیم و جدید کی کشمکش	۱۳۰
۷۔	اقبال کا نظریۂ علم	۱۴۲
۸۔	اقبال، فلسفہ اور تاریخ اسلام	۱۵۷
۹۔	اقبال اور عرب و عجم	۱۷۲
۱۰۔	اقبال اور علمائے کرام	۲۱۲
۱۱۔	اقبال اور معاشیات	۲۳۴

(۱۳) اقبال اور تصوّف ۲۵۵
● — شخصیات ۲۷۷
● — کتابیات
● — ضمیمہ جات
● — اشاریہ ۳۱۰

دیباچہ

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے مجھے یہ کتاب لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی ہزار ہا رحمتیں ہوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر اور ان تمام نیک بندوں پر جو آپ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے اور جن کے نفوسِ قدسیہ کی وجہ سے اسلام کی نعمت ہم تک پہنچی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے والدین اور اساتذہ کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق عطا کرے ان کی تربیت کی وجہ سے ہیں یہ سطور لکھنے کے قابل ہو سکا۔

علامہ اقبال جن کے افکار کے مختلف پہلوؤں پر میں نے لکھنے کی کوشش کی ہے برصغیر ہی نہیں پورے عالمِ اسلام کی ذہنی و فکری تاریخ میں ایک انتہائی اہم مقام کے حامل ہیں۔ اس دور میں جب مغرب کا سحر پورے مشرق پر طاری تھا، انہوں نے اس سحر کو توڑنے کی کامیاب کوشش کی اور اُمتِ مسلمہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ علامہ پر لکھی گئی کتب کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات علامہ کے فکر میں موجود توانائی اور حرارت کے عنصر کو پوری طرح سمو نہیں سکے۔ علامہ جس دور میں پیدا ہوئے وہ سیاسی غلامی کے اثرات کی وجہ سے انہیں پوری طرح سمجھنے کا اہل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا مسلم نوجوان علامہ کے پیغام کو کہیں بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ ہم ساتویں دہے کے آخر میں پہنچ چکے ہیں اور علامہ کے دور کی سیاسی ناتوانی ختم ہو چکی ہے مسلم اقوام کے ضمیر میں ایک ہلچل ہے۔ وہ مغرب کے الحاد کے تجربے سے گذر کر اب اسلام کی طرف پلٹ رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ کے شعری مجموعوں کو ہی نہیں بلکہ ان کے نثری سرمائے کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے افکار کو از سرِ نو ترتیب دیا جائے۔ علامہ کی اس دعا کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ:

؎ برجواناں سہل کن حرفِ مرا

یہ کتاب اسی مقصد کی جانب ایک قدم ہے علامہ نے مسلمانوں میں علمی ذوق پیدا کرنے اور علمی تحریکات کے فروغ میں جو اہم کردار ادا کیا۔ وہ عام طور پر نظروں سے اوجھل رہا ہے

اسی طرح تصوف کے بارے میں علامہ کے افکار کا بھی کما حقہ، جائزہ نہیں لیا گیا ابو سعید صاحب کی کتاب ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے پھر بھی اس پر مزید لکھنے کی ضرورت ہے اسی طرح رحیم بخش شاہین صاحب کی کتاب کے علاوہ اقبال کے معاشی افکار کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ اقبال کے افکار کی تاریخ علامہ کے قرآن حکیم سے تعلق کو بیان کیے بغیر ادھوری رہے گی۔ اسی طرح اقبال کا عجمی خیالات کے بارے میں نقطہ نظر بھی کھل کر سامنے نہیں آیا۔ علامہ افکارِ اسلامی کے احیاء و تجدید کے بارے میں کیا نظریات رکھتے تھے اور علماء کے ساتھ ان کا کیا تعلق تھا۔ اس کے بارے میں لکھنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان موضوعات کو مختصر انداز سے بیان کر دیا جائے اور علامہ کے افکار کی ترجمانی خود ان کی تحریروں کی روشنی میں کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ اقتباسات طویل ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ اقبال کے اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے ضروری تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اقبال کو خود ان کے افکار کی روشنی میں بیان کیا جائے۔ اور ایسے خیالات ان کے ذمے لگانے سے احتراز کیا جائے۔ جو ان کی فکر کے خلاف ہوں۔ تاہم اگر قارئین کو کسی جگہ کوئی ایسی بات نظر آئے جو ان کے خیال میں علامہ کی مجموعی فکر سے ہم آہنگ نہ ہو تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں

آخر میں پروفیسر رحیم بخش شاہین صاحب، محمود احمد غازی صاحب، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب، بشیر احمد ڈار صاحب، مختار مسعود صاحب، ڈاکٹر احسان حقی صاحب (دمشق) اور دیگر بہت سے اصحاب جن کی معاونت، دلچسپی اور دعائیں میرے ساتھ رہیں۔ میں ان سب کا بے حد ممنون ہوں۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے لائبریرین قمر صاحب، فخر صاحب اور ان کا سٹاف بھی میرے شکریے کا مستحق ہے اس کتاب کا اکثر حصہ لائبریری کے پُرسکون ماحول میں لکھا گیا۔

اقبالیات کے موضوع پر یہ میری پہلی کاوش ہے۔ اس میں اگر کوئی خوبی

نظر آئے تو وہ آپ کا حُسن ظن، ہوگا۔ اور اگر اس میں کوتاہیاں نظر آئیں تو اس کے لیے مجھے آگاہ فرمایئے۔ امید ہے کہ نقش ثانی اس سے بہتر ہوگا۔

محمد حامد
پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول

علامہ اقبالؒ اور قرآن حکیم

علامہ اقبال نے انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو گرد و پیش کی دنیا میں مغربی تمدن اور مغربی افکار کا چلن تھا۔ ۱۸۵۷ء کے خوں آشوب حادثے کے اثرات ابھی باقی تھے یہ مسلمانوں پر اضمحلال کا دور تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان اب بھی شمال مغربی ہند میں انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اور خود برصغیر میں بھی انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ لیکن مجموعی طور پر قوم کا ذہین ترین طبقہ یا تو انگریز کے جبر و تشدد کا شکار ہو کر جزائر انڈیمان میں زندگی گذار رہا تھا دہلی سے لکھنؤ تک پھیلی ہوئی شاہراہ پر لگے ہوئے درختوں پر اپنے لہو رنگ جسموں کو زینت بنا چکا تھا۔ کہیں کہیں اکّا دکّا آواز سنائی دیتی تھی۔ لیکن مجموعی طور پر قوم سناٹے کے صحرا میں بھٹک رہی تھی۔ اس کے رہنما اپنے آپ کو ہوا خواہانِ دولت برطانیہ میں شمار کروانے کو اپنی دینوی اور اخروی سعادت کا سرمایہ تصور کر رہے تھے اور انیسویں صدی کے نصف اول کے برطانوی مفکرین کی تحریروں کو ایک برتر و بالا فکر کا درجہ دے رہے تھے جان سٹورٹ مل، رسکن اور اسی قبیل کے دوسرے مصنفین کا علمی رعب داب اس حد تک قائم تھا کہ بس انہیں کا فرمایا ہوا مستند تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مکتبوں اور گھروں میں اب بھی قرآن حکیم کی تلاوت کی جاتی تھی۔ لیکن قرآن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے زندگی بخش پیغام نہیں بلکہ محض ایک روایت کی حیثیت بن

کر رہ گیا تھا اب یوں بھی غلامی کی اس سیہ رات میں اجتماعی زندگی کے مطالبات اور مسائل کو حل کرنے کے لیے اس سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی جا رہی تھی اس کی جگہ ضابطہ تعزیرات ہند نے لے لی تھی۔ قرآن اب سرکاری فیصلوں اور عدالت کی کارروائیوں میں حوالے کے کام نہ آتا تھا۔ اور نہ ہی معاشرے کے حیات بخش اور حیات آخریں اصول اس کی میزان پر تلتے تھے۔ فرنگی آقاؤں کا طرزِ معاشرت اور مغربی تمدن کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔

یہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ ان حالات میں اقبال نے قرآن حکیم کو اپنے افکار کا سرچشمہ بناتے ہوئے بتکدۂ ہند میں جو اب فرنگی افکار کا صنم خانہ بن چکا تھا۔ ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ اس کی ایک للکار سے مغربی افکار کے تمام بت سربسجود ہو گئے۔ اقبال نے جہاں ایک طرف مغرب سے مرعوبیت کے بت توڑے وہاں انہوں نے برصغیر میں غلامی اور انحطاط کے دور کے دوسرے اثرات کا بھی ازالہ کیا۔ جن میں وہ خانقاہی تصوف بھی تھا۔ جس کی دستاویز خونِ دل شیراں سے نہیں بلکہ گوسفندانہ رویے سے عبارت تھی۔ یہ تصوف دنیا کی جنگ میں مردانہ وار لڑنے کا داعی نہ تھا۔ بلکہ صرف خانقاہ کے حصار میں بند ہونے پر اکتفا تھا۔ اس انداز فکر نے مسلمانوں کی اس جرأت کو سلب کر لیا تھا جس نے مسلمانوں کو ایشیا، افریقہ اور یورپ کا حکمران بنا دیا تھا۔

علامہ کہتے ہیں کہ وہی قرآن جس نے مسلمانوں کو یورپ سے لے کر تیمور کے جزائر تک کا مالک بنا دیا تھا۔ اب اس کے ذریعے ترکِ دنیا کی تعلیم دی جا رہی ہے

؎ اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

قرآن حکیم جس حیات آخریں پیغام کو سموئے ہوئے ہے اس سے تغافل برتنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ممالک ایک ایک کر کے مغربی استعمار کے شکنجہ میں آتے چلے گئے اور وہ ملت اسلامیہ جو تاریخ عالم کی سب سے درخشاں تہذیب کی مالک تھی اب مغربی تمدن کی چکاچوند سے مرعوب ہو کر غلامی پر رضامند ہو گئی تھی۔

قرآن حکیم ایک زندہ و پائندہ پیغام ہے یہ ان غلاموں کے لیے نہیں اترا جو ہوا کے ہر رخ پر اپنا رخ بدل لیتے ہوں بلکہ ان جرأت مند دلوں کے لیے نسخۂ شفا بن کر اترا ہے جو حالات کے دھارے پر بہنے کی بجائے انہیں بدل دینے کی ہمت رکھتے ہوں۔ یہ صرف ان لوگوں کے لیے وجہ ہدایت ہو سکتا ہے جو خدا کے سوا اور کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے آغاز ہی میں کہہ دیا کہ یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۔ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے وجہ ہدایت ہے۔

قرآن حکیم کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ انسان خود اس راستے پر گامزن نہ ہو جو اس کتاب نے بتایا ہے یہ ان کتابوں میں سے نہیں جنہیں کسی کتب خانے کے خاموش اور پرسکون ماحول میں بیٹھ کر پڑھا جائے اور لطف اندوز ہوا جائے۔ یہ تو عملی زندگی کے لیے رہنمائی کا ایک دستور العمل ..... Practical manual ہے اس کے نکات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتے جب تک کہ اس پر عمل نہ کیا جائے۔ اقبال ایک جگہ کہتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار نے انہیں ایک روز یہ نصیحت کی کہ بیٹا جب تم یہ کتاب پڑھو تو اس طرح جیسے کہ یہ خود تم پر اتری ہے یعنی اس کا مخاطب اپنی ذات کو قرار دو۔ قرآن حکیم انسانی زندگیوں میں وہ انقلاب پیدا کرتا ہے کہ پوری دنیا بدل جاتی ہے ظاہر ہے کہ یہ تب ہی ممکن ہے کہ انسان اسے سوچ سمجھ کر پڑھے اور اس کے نور سے اپنے دل و جگر کو منور کرے۔ علامہ کو بجا طور پر شکوہ تھا کہ قرآن پاک کی ان خصوصیات سے اس دور میں فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ جو جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی کی زبان سے یوں ادا ہوئی ہیں

؎ چیست قرآں ؛ خواجہ را پیغام مرگ

دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقشہائے کاہن و پایا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

ترجمہ : قرآن کیا ہے؟ یہ بے سروسامان شخص کا اُسرا اور ظالم کے لیے پیغامِ مرگ ہے قرآن حکیم کی وجہ سے پنڈتوں اور پجاریوں کا طلسم ٹوٹ گیا ہے۔ میں برملا کہتا ہوں کہ یہ قرآن عام کتاب نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے یہ جب جسم وجاں کا حصہ بن جائے تو انسان میں انقلاب آجاتا ہے اور جب انسانی ذہن میں انقلاب آجائے تو پوری دنیا بدل جاتی ہے

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ تکوینِ اسرارِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
مے برد پابند و آزاد آورد
صید بنداں را بہ فریاد آورد
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمیںؐ
ارج می گیرد از و ناارجمند
بندہ را از سجدہ سازد سربلند

ترجمہ: قرآن حکیم کی دانش امنٹ ہے زندگی کے اسرار کا انکشاف کرنے والی اس کتاب سے کمزور اور بے ثبات چیزوں کو بقائے دوام مل جاتا ہے۔ اس سے غلام آزاد ہو جاتے ہیں۔ انسانیت کے نام اس آخری پیغام کو رحمت دو عالمؐ لے کر آئے ہیں۔ یہ سجدہ کی وجہ سے انسان کو سربلند کر دیتا ہے اور بدقسمت لوگوں کی تقدیر کو بدل دیتا ہے

علامہؒ چاہتے تھے کہ برصغیر کے مسلمان جو حاکم کے منصب کی بجائے محکومیت کی ذلت میں گرفتار رہے تھے، قرآن حکیم کی تعلیمات پر عمل کر کے ایک بار پھر آزادی و خود مختاری کی نعمت سے بہرہ ور ہوں۔ وہ فرماتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

تاہم علامہ مسلمانوں سے مایوس نہ تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر قوم کے نوجوان اپنے آپ کو بدل لیں تو مستقبل ایک بار پھر ہمارا ہو سکتا ہے "جب ایک پروفیسر صاحب نے جو علامہؒ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ڈاکٹر صاحب آج تک کوئی قوم یا کسی قوم کی تہذیب مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوئی" تو علامہ نے کہا "یہ خیال صحیح نہیں۔ مختار قومیں عام طور پر اپنی محکوم قوموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اس لیے مسلط کر دیتی ہیں۔ کہ ان میں پھر سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو سکے۔ اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ہے آپ محض ایک قوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مر کر زندہ نہیں ہو سکتی۔ مگر خیال فرمایئے کہ قرآن تو قیامت کا قائل ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ ایک قوم کیا ساری دنیا مر کر ایک بار پھر زندہ ہو گی"[1]

---

[1] ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی لاہور ص ۱۷۰، ۱۷۱

مسلمانوں کی بدبختی کہیے یا کچھ اور کہ وہ نسخۂ ہدایت جو مسلمانوں کو قیامت خیز بنانا چاہتا ہے ان کی غفلت کی نذر ہو کر رہ گیا۔ اسے طاق میں بت کی طرح رکھا ہوا ہے وہ کہتے ہیں۔

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست

تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

ترجمہ: برہمن نے بتوں سے طاق سجایا ہوا ہے اور تم نے قرآن پاک کو سرِطاق رکھ دیا ہے۔ علامہ قرآن پاک کو غلاف میں سجا کر رکھنے کی نہیں بلکہ ہمہ وقت مطالعہ کی کتاب سمجھتے تھے۔ انہیں حوالے کے لیے اکثر اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مطالعے کی میز پر دوسری کتب کے ساتھ رکھا ہوتا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے ذوق کے مطابق یہ اس کی بے ادبی کے مترادف تھا۔

ایم اسلم لکھتے ہیں "میں نے متعدد بار قرآن مجید کو ان کے مطالعے کے میز پر دیگر کتابوں کے ساتھ پڑا دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے ادب کے ساتھ انہیں اس طرف متوجہ کیا تو فرمانے لگے۔ یہ کسی قیمتی اور خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر اور عطر میں بسا کر اونچی جگہ پر رکھنے والی کتاب نہیں بلکہ یہ تو انسان کے ہر وقت کام آنے والی کتاب ہے چونکہ مجھے اکثر اس کے حوالے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے یہاں رکھی ہے۔"[1]

علامہ کے قرآنِ پاک کے ہمہ وقت مطالعہ ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے کلام پر قرآن حکیم کے انتہائی گہرے اثرات ہیں۔ آپ نے اپنے اردو کلام میں بالعموم اور فارسی کلام میں بالخصوص جس طرح قرآن حکیم کے مطالب کو بیان کیا ہے۔ یہ انہیں کا حصہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کے وسیع و عریض پس منظر میں ہمیں کوئی ایسا کلام نظر نہیں آتا۔ جو اقبال کی طرح قرآن حکیم کی اس قدر گہری چھاپ لیے ہوئے ہو۔ اقبال سے پہلے ہماری غزل ایرانی سانچے میں یوں ڈھلی ہوئی تھی۔ کہ اس کے مطالب اور ایرانی شعراء کے افکار میں بہت کم فرق تھا۔ حافظ کے اثرات سے بچ کر بلکہ اس کے خلاف ایک بالکل نئی طرح نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ علامہ نے تصوف اور گنہگاری، خدا پرستی اور آوارہ مزاجی رندی

---

[1] (اوراقِ گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین، اسلامی پبلی کیشنز لاہور ص ۱۳۶)

وہوسنا کی کے تذکروں اور علم و عرفاں کی باتوں کے عجیب و غریب معجونِ مرکّب سے اردو شعر کو نجات دلائی۔ ان کا یہ احسان اردو شعر کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ علامہ کے یہاں قرآن حکیم کے مطالب، اسلوب و غنائیت کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں آپ کی طویل نظمیں اپنے اندر جو نیا آہنگ رکھتی ہیں۔ اس کا سراغ عالمی ادب میں نہیں بلکہ قرآن حکیم کے صفحات میں ملے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ کے تنقید نگار اس طرف توجہ کریں۔ اور علامہ کے فکر و فن کو دوسری کسوٹیوں پر پرکھنے کی بجائے قرآن حکیم کے الہامی فکر و فن کے حوالے سے جانچیں۔ اس طرح اقبال کو سمجھنے کے سلسلے میں پیش آنے والی تمام تر دشواریوں کا حل مل جائے گا۔ اور تنقید نگاروں کو ایک صحیح سمت کا سراغ میسر آجائے گا۔

قرآن حکیم سے اقبال کا عشق جس حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اس کا سراغ ان کے کلام سے جا بجا ملتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شعر میں قرآن حکیم کی آیات ڈھلتی چلی گئی ہیں، علامہ نے قرآن حکیم پر غور و خوض کرنے کے عمل کو زندگی کے کسی حصے میں ترک نہیں کیا اکبر الٰہ آبادی کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

قرآن کے متعلق عربی میں بعض نہایت عمدہ کتابیں ہیں مگر افسوس ہے کہ لاہور میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ جرمنی کے علماء نے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر جنگ کی وجہ سے وہاں سے نہیں آسکتیں۔ انشاء اللہ بعد از جنگ بہت سی کتابیں علومِ قرآنی کے متعلق وہاں سے منگواؤں گا۔[1] علامہ جہاں کہیں سے ممکن ہوتا تھا۔ قرآن حکیم کی تفاسیر اور دیگر علمی کتب منگواتے رہتے تھے محمد اکبر منیر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "ملا صدر الدین شیرازی کی تفسیر قرآن کے لیے ممنون ہوں۔ یہ چیز عجیب و غریب ہوگی۔ امید ہے کہ چند روز تک یہاں پہنچ جائے گی"[2]

علامہ کے اشعار کی اساس قرآن حکیم کے لازوال پیغام پر ہے ان کے اشعار میں جا بجا قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ علامہ اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

---

[1] بنام محمد اکبر منیر ۳۰ جنوری ۱۹۲۲ء، اقبال نامہ دوئم، ص ۱۶۰

[2] بنام اکبر الٰہ آبادی ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء، اقبال نامہ دوئم مرتبہ عطاء اللہ شیخ محمد اشرف اینڈ سنز لاہور، ص ۱۶۰

"آیاتِ قرآنی جو آپ نے لکھی ہیں زیرِ نظر ہیں۔ میں ان کے وہی معانی سمجھتا ہوں۔ جو آپ کے ذہن میں ہیں حیاتِ دنیا بے شک لہو لعب ہے۔ میں نے بھی پہلے حصّے میں (اسرارِ خودی) یہی لکھا ہے۔

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی

(شاہانہ پوشاک کے باوجود درویشانہ زندگی بسر کر۔ شب بیداری اور خدا کے وجود کے احساس کے ساتھ زندگی گذار۔

پھر دوسرے حصے میں ہے جس میں حضرت عمرؓ کا ایک قول منظوم کیا ہے۔

راہ دشوار است ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی، آزاد میر
سیخِ اَقَلُّ مِنَ الدُّنیا شمار
از نقشِ حُرُّ شوی سرمایہ دار

(راستہ دشوار ہے اپنے آپ کو دنیا کے ساز و سامان سے آزاد رکھ۔ دنیا میں آزاد حی اور آزاد مر، اَقَلُّ من الدنیا کی تسبیح پڑھ تاکہ نقشِ حُرًّا سے سرمایہ دار ہو سکے)

غرض یہ ہے کہ سلطنت ہو۔ امارت ہو، کچھ ہو، بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذرائع ہیں۔ اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے۔ جو شخص ان کو بجائے خود مقصد جانتا ہے۔ وہ (رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا یعنی حیاتِ دنیا سے راضی ہو گئے قرآن پاک کی اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ اس دنیا کو ہی اپنا مال و متاع اور سب کچھ سمجھ بیٹھے) میں داخل ہے کوئی فعل مسلمان کا ایسا نہ ہونا چاہیے۔ جس کا مقصد اعلائے کلمتہ اللہ کے سوا کچھ اور ہو۔ (اسرارِ خودی)

ط

قلب را از صبغتہ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ
طبعِ مسلم از محبّت قاہر است

مسلم از عاشقی نباشد کافر است

تابعِ حق دیدنش نادیدنش

خوردنش، نوشیدنش، پوشیدنش، خوابیدنش

در خیالش مرضیٔ حق گم شود

ایں سخن کے باورِ مردم شود

(۱) صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً پ ۱ - ۱۶

(۲) اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ پ ۸ - ۷

دل کو اللہ کے رنگ میں رنگ لو عشق کے ناموس و ننگ کا فکر کرو۔ مسلمان کا مزاج محبت کی وجہ سے قاہر ہو جاتا ہے مسلمان اگر عاشق نہ ہو تو وہ کافر ہے اس کا کھانا، پینا، پہننا، سونا، دیکھنا، نہ دیکھنا سب کچھ اللہ کے احکامات کے تحت ہوتا ہے اس کی مرضی اور اللہ کی رضا میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ لوگ شائد اس بات پر یقین نہ کریں۔

آخری شعر کے متعلق ایک حکایت یاد آ گئی جس کا تعلق حضرت رابعہ بصریؒ سے ہے کہتے ہیں کہ ایک روز حضرت رابعہ بصریؒ دجلہ میں کشتی پر سوار ہوئیں جب کشتی دریا کے بیچ میں پہنچی تو ایک سخت طوفان نے گھیر لیا۔ مسافروں کی چیخ و پکار آہ و بکا بلند ہوئی۔ حضرت رابعہؒ بھی دعاؤں میں مشغول ہوئیں اتنے میں دیکھا کہ ایک بوڑھا نہایت اطمینان سے کشتی کے ایک کنارے یوں لیٹا ہے کہ جیسے اسے اس طوفان کی خبر ہی نہ ہو۔ وہ اس کے اس اطمینان پر سخت متعجب ہوئیں اور قریب جا کر کہا کہ آپ یہاں لیٹے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سخت طوفان آیا ہوا ہے اور قریب ہے کہ کشتی غرق ہو جائے انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ میرا اللہ ہم سب کو دیکھ رہا ہے اگر اس کی مرضی کشتی کو ڈبونے کی ہے تو میں کون ہوں جو اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتا ہوں۔ حضرت رابعہؒ کو اس کے اطمینانِ قلب پر حیرت ہوئی۔ اور اس بات نے ان کے دل میں ایمان کی شمع روشن کر دی۔ انہوں نے اس شخص سے درخواست کی۔ کہ وہ اللہ کے حضور دعا کریں انہوں نے اپنی چادر اٹھائی اور جس سمت سے طوفان آیا تھا۔ اسی سمت اپنی چادر کر دی۔

چادر کا کرنا تھا کہ ہوا تھم گئی۔ اور کشتی پھر اطمینان سے چلنے لگی۔ مسافر دوبارہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ حضرت رابعہؒ کو تجسس ہوا کہ یہ شخص یقیناً اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ ہے اور اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ یہ تو کوئی ایسی انہونی بات نہیں یہ تو تم بھی کر سکتی ہو جب حضرت رابعہؒ نے پوچھا تو اس نے جو جواب دیا وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اس نے کہا۔

ترکنا ما نرید لما یرید فترک ما یرید لما نرید

(ہم نے اپنے ارادے اور مرضی کو اللہ کی مرضی کے لیے چھوڑ دیا۔ پس اس نے اپنی مرضی کو ہماری مرضی کے لیے ترک کر دیا)

؎ درخیالش مرضیٔ حق گم شود
این سخن کے باورِ مردم شود

یہ لطیف نکات کتابوں سے نہیں ملتے بلکہ بزرگوں کی نگاہ سے میسر ہوتے ہیں اقبال اپنے والد گرامی کے بارے میں جن کے فیضانِ نظر نے انہیں اقبال بنایا، لکھتے ہیں "واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے ان کی گرمیٔ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔

پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے۔ جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ دوران گفتگو کہنے لگے "معلوم نہیں، بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے" اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قریباً بیہوش ہو گئے۔ اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی۔ یہ خاموش لیکچر جو پیران مشرقی سے ہی مل سکتے تھے۔ یورپ کی درسگاہوں میں ان کا نشان نہیں"[1]

اقبال ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے بے حد مشتاق رہتے تھے۔ جو قرآن حکیم اور دیگر علوم اسلامی پر عبور رکھتے ہوں۔ جب لاہور میں ایک ایرانی عالم علامہ شیخ عبدالعلی طہرانی

---

[1] بنام اکبر الٰہ آبادی ۱۳ اگست ۱۸ء، اقبال نامہ دوئم ص ۶۶ - ۶۷

آئے تو علامہ ان کی خدمت میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ یہی نہیں علامہ اپنے کرم فرما اور عزیز دوست سرکشن پرشاد کے نام خط میں بھی ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

ہاں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ لاہور میں کچھ عرصہ سے ایک بہت بڑے ایرانی عالم مقیم ہیں۔ یعنی سرکار علامہ شیخ عبدالعلی طہرانی۔ معلوم نہیں کبھی حیدر آباد میں بھی ان کا گزر ہوا یا نہیں۔ عالم متبحر ہیں مذہباً شیعہ ہیں مگر مطالب قرآن بیان فرماتے ہیں تو سمجھنے سوچنے والے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ علم جفر میں کمال رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا ہوں۔ اگر اس موسم میں سرکار لاہور کا سفر کریں تو خوب ہو کہ یہ آدمی دیکھنے کے قابل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سرکشن پرشاد مذہب کے اعتبار سے ہندو تھے۔ لیکن ان کا عربی اور فارسی ادب کا بہت گہرا مطالعہ تھا۔ اور علامہ سے ان کے مراسم کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے علامہ سے اپنی بیٹیوں کی شادی کے بارے میں مشورہ کیا کہ مناسب بر نگاہ میں ہو تو لکھیں۔ علامہ کا بھی سرکشن پرشاد کے ساتھ انتہائی خلوص کا تعلق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی ان کا بے حد خیال رکھتے تھے اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ قرآن حکیم کے مطالب سننے میں علامہ انہیں اپنا شریک بنانا چاہتے ہیں۔ قرآن حکیم سے علامہ کی شیفتگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علی بخش کے بقول علامہ کے مطالعہ میں آنے والا قرآن ان کے آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔ صبح ہونے پر علی بخش اسے دھوپ میں رکھ دیا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند علامہ نے روایاتی انداز سے قرآن حکیم کی تفسیر نہیں لکھی لیکن ان کے اشعار میں جا بجا قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف بکھرے پڑے ہیں ان کے کئی اشعار تو ہو بہو قرآن پاک کی آیات کا منظوم ترجمہ معلوم ہوتے ہیں

علامہ چاہتے تھے کہ انہوں نے قرآن حکیم کے مطالعے سے جو گہرہائے معانی اخذ کئے ہیں اس سے لوگ بھی مستفید ہوں۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کو بالخصوص اور عوام کو بالعموم اس کے مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ اور اس کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے

۱۹۳۱ء کا دور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے سیاسی بے اطمینانی کا دور تھا۔ عوام علامہ سے رہنمائی کے طالب تھے۔ ایک ہی سال پہلے آپ نے الہ آباد کا خطبہ دیا تھا جس میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ سیاسی حالات کے اس پس منظر میں علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے جب لندن روانہ ہوئے تو راستے میں دہلی کے سٹیشن پر بہت بڑی تعداد میں لوگ ان سے ملنے کے لیے آئے۔ حضرت علامہ کی خدمت میں کئی سپاس نامے پیش کیے جانے تھے۔ تاہم انہوں نے ان سب کو وقت کی کمی کے باعث سننے سے معذوری ظاہر کی ان میں صوبائی مسلم کانفرنس دہلی، سنٹرل مسلم یوتھ لیگ، دہلی انجمن رفیق المسلمین، انجمن اتحاد و ترقی، انجمن تیموریہ وغیرہ کی طرف سے یہ سپاس نامے پیش کیے جانے تھے۔ علامہ نے ان سب کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ البتہ جامع مسجد کے امام کے سپاسنامے کو سنا جو صوبائی مسلم کانفرنس دہلی کی طرف سے پیش کیا گیا۔ جامع مسجد کے امام مولانا سید احمد کا احترام علامہ کو جس حد تک تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ نے ان تمام تنظیموں کے سپاسناموں سے صرف امام صاحب کے سپاسنامے کو سننے کا شرف بخشا۔ علامہ نے ان کے جواب میں یہ تقریر کی۔

حضرت امام صاحب جنہوں نے یہ سپاسنامہ پڑھ کر سنایا۔ ان کی نسبت سب سے پہلے میں آپ حضرات کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کی ذات ایک مقدس ذات ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ حضرت شاہجہاں نے ان کے آباؤ اجداد کو بخارا سے شاہی مسجد کی امامت کیلئے بلایا تھا۔ جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپکو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے۔ جو میرے لیے ضروری مواد فراہم کرے۔ نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں بلکہ میرے پاس حق و صداقت کی جامع کتاب (قرآن پاک) ہے جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ گذشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگرس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لہٰذا اب اگر لنڈن میں بھی فرقہ وارانہ اتحاد کی کوئی قابل اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل پراونشل اٹانمی (صوبائی خود مختاری) نہ دی گئی۔ اور مرکزی حکومت میں اس کا کافی خیال

نہ کیا گیا۔ تو مسلمانان ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی کو قربان کرنا پڑے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستور اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا۔ مسلمانان ہند اس کے پرخچے اڑا دیں گے۔

سن رسیدہ نسل نے نوجوانوں کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کرنے کا کام جیسا چاہیے تھا ہرگز نہیں کیا۔ لہٰذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں۔ اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ ان قربانیوں کے لیے تیار رہیں۔ جو ہمیشہ سے زیادہ ان کو آئندہ دینی ہو گی۔[1]

اس تقریر میں دیکھیے کہ علامہ نے لوگوں کو کس خوبصورت انداز میں قرآن پاک کی طرف متوجہ کیا۔ عام سیاسی لیڈر اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر شائد سیاسی چٹخارے کی بات کرتا یا خبریت Newsability پیدا کرنے کی کوشش کرتا لیکن علامہ نے جہاں امام صاحب کے صحیح مقام سے لوگوں کو آشنا کرایا وہاں معاصر دور کی روائت کا تذکرہ کرتے ہوئے تاریخ کے اوراق کا بھی تذکرہ کیا۔ جب مسلمان اپنے مطالبات گدایانہ پیش نہیں کرتے تھے بلکہ بنوک شمشیر ان کا تصفیہ کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ پھر قرآن حکیم کی جانب توجہ دلائی جو درحقیقت قوت اور شوکت کا ازلی اور ابدی پیغام ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں قوت کے عنصر کی طرف بلاواسطہ توجہ دلائی کہ اگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو مسلمان ایسے دستور کے پرخچے اڑا دیں گے۔ آخر میں مسلمانوں کو بالخصوص نوجوانوں کو قرآن پاک اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی طرف توجہ دلائی۔ کہ ان کی اجتماعی زندگی کا انحصار ان کے اتباع اور ان بیش بہا قربانیوں پر ہے جن کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

علامہ نے قرآن حکیم کے مطالب نثر کی زبان میں بیان کرنے کے علاوہ نثر میں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے عنوان سے مدارس کے لیکچر کی صورت میں دیئے۔ یہ لیکچر اپنے اندر اسلام کی حقیقی روح سموئے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے قوم کے علمی ذوق کی کم مائیگی نے ان گراں مایہ لیکچروں کی طرف توجہ نہ ہونے دی۔ ایک ملاقات کے دوران محمد حسین عرشی نے علامہ سے پوچھا۔ کہ

---

[1] (گفتارِ اقبال ص ۱۲۵)

آپ کے مدارس والے لیکچر بے حد مشکل ہیں۔ اگر اسلام یا قرآن کا منشا وہی ہے جو آپ نے ان لیکچروں میں بیان فرمایا ہے۔ اور جس کو اس ترقی یافتہ زمانے کے بڑے بڑے اہل علم سمجھنے سے قاصر ہیں تو قرنِ اوّل کے عرب صحرانشینوں نے اسے کیا سمجھا ہوگا۔[1]

علامہ نے اس اعتراض کا بڑا خوبصورت جواب دیا۔ انہوں نے اسلام کے بنیادی پانچ اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ کسی قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے یہی بہت کافی ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

"بنی الاسلام علی الخمس، کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لیے اسلام کے پانچ ارکان مشہورہ کا اجراء و انضباط کافی ہے۔ چنانچہ اس کی محسوس اور عملی صورت عہد سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آسکتی۔ اور تاریخ کا حافظہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتا"

جب محمد حسین عرشی صاحب نے علامہ کی توجہ ایک اور طرف دلائی اور کہا "ایک طرف تو یسونا القرآن للذکر" فرمایا اور دوسرے ارشادات فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ اور فَصَّلْنٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وغیرہ بھی موجود ہیں۔ دوسری طرف بہت سی آیات کو متشابہات کہہ کر ان کے فہم پر وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی مہر لگادی ظاہری نگاہ اس میں تضاد دیکھتی ہے"

تو علامہ نے اس تمام مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعے واضح کیا۔ آپ نے فرمایا "اس کو یوں سمجھو۔ ایک دفعہ لنڈن میں ایک صاحب نے کسی مہمان کے اعزاز میں چند دوستوں کو مدعو کیا۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ فراغت طعام کے بعد مہمان عزیز سے تفصیلی تعارف کرایا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ ماہر حجریات ہیں۔ میں نے آپ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ فیصلہ ہوا کہ سیر کو اکٹھے چلیں گے۔ چنانچہ سیر کرتے ہوئے ہم سمندر کے ساحل پر پہنچ گئے میں نے ان سے کہا کہ اپنے مضمون (حجریات) کے متعلق کچھ فرمائیں۔ انہوں نے ساحل سے ایک چھوٹا سا سنگ پارہ اٹھالیا اور اس کی سوانح عمری بیان کرنا شروع کر دی۔ مختصر یہ کہ ہم ۱۵ دن روزانہ سیر کو جاتے رہے اور وہ اس پارہ حجر کے رموز و اسرار بیان کرتے رہے

---

[1] ملفوظات ۔ ۳۹ [2] ایضاً [3] ایضاً

اس کے مدارج نشو ونما پر درجے کے زمانے کے تعین، اس کے اجزائے اولیہ، رنگ وصلابت و صورت نوعیہ وغیرہ کے تفصیلی اسباب، تاثیرات وخواص وغیرہ اتنی باتیں بیان کر دیں. جو میرے لیے اور اس علم سے بہرنا واقف شخص کے لیے پردہ اخفاء میں تھیں. یہ متشابہہ تھیں اور اس شخص کے لیے کہ راسخ فی العلم تھا. مفصل ومیسر تھیں. اسی طرح قرآن مجید سارے کا سارا مفصل بھی ہے اور متشابہہ بھی. جس قدر انسان کا ذوق ووجدان اور اخلاق وروحانیت ترقی کرتے جائیں گے. اس پر قرآن کے مطالب آشکار ہوتے جائیں گے."

اس طرح کا دوسرا واقعہ آپ نے ارشاد فرمایا. " ایک دعوت میں ہمیں ایک صاحب سے تعارف کا اتفاق ہوا. جو صرف سطح بحر کی مخلوقات کے پروفیسر تھے. انہوں نے اپنے فن سے متعلق عجیب وغریب انکشافات فرمائے. ان کی زبانی معلوم ہوا کہ سمندر کی سطح پر رہنے والے جانداروں کی ازواج واقسام اور ان کے احوال وکوائف بے حد دلچسپ اور اہم ہیں. مجھ پر ان کی تقریر سے سحر ہو رہا تھا. اس طرح ہر شخص اپنے فن کا راسخ ہوتا ہے. اور وہ فن اس کے لیے یَسَّرْنَا اور فُصِّلَتْ کے مترادف ہو جاتا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ علامہ مختلف علوم وفنون کے بارے میں اپنی معلومات اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے قرآن حکیم کے مشکل مقامات کی ایسی عمدہ تشریح فرماتے تھے. کہ مخاطب کے تمام شکوک رفع ہو جاتے تھے. اور ایسا کیوں نہ ہوتا. اس لیے کہ علامہ کی عمر کا بہت بڑا حصہ قرآن حکیم کے بارے میں سوچ بچار میں بسر ہوا تھا.

محمد حسین عرشی صاحب نے علامہ سے قرآن حکیم کے بارے میں مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے عقدہ کشائی کے لیے لکھا تھا. ان کے خط کا جواب دیتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں. آپ اسلام اور اس کے حقائق کے آشنا ہیں. مثنوی رومیؒ کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے شوق خود مرشد ہے. میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں. اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی. افسوس ہے کہ ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے.

ے کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

بہر حال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیے۔ مجھ سے بھی کبھی کبھی ملتے رہیے۔ اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں۔ بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوتے۔ یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے جس کو جاننے والے مسلمانان ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے۔[1] اس کے بعد محمد حسین عرشی صاحب علامہ سے ملتے رہے۔ انہوں نے ایک بار سوال کیا آیہ مبارکہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا پ۲۱ ع۱۲ جو لوگ ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنی راہیں دکھلائیں گے) سے کیا مراد ہے۔ علامہ نے فرمایا "تمام علوم وکمالات اور مقاصدِ عالیہ جو نوع انسان کے لیے کسی نہ کسی جہت سے مفید ہوں۔ ان کے حصول کی سعی، جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ اور اس مشق ومزاولت کے ارتقائی نتائج لَنَهْدِیَنَّهُمْ کا ظہور ہیں" میں نے عرض کیا مولانا روم نے فرمایا ہے۔

ے نطق آب ونطق با دو نطق گل
ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

اس سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا قرآن مجید میں ہے، زمین وآسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ اور کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَوٰتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ پ۱۸ ع۱۲ ہر مخلوق کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم حاصل ہے ان آیتوں سے ثابت ہے کہ ہر شے کو اس کے حال کے مطابق نطق عطا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے نطق اشیا وعناصر سے انکار نہیں میرا سوال "محسوس حواس اہل دل" پر ہے آپ کی پیش کردہ دوسری آیت کے ساتھ ہی یہ لفظ پڑھے ہوئے ہیں وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ پ۱۵ (یعنی ہر شے نمازی اور تسبیح خواں تو ضرور ہے۔ لیکن اے انسانو! تم اس کی سمجھ نہیں رکھتے) پھر اہل دل اس نطق کو کس طرح محسوس کرتے ہیں؟ آپ نے یہ شعر پڑھا۔

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۷-۲۸

ص ہر کہ عاشق گشت حسنِ ذات را
گشت سیّد جملہ موجودات را

(جو حسن ذات یعنی جمال حق کا عاشق ہو گیا وہ تمام عالم کی اشیاء کا سردار بن گیا)

آپ کی حالت متغیر ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا: معرفت الٰہی سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: "سید الطائفہ جنید بغدادی کے نزدیک معرفت یا عرفان کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب یا مضاف نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ قرآن عزیز میں اس کا استعمال نہیں کیا گیا۔ البتہ علم و ایمان کا ذکر بار بار آتا ہے اللہ تعالیٰ نہ تو عارف ہے نہ معروف۔ ہاں عالم و علیم ہے اور معلوم ہے۔ جس پر بہت سی آیتیں شاہد ہیں۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو اس کے بندوں میں علم سے ممتاز ہیں) یہاں علماء کہا ہے عرفاء نہیں..... علم کی دو قسمیں ہیں، ایک ہمارے اکتسابی معلومات کا ذخیرہ، ہم خود مخلوق الٰہی ہیں اور ہمارے اکتسابی آلات علمیہ ہماری مخلوق یعنی ہمارا علم مخلوق کا مخلوق ہے۔ پس ایسے علم کو علم الٰہی سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا، دوسرا وہ علم ہے جو خواص کو عطا ہوتا ہے، وہ بے منّت کسب قلب و روح کے اعماق سے اُبلتا ہے۔" میں نے عرض کیا اس علم کی کلید کیا ہے؟ فرمایا: ارشاد خداوندی ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (۹۱/۹) جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، اس پر علم کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں میں نے کہا تزکیۂ نفس کا طریق کیا ہے؟ اس پر آپ نے صوفیہ کے بعض مشاغل کی طرف اشارہ کیا۔

اسلام میں علم کا تصور اس تصور سے قطعی مختلف ہے جسے مغرب نے اپنایا ہے۔ ہمارے یہاں علم کی حیثیت نورِ الٰہی کی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے اس سے طلب کرنے اور عصیاں سے کنارہ کشی کرنے پر عطا ہوتا ہے۔ علم کے سوتے کتابوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے نورِ ہدایت سے پھوٹتے ہیں۔ امام شافعی کا مشہور شعر بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے

شکوت الیوم عن سوء حفظی
فاوصانی الی ترک المعاصی

لان العلم من نور الالٰہی

ونور اللہ لا یعطی لعاصی

ترجمہ : میں نے اپنے استاد سے اپنے حافظے کے کمزور ہونے کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہوں سے کنارہ کشی کرنے کے لیے کہا انہوں نے فرمایا کہ علم نور الٰہی کا حصہ ہے اور اللہ کا نور گنہگاروں کو نہیں دیا جاتا) اس شعر کا مفہوم اقبال کے اس ارشاد کی ترجمانی کرتا ہے کہ علم الٰہی بے منت کسب قلب و روح کے اعماق سے ابلتا ہے علامہ نے ایک اور ملاقات میں علم کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن مجید نے ان چاروں کی طرف واضح رہنمائی کی ہے مسلمانوں نے ان ذرائع کی اور دنیا جدید اس باب میں ہمیشہ مسلمانوں کی منت کش رہے گی۔ پہلا ذریعہ "وحی" ہے اور وہ ختم ہو چکا۔ دوسرا ذریعہ آثار قدما و تاریخ ہے جس پر آیاتِ قرآن متوجہ کر رہی ہیں "سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ" اس آیت نے علم آثار کی بنیاد رکھ دی۔ جس پر مسلم مصنفین نے عالیشان قصر تعمیر کیے۔ ذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ یہ آیت مجید تاریخ کا ابتدائی نقطہ ہے جس نے ابن خلدون جیسے باکمال محقق پیدا کیے۔ علم کا تیسرا ذریعہ "علم النفس" ہے جس کا آغاز وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ پ ۲۶ ع ۱۸ سے ہوتا ہے۔ اس کو حضرت جنید اور ان کے رفقاء و اتباع نے کمال تک پہنچا دیا۔ آخری ذریعہ صحیفہ فطرت ہے جس پر قرآن مجید کی بیشمار آیات دلالت کر رہی ہیں۔ مثلاً وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ پ ۳۰ ع ۱۳ اس علم پر علمائے اندلس نے بہت توجہ مبذول کی

اس تمام تشریح علوم، تفصیل آیات اور سا عی علمائے اسلام کا ذکر کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ موجودہ دنیا اپنے تمام علم و تہذیب اور صنائع و بدائع سمیت مسلمانوں کی "مخلوق" ہے میں نے اس لفظ پر ذرا اظہار تعجب کیا آپ نے فرمایا حقیقی خالق بے شک اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی خالق ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ آیۂ احسن الخالقین (فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ) سے ظاہر ہے خدائے پاک تمام دوسرے خالقوں سے احسن ہے۔"[1]

---

[1] ملفوظات ۵۰

اس کے بعد فرمایا " قرآن سے پہلے کسی ارضی یا سمادی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا۔ جس کی قرآن نے اطلاع دی۔ یہ لفظ تم قرآن کے سوا کہیں نہ دیکھو گے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ آج تک تم جن ارضی وسمادی، مہیب یا مفید ہستیوں کو اپنا معبود سمجھتے رہے ہو۔ وہ سب اور تمام دیگر کائنات تمہاری خدمت کے لیے خلق کی گئی ہے توحید کا یہ مرتبہ اعلیٰ ماسوا سے بے پردہ کر دینے والا۔ یہ انسانی خودی کا حقیقی عرفان قرآن سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔ [1]

توحید کا یہ اعلیٰ وارفع تصور جو قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ دیگر اقوام کا تو کیا ذکر خود مسلمانوں سے اوجھل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف قسم کے توہمات، قبور پرستی، اور پیر پرستی کا مسلم معاشرے میں رواج عام ہو گیا۔ علامہ نے اسی لیے کہا تھا۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلمان ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

توحید اس کے اسرار سے نامحرم ہونے کی وجہ سے نہ وحدت افکار قائم رہی اور نہ وحدت کردار، علامہ نے ایک اور مقام پر اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھا۔

---

[1] ملفوظات ۱۵۱

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
سینہ روشن ہے تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی [1]

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صاحبانِ علم وفضیلت اور اہل دانش وبصیرت محض کسی خاص علم یا فن میں مہارت رکھنے کی وجہ سے دینی معاملات میں بھی سمجھداری کا ثبوت دیں گے۔ یا یہ کہ ان کا کسی خاص طرف رجحان عام لوگوں کے لیے باعث تقلید ہونا چاہیے اس مسئلہ کے بارے میں سوال پوچھتے ہوئے ایک بار محمد حسین عرشی صاحب نے علامہ سے کہا "فلاں جدید فرقہ صراحتاً متضاد عادی اور لغو عقائد کا مجموعہ ہے لیکن بہت سے اہل علم وثروت اور اصحاب دانش وتجربہ اس میں شامل ہیں۔ جس سے سطحی عقل کے لوگ بانی فرقہ کی صداقت تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے عقل کی متعدد قسمیں بیان کیں۔ جن کے لیے انگریزی الفاظ استعمال کیے جو مجھے یاد نہیں رہ سکے مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔ بعض لوگ مخصوص فنون واعمال میں کافی بصیرت کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے دوسرے امور میں قطعاً سادہ اور صریح الاعتماد ثابت ہوتے ہیں" اس پر ایک مثال بیان فرمائی کہ "مجھے ایک مصنف نے اپنی ایک کتاب جو انگریزی زبان میں معدنیات پر لکھی گئی تھی۔ تبصرے کے لیے بھیجی۔ میں نے اسے پڑھا تو مجھے اس فن سے ذوق پیدا ہو گیا۔ تھوڑے عرصے میں میں نے جواہر کے پرکھنے کی مہارت حاصل کر لی۔ ۱۹۳۱ء میں جب ولایت گیا تو ایک لارڈ صاحب کی لیڈی کو میرے اس ذوق کا علم ہو گیا۔ وہ بھی اس کی بہت شوقین تھیں۔ اپنے جواہرات کا ڈبہ اٹھا کر میرے پاس لے آئیں۔ میں ان کے گراں قدر منتخبات کو دیکھا اور ان کی مناسب تعریف کرتا رہا۔

[1] (بال جبریل ۱۷ - ۱۸)

اخیر میں انہوں نے کہا کہ میرے پاس ایک نہایت اعلیٰ ہیرا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اسے جدا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے کہا، آپ مجبور کیوں ہو گئیں؟ انہوں نے کہا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میری قسمت کے موافق نہیں۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ وہ عورت بڑی اہل علم و تجربہ ہونے کے باوجود کتنے پس و پیش میں گرفتار تھی۔ اس طرح بعض آدمی قانون میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی مذہبی مدعی کی بزرگی تسلیم کر لیتے ہیں۔ تو عوام کو دھوکا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے قانون دان نے اس بزرگ کو مانا ہے ضرور اس میں کوئی بزرگی ہو گی۔ حالانکہ وہ قانون دان مذہب کی حقیقت سے اتنا ہی کورا ہوتا ہے جتنا ایک عام انسان۔ اسی طرح اکثر لوگ مذہبی کتب پر عبور رکھتے ہوئے بھی صحیح مذہبی حس نہ رکھنے کے باعث فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

علامہ نے مسجد قرطبہ پر کہی ہوئی عظیم نظم میں ایک جگہ مومن کی صفات کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اسے نقطۂ پرکارِ حق قرار دیا ہے۔ علامہ کہتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ[1]

---

[1] ملفوظات ۵۴-۵۵

علامہ نے ایک بار مسلمان کی تعریف میں ایک بلیغ وعمیق تقریر فرمائی جس کا.... مفہوم تھا۔ کہ انسان صحیح معنوں میں مسلم اس وقت ہوتا ہے جب قرآن کے فرمائے ہوئے اوامر و نواہی۔ اس کی اپنی خواہش بن جائیں۔ یعنی وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے حکم و تسلط کے ماتحت فضائل اخلاق و عبادات پر کاربند اور ذمائم و قبائح نفس سے مجتنب ہوں، بلکہ یہ چیزیں اس کی اپنی تمنا بن کر اس کے عمق روح سے اچھلیں۔ قرآن اس کے حق میں ایک تلخ اور شافی دوا نہ رہے بلکہ ایک لذیذ اور زندگی بخش غذا بن جائے۔ منشائے الٰہی اور فطرت انسانی میں مغائرت نہ رہے۔ یہی مطلب ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا[1] کا۔"[2]

جبر و اختیار کا مسئلہ ابتدائے آفرینش سے ہی انسانی ذہن کو مضطرب رکھتا رہا ہے۔ قرآن حکیم نے زندگی کے ان دونوں پہلوؤں جبر اور اختیار کی طرف اشارات کیے ہیں بعید الطاف حسین صاحب جو اقبال کے ملنے والوں میں سے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے کہا: "ایک پریشانی ہے جسے رفع کرنا چاہتا ہوں" یعنی "میں نے عرض کیا نکلسن نے عربوں کی ادبی تاریخ میں قرآن شریف کی دو آیتوں کا انگریزی ترجمہ کرکے ثابت کیا ہے کہ ان کے معانی میں کامل تضاد ہے۔ ایک آیت کا مطلب ہے کہ انسان جو چاہے کرے اور دوسری کا یہ کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے آیات مجھے یاد نہیں مگر ان کے معانی قریب قریب یہی ہیں۔ فرمانے لگے "جب نکلسن نے کتاب شائع کی تھی۔ تو میں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے لکھا تھا کہ یہ تضاد کی بکواس کیسی۔ جسے تم تضاد کہہ رہے ہو۔ وہ حقائق زندگی کے عین مطابق ہے" میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں نہیں سمجھا کہ حقائق زندگی کے مطابق ہونے سے آپ کی کیا مراد ہے۔" کہنے لگے "کیا ہر انسان خود کو بعض لمحات میں مختار کامل اور بعض میں بالکل مجبور محسوس نہیں کرتا؟

میں نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے تو بس میرا یہی مطلب ہے حقیقت کوئی یک رنگ

---

[1] (بائبل جبریں ۱۳۲ [2] ملفوظات ص ۵۵

چیز نہیں بلکہ ایک مختلف الالوان مرکب ہے" میں نے پوچھا "قبلہ اس میں کیا مصلحت ہے کہ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی، کیوں نہ ہمیں بالکل مجبور یا مختار بنایا گیا؟ مسکرا کر فرمانے لگے اس کی مصلحت سے تو وہی واقف ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ البتہ انسانی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی تقدیر تک پہنچ رہا ہے"

اس موضوع پر اقبال نے شعر کی زبان میں کہا

ح عبث ہے شکوہ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

ح تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی [1]

ح تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر [2]

علامہ مسلم قوم کے احیاء کے بارے میں اس قدر پُر یقین تھے کہ جیسے وہ اس کا مشاہدہ کر رہے ہوں وہ کہتے ہیں

ح انقلابے کہ نہ گنجد بضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چسپاں می بینم

(وہ انقلاب جسے آسمانوں کے ضمیر میں بھی سما نہیں سکتا میں فاش دیکھ رہا ہوں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کیسے نظر آ رہا ہے۔)

'مسجد قرطبہ' میں علامہ روح مسلماں میں اضطراب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ح روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں [3]

---

[1] ضرب کلیم ۸ [2] ملفوظات ۱۷۰ [3] بال جبریل ۱۳۵

دریائے کبیر کے کنارے جہاں کہیں عربوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دی تھیں۔ وہ عالم اسلام کے نشاۃ ثانیہ کا تصور ذہن میں لاتے ہوئے کہتے ہیں

ے آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

انہیں یقین تھا کہ فرنگی تہذیب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور عالم اسلام ایک بار پھر اسی شان و شکوہ سے جلوہ گر ہو گا۔ جسے تاریخ صدیوں تک دیکھ چکی ہے وہ اس بارے میں اس قدر پُر امید تھے کہ کہتے ہیں۔

ے جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

علامہ کا یہ یقین و اعتماد قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے ان کے ذہن میں قرآن حکیم کے مطالعہ سے جو نادر اور اچھوتی باتیں پیدا ہوتیں وہ انہیں اپنی گفتگوؤں، خطوط، اشعار غرض ہر جگہ موتیوں کی طرح بکھیرتے چلے جاتے۔ ان کا مسلک یہ تھا۔

ے برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے نالۂ آہے فغانے

وہ مسلمانوں کو بھی قرآن حکیم کے بحر ذخار میں غوطہ زن ہو کر اس کی فکر کے گہرِ آبدار چننے کی تلقین کرتے تھے ان کا کہنا تھا۔

ے قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ افکار

اسے کیا کہا جائے کہ مسلمانوں نے قرآن میں غوطہ زن ہونے کی بجائے اسے طاق کی زینت بنا کر رکھ دیا۔ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں۔

ص درِ صد فتنہ را خود کشودی
دو گامے رفتی واز پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآں را سرِ طاقے نہادی [1]

(تو نے صدہا فتنوں کے دروازے اپنے لیے کھول رکھے ہیں دو قدم چل کر تھک گیا ہے۔ برہمن نے بتوں سے اپنا طاق سجا رکھا ہے اور تو نے قرآن کو سرِ طاق اٹھا کر رکھا ہوا ہے۔)

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ اب مسلمانوں کو قرآن سے اسی قدر تعلق رہ گیا ہے کہ وہ سورۃ یٰسین کی مدد سے دمِ نزع آسانی سے مر سکیں۔ لکھتے ہیں۔

ص بہ بندِ صوفی و ملّا اسیری
حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین، او آساں بمیری [2]

(تو صوفی و ملّا کے چکر میں گرفتار ہے حکمت قرآن سے زندگی کیوں حاصل نہیں کرتا۔ اس کی آیات سے اب تیرا تعلق صرف اتنا رہ گیا ہے کہ سورۃ یٰسین پڑھنے سے آسانی سے مر سکے۔

وہ مسلمانوں کو قرآن حکیم کی تعلیمات کے آئینے میں اپنے کردار کو پرکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنے کردار کو تولنے کے لیے ترازو آویزاں کر اور اس طرح قیامت کو بپا کر دے۔

ص ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز
دگر گوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را
قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

---

[1] کلیات ۹۷۸ [2] کلیات ۹۵۵

(قرآن کے آئینے میں اپنے کردار کو جانچ۔ اپنے کردار کو اس کے ترازو میں تول اور قیامت سے پہلے قیامت برپا کر دے۔)

پھر وہ شعرائے عرب سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں لب و رخسار کی گفتگو نہیں کرتا بلکہ قرآن حکیم کے نور سے غلامی کی ایک سو تیس سالہ رات کو سحر کر رہا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

ع بگواز من نواخوانِ عرب را

بہائے کم نہادم لعلِ لب را

ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم

سحر کردم صد و سی سالہ شب را

قرآن حکیم کی تلاوت علامہ کا ہمیشہ کا معمول تھا۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی اس معمول کو چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ پھر قرآن پاک کی حکمتوں اور مختلف آیات پر غور و تفکر کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا۔ یورپ کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا وہاں سے آتے ہوئے ایک صبح جہاز میں میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ میرے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا آ گئی۔

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا (خدایا حرم کعبہ کے اہالی کو پھلوں سے رزق عنایت فرما) اس سے میری طبیعت بے حد متاثر ہوئی۔ اس دعا کو زبان سے نکلے ہوئے چار ہزار سال گزر گئے۔ اس کی قبولیت ایک بدیہی حقیقت بن گئی ہے تمام اسلامی ممالک ایران، عراق شام، افغانستان، بیروت، ٹرکی وغیرہ جو حرم کعبہ سے روحانی تعلق رکھتے ہیں۔ پھلوں کے رزق سے معمور ہیں۔ اور غیر اسلامی دنیا یورپ، امریکہ وغیرہ اس نعمت خداوندی سے محروم سبحان اللہ[1]

علامہ کے اشعار کے علاوہ ان کے خطبات، خطوط، تقاریر اور ملفوظات ہیں۔ ہر جگہ قرآن حکیم کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ علامہ کا ذہن ہر وقت قرآن حکیم کے مطالب پر ہی غور و تفکر میں غرق رہتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھنے والوں کا بھی یہی کہنا ہے۔ کہ علامہ قرآن حکیم سے اکثر حوالے دیا کرتے تھے۔

ان کا زیادہ تر زور قرآن حکیم کے مضامین پر ہوتا اگر آپ حوالہ نہ بھی دیتے تو اسی بات

---

[1] ملفوظات ۲ ؟ ۴

کو عام فہم انداز میں لوگوں کے ذہن نشین کروا دیتے۔ مثنوی اسرار خودی اور رموز بے خودی تحریر کرنے کے زمانے میں ہی علامہ کے ذہن پر یہ بات چھائی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے قرآن حکیم کی اہمیت واضح کی جائے اور مختلف مسائل کے حل کے لیے قرآن پاک کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچایا جائے۔ مولانا گرامی کے نام ایک خط میں علامہ لکھتے ہیں۔

"مثنوی کا دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آرہا ہے اور مضامین دریا کی طرح امڈے آرہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں اس حصے کا مضمون ہوگا حیات مستقبلۂ اسلامیہ، یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے، اور جماعت اسلامیہ جس کی تاسیس دعوت ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات وحوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے۔ اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غائت کیا ہے میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں۔ اور استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا اور بعض آیات وسورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں۔"[1]

قرآن حکیم میں شہدا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

(ترجمہ: اور ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں یہ نہ کہو کہ وہ مر گئے۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے) علامہ نے اس کی بہت خوبصورت تفسیر کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: حیات اخروی انسان کے ذوقِ حیات کی شدت پر منحصر ہے۔ جس قدر کسی شخص میں ذوق زندگی زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی اس کا زمانہ برزخ کم ہوگا۔ شہداء کا ذوقِ زندگی بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے اس لیے ان کے لیے کوئی برزخ نہیں اس زندگی سے آنکھ بند کرتے ہی ان کے لیے

---

[1] مکتوب اقبال بنام گرامی یکم جولائی ۱۹۱۷ء، مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ عبداللہ قریشی بزم اقبال لاہور ص ۸۴)

دوسری زندگی کا دروازہ کھل جاتا ہے عام مومنین کے لیے بھی برزخ[1] کا کہیں ذکر نہیں اس کا سبب بھی ذوق حیات ہے علامہ نے اسی خیال کو ایک شعر میں بھی ظاہر کیا ہے۔

ح جانے کہ بخشند دیگر نگیرند

انساں نمیرد از بے یقینی

اسی طرح ایک اور جگہ لطیف پیرایہ میں اسی خیال کو بیان کرتے ہیں کہ یوں زندگی بسر کرو کہ اگر تمہاری مرگ، مرگ دوام ہو تو خدا اپنے کیے پر شرمسار ہو جائے

ح چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام

خدا بہ کردۂ خود شرمسار تر گردد

علامہ کا مطالعہ قرآن حکیم کے رموز پر بے حد گہرا تھا اور اگر دیکھا جائے تو قرآن حکیم ہی کے مطالب کو انہوں نے اشعار کے پردے میں یوں بیان کیا ہے کہ روح وجد میں آجاتی ہے مرزا جلال الدین بار ایٹ لاء جو علامہ کے چند بے تکلف اور عزیز احباب میں سے تھے۔ علامہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اکثر مجالس میں ڈاکٹر صاحب سے قرآن حکیم کے رموز سننے کا بھی ہمیں موقع تھا۔ اقبال مذہبی لٹریچر کا بہت وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ جب وہ کسی مذہبی مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے تو معلوم ہوتا کہ موضوع زیر بحث پر کوئی کتاب یا رسالہ ان کی نظر سے نہیں بچا۔ وہ اپنے خیالات کو اس خوبی سے پیش کرتے کہ سننے والا ان کے تبحر علمی سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتا ان کا استدلال ایسا جامع ہوتا کہ مخالف پر ہر طرح کی حجت پوری ہو جاتی اور اس کے لیے انحراف کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ ان کے انداز بیان میں ایک ایسی قدرت تھی کہ وہ فرسودہ سے فرسودہ مسائل میں بھی کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر کے دکھا دیتے۔ اور باخبر سے باخبر سننے والے کو بھی یوں معلوم ہوتا گویا یہ بات پہلے اس کے مطالعہ میں کبھی آئی نہ تھی۔ مگر اس عالمانہ شان کے باوجود اقبال کبھی تعلی کی نہ لیتے۔ میں نے انہیں کبھی اپنی وسیع معلومات سے اپنے پاس بیٹھنے والوں پر رعب ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مجھے ابتدا سے مذہبی باتوں میں بہت تو غل تھا۔ سرسید کی تعلیم نے تو اس تشنگی کو

---

[1] برزخ کے بارے میں تفصیلات کے لئے دیکھئے حیات برزخیہ از علامہ اللہ یار خاں صاحب۔
دار العرفان منارہ ضلع جہلم

جنون میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ میرے اور اقبال کے درمیان فراغت کے ایام میں اکثر مذہبی بحث چھڑ جاتی۔ بلکہ میں ان کے تبحرِ علمی سے مستفید ہونے کی خاطر ان سے بحث چھیڑ لیتا۔ جس کے دوران میں انکے ساتھ آیات محکمات و متشابہات اور ولادتِ مسیح، ظہورِ مہدی جبر و اختیار جزا و سزا وغیرہ جیسے متنازعہ مسائل پر میرا ان کے ساتھ تبادلہ خیال ہوتا اور وہ ان مسائل کی اس شرح و بسط کے ساتھ وضاحت فرماتے کہ اگر میں ان کے آراء و افکار کو ساتھ ساتھ قلمبند کرتا رہتا تو آج مذہبی مسائل پر ایک ضخیم و جامع دفتر تیار ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کی وسعت معلومات کو دیکھ کر مجھے کئی مرتبہ خیال گزرتا کہ اگر وہ شعر و سخن اور فلسفیانہ غور و فکر کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے مذہبی مسائل کی تشریح کی طرف توجہ دیتے تو وہ اپنے وقت کے بہت بڑے مذہبی پیشوا ہوتے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے استدعا کی کہ قرآن حکیم کی تفسیر لکھیں اور اس میں کلام نہیں کہ اگر وہ تفسیر لکھتے تو وہ یقیناً بہترین ہوتی۔[1]

علامہ کا عمر کے آخری حصے میں یہ خیال تھا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھیں گے۔ جس کا منشا یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعہ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔ اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی کے متعلق قائم کر رکھے ہیں۔ وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی Aids to the study of Quran. بتایا کرتے تھے (ذکر اقبال ۲۱۱ - ۲۱۲) ان کے ایک ملنے والے عبدالرشید طارق لکھتے ہیں پھر میں نے Introduction to the study of Quran. وہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے کے متعلق تذکرہ چھیڑا تو فرمانے لگے۔ ہاں ذرا صحت اچھی ہو تو لکھنا شروع کروں گا۔ چاہتا ہوں کہ کوئی پڑھا لکھا وسیع النظر اور صحیح المشرب فاضل دیوبند میسر آ جائے۔ مجھے حوالجات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھتا رہے انگریزی سے واقف ہو تو نہایت ہی اچھی بات ہے میں تنخواہ بھی دینے کو تیار ہوں ایک بار کتاب شروع کی اور انشاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کی تمام Theories نظریات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ ارادہ ہے کہ قانون کی تمام کتب بیچ کر فقہ، حدیث اور تفسیر خرید کروں یہ اب میرے کس کام

---

[1] ملفوظات ۴۷)

کی ہیں۔اس کے بعد میں جب کبھی جاتا تو اس کتاب کی بابت ضرور استفسار کرتا اور وہ ہمیشہ خدا سے صحت کی دعا کرتے۔ (ملفوظات (۲۲۶ - ۲۲۷) افسوس کی بات یہ ہے کہ علامہ کو اس طرح کا فاضل دیوبند باوجود کوشش کے میسر نہ آسکا۔ پھر ان کی صحت بھی اتنی خراب ہوگئی تھی کہ وہ اس محنت کے قابل نہ رہے تھے۔ جو انہیں اس کتاب کے لکھنے میں اٹھانی پڑتی علامہ کے بارے میں یہ سب تفاصیل بہت کم منظر عام پر آئی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علامہ کی تحریروں کے ایک غالب حصے یعنی ان کی تقریروں، خطوط اور دیگر نثری تحریروں کو عام طور پر برسرِ طاق رکھ دیا گیا ہے۔ علامہ کے بیشتر نقادوں نے اس بات کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ علامہ کے خطبات، خطوط کے مجموعوں اور تقاریر سے استفادہ کیا جائے علامہ کی شاعری میں بھی صرف اردو حصے کے ان اشعار کو جو آسانی سے تاویل کا نشانہ بن سکتے تھے۔ استعمال کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ کی فکر کے سرچشموں کو یورپ کے ازکار رفتہ فلسفوں میں تو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن قرآن حکیم کے سرچشمۂ ہدایت کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ جو علامہ کے افکار کا اصل منبع ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ کے تمام تر تحریری سرمائے کو اس روشنی میں دیکھا جائے۔ اور ان کے افکار کی صحیح تعبیر لوگوں کے سامنے پیش کی جائے۔ علامہ نے اس سلسلے میں کوئی ابہام نہیں چھوڑا۔ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور، عرض حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین کے عنوان سے یہ لکھتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اے کہ ازاحسان تو ناکس کس است
یک دعایت مزد گفتارم بس است
عرض کن پیش خدائے عز و جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشندہ
بہرۂ از علمِ دیں بخشندہ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم گہر گرداں مرا [1]

(اگر میرا دل بے جوہر آئینہ ہے اور اگر میری تحریروں میں قرآن پاک کے علاوہ کچھ اور پوشیدہ ہے تو میرے افکار کی آبرو کا پردہ چاک کر دے۔ اور مجھ سے کانٹے کو اس گلستان سے نکال دے۔ قیامت کے روز مجھے خوار و رسوا کر دے اور اپنے پاؤں کا بوسہ دینے سے محروم کر دے۔ لیکن اگر میں نے قرآن حکیم کے اسرار کو موتیوں کی طرح پرو دیا ہے اگر میں نے مسلمانوں تک حق کو پہنچایا ہے تو اے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ جن کے احسان سے بے کس کو ہمت و جرأت ملتی ہے آپ کی ایک دعا میرے گفتار کا معاوضہ ہو گی۔ خدائے عز و جل کے سامنے میری یہ عرض گذار دیجیے کہ میرا عشق عمل کے ساتھ وابستہ ہو۔ آپ نے مجھے جانِ حزیں کی دولت عطا کی ہے علم دیں کا حصہ عطا کیا ہے مجھے عمل میں بھی پختہ تر بنا دیجیے۔ میں ایک قطرۂ ناچیز ہوں مجھے قیمتی گوہر بنا دیجیے)

---

[1] کلیاتِ اقبال فارسی۔ ص ۱۶۸

اقبال کا نظریۂ فن

اقبال کے نظریۂ فن کو سمجھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کے نظریۂ شعر کو سمجھا جائے خوش قسمتی سے انہوں نے اس مسئلہ پر خود اپنے اشعار میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس شاعری کو جو روشِ عام کی پابند ہے اپنے لیے باعثِ صد عار سمجھتے ہیں اور اس شعر و سخن کو۔ جو افسانہ گوئی یا افسانہ طرازی کا دوسرا نام ہے، اپنے لیے تہمت سے کم نہیں جانتے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ میری شاعری کوچہ دلبراں میں آوارہ گردی کا نام نہیں نہ ہی یہ دلِ زار کی حکایات سنانے کا بہانہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
بکوئے دلبراں کارے ندارم
دلِ زارے غمِ یارے ندارم
نہ خاکِ من غبارِ رہگذارے
نہ در خاکم دلِ بے اختیارے
بجبریلِ امین ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم
مرا با فقر سامانِ کلیم است
فرِ شاہنشہی زیرِ گلیم است

دمے در خویشتن خلوت گزیدم
جہانے لازوالے آفریدم
مرا زیں شاعری خود عار ناید
"کہ در صد قرن یک عطار ناید"[1]

یہ نہ سمجھو کہ میں شاعروں کی طرح فسانہ گو ہوں اور حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔ وہ کم مایہ شخص جو مجھ پر شعر و سخن کی تہمت باندھتا ہے خیر نہ دیکھے گا۔ میرا موضوعِ سخن کوچۂ محبوب نہیں اور نہ ہی میں آہ و زاری کرنے والوں میں سے ہوں۔ میں غبارِ راہ ہونے اور دلِ بے اختیار رکھنے میں سے نہیں ہوں۔ میں تو جبریل امیں کی ہم نوائی کرتا ہوں۔ میرے یہاں رقیب قاصد اور دربان کا ذکر نہیں۔ میرے فقر کے ساتھ ساتھ سامانِ کلیم ہے۔ میرے بوریا کے نیچے فرشِ شاہی موجود ہے میرے شیشے سے پتھر کا دل لرزتا ہے میرے افکار کے سمندر کا ساحل نہیں۔ میرے پردہ افکار میں اقوام کی تقدیریں ہیں۔ کئی قیامتیں میرے پہلو میں پل رہی ہیں۔ میں نے تنہائی میں غور و فکر کے ذریعے ایک جہانِ لازوال کو جنم دیا ہے۔ مجھے اس شاعری سے عار نہیں کیونکہ صدیوں میں عطار پیدا نہیں ہوتا۔)

وہ شعر کو پیغامِ حیاتِ ابدی سمجھتے تھے۔ اس بارے میں کہتے ہیں۔

ص میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے[2]
ہمہ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

صورِ سرافیل کی کئی لے انسان سے پہلے اردو شاعری کے ایوان میں موجود نہیں تھی اردو شعر و ادب کی لے عجمی تھی۔ علامہ نے بزمِ عجم کی بجائے دشتِ عرب میں خیمہ زنی کی آواز بلند کی اور کہا

دگر بدشتِ عرب خیمہ زن کہ بزمِ عجم
مئے گذشتہ و جامِ شکستنی دارد[1]

---

[1] کلیات ۱۵۳۸

[2] ضربِ کلیم ۱۳۳

انہیں شکوہ تھا کہ

؎ دل و دیں در گرو زہرہ و شانِ عجمی
آتشِ شوقِ سلیمی نہ تو داری و نہ من [۲]

وہ کہتے ہیں

؎ ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلاویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز
اقبال یہ ہے خارا تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ نمایند بپرہیز [۳]

علامہ قوم میں ایک ولولۂ تازہ اور قوت کا احساس پیدا کرنا چاہتے تھے ایک سو تیس سالہ غلامی کی سیاہ رات کو خندۂ سحری میں بدل دینے کے لیے وہ شعر ہرگز سودمند نہ ہو سکتا تھا۔ جو رخسار و کاکل کی حکایات یا بادہ و ساغر کے تذکروں سے بڑھ کر کوئی پیغام نہیں دے سکتا تھا۔ اقبال نے شعر کو ایک نیا مفہوم عطا کیا اور اس کے اسلوب کو یوں بدلا کہ ہلکے سروں کی خواب آور راگنیاں صورِ سرافیل بن کر مردہ قوم کو خوابِ گراں سے اٹھانے کے کام آئیں۔

اقبال کا نظریہ شعر کے بارے میں کیا تھا۔ اس کے بارے میں علامہ کی ایک تحریر

---

[۱] (کلیات اقبال فارسی ص ۳۳۳) [۲] (ضرب کلیم ۱۲۷) [۳] (کلیاتِ اقبالی ص ۳۳۸)

سے بھی رہنمائی ملتی ہے علامہ کے ایک نیازمند مولوی صالح محمد صاحب علامہ کے اشعار کی تشریح کرنا چاہتے تھے علامہ انہیں لکھتے ہوئے کہتے ہیں

ان اشعار کی دقت زبان کی وجہ سے نہیں میں تو اتنی فارسی ہی جانتا کہ مشکل زبان سمجھ سکوں۔ دقت جو کچھ بھی ہے واردات، کیفیات کے فقدان کی وجہ سے ہے اگر کیفیات کا احساس ہو تو مشکل زبان بھی سہل ہو جاتی ہے۔ بہرحال آپ کی کوشش ایک مبارک فال ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جذباتِ انسانی کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں، جن میں سے ایک شعر بھی ہے اور شعر کا تخلیقی یا ایقاظی اثر محض اس کے مطالب و معانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کی صوت اور طرزِ ادا کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اس واسطے ترجمے یا تشریح سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو مترجم کے زیر نظر ہوتا ہے بہرحال اس تشریح میں آپ کو ان لوگوں کی کیفیات و خیالات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے جن کے قلوب میں آپ قیام کے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ بات پیام کے مطالعہ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی گر کی بات ہے کہ مجھ سے مشورہ نہ کیجئے جس شعر کا جو اثر آپ کے دل پر ہوتا ہے اسی کو صاف و واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہیے مصنف کا مفہوم معلوم کرنا بالکل غیر ضروری بلکہ مضر ہے ہاں ایک ضروری شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ جو تشریح آپ کریں اس کی تائید شعر کی زبان سے ہونی چاہیے۔ ایک ہی شعر کا اثر مختلف قلوب پر مختلف ہوتا ہے۔ بلکہ مختلف اوقات میں بھی مختلف ہوتا ہے اس اختلاف کی وجہ قلوب انسانی کی اصلی فطرت اور انسانی تعلیم و تربیت اور تجربہ کا اختلاف ہے۔ اگر کسی شعر سے مختلف اثرات مختلف قلوب پر پیدا ہوں تو یہ بات اس شعر کی قوت اور زندگی کی دلیل ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت تنوع اور گوناگونی ہے [1]

علامہ کے تصور فن پر اس تقریر سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ جو انہوں نے انجمن ادبی کابل افغانستان میں کی تھی۔ اور جس میں انہوں نے انجمن کے ارکان کو فن کی حیثیت کی طرف توجہ

---

[1] (بنام مولوی صالح محمد ۳۰ مئی ۳۰ء اقبال نامہ حصہ ص ۳۷۰ - ۳۷۲)

دلائی تھی۔ علامہ نے فرمایا:

میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی یا معماری جو بھی ہو ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے اور اسی بنا پر آرٹ کو چاہیے کہ میں ایجاد کہوں نہ تفریح، شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کر سکتا ہے.... اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے لیے سچے رہنما بنیں زندگی کی عظمت و بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھ کر نہ دکھائیں کیونکہ "آرٹ" جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیغام موت ہے

ے دلبری بے قاہری جادوگری است

دلبری با قاہری پیغمبری است

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطہ کی طرف مبذول کراؤں۔ حیاتِ نبوی صلعم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کے حضور امراؤ القیس کے جو عرب شاعر ہے۔ کچھ اشعار پڑھے گئے۔ ارشاد ہوا۔

اشعر الشعراء وقائد ھم الی النار (تمام شاعروں میں بہتر شاعر اور ان کو دوزخ کی طرف لے جانے والا)

اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر بڑا اثر ڈالتا ہے ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں، بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ تخیل ہے۔ جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند جذبات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو میں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اہل سیاست کی پامردی سے نشو و نما نہ پاکر مر جاتی ہیں پس میری یہ خواہش ہے کہ نوجوان افغانستان کے شعراء و انشاء پرداز ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں۔ جس سے وہ رفتہ رفتہ آخر میں اپنے کو پہچان سکیں جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے اس کی "انانیت" خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے

ساتھ اٹھایا جائے۔ پس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوان نسلوں کی فکروں کو ادبیات کے ذریعے مشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی انانیت کو پاکر اور قابلیت بہم پہنچاکر پکار اٹھیں۔

ے دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا
فشاں کشید و بروئے زمانہ آخت مرا
من آں جہانِ خیالم کہ نظرتِ ازلی
جہانِ بلبل و گل را شکست وساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم
تواں ز گرمیٔ آوازِ من شناخت مرا

(سیر افغانستان ص ۸۱ - ۸۴)

میں فن کو زندگی اور شخصیت کے تابع سمجھتا ہوں۔ میں نے ۱۹۱۴ء ہی میں اسرارِ خودی میں اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بارہ سال بعد میں نے زبورِ عجم میں مثالی فنکار کی روح کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا فنکار جس کی روح میں محبت حسن اور قوت دونوں کے امتزاج کی صورت میں نمودار ہوں۔

ے دلبری بے قاہری جادوگری ست
دلبری باقاہری پیغمبری ست

(دلبری قاہری کے بغیر جادوگری کی سی حیثیت رکھتی ہے لیکن جب اس میں قوت شامل ہو جائے۔ تو یہ پیغمبری کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے)

اقوام کی زندگی میں ان کی روحانی صحت کا بیشتر انحصار اس تڑپ پر ہے جو شاعر اور فنکار ان کے دل میں پیدا کریں۔ تاہم اس کا آزادانہ انتخاب نہیں کیا جاسکتا۔ اس جذبے کی حیثیت جو شاعر یا فنکار پیدا کرتا ہے ایک تحفے کی سی ہوتی ہے اسے لینے والا قبول کرنے سے پہلے اسے جانچ پرکھ نہیں سکتا۔ یہ فرد کے پاس بن مانگے آجاتا ہے اور فرد کی زندگی میں گھل مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد کی شخصیت اور اس جذبے میں جو ایک

تحفے کی حیثیت رکھتا ہے انسانیت کے لیے جہاں گہرا ربط ہے۔ وہاں اس کی بے حد اہمیت ہے ایک زوال پذیر شاعر کا فن اگر اس میں جاذبیت اور اثر انگیزی بھی موجود ہے چنگیز اور اٹیلا کی فوجوں سے کہیں بڑھ کر ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر فنکار کو انسانی جذبات سے کھیلنے دیا جائے تو درحقیقت یہ انسانی روح پر فن کی برتری تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔ فن کے زوال پذیر محرکات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے ہی سے قوت حاصل ہو سکتی ہے فن کا دشوار مرحلہ یہ ہے کہ موجود کی بجائے جو کچھ موجود ہونا چاہیے۔ اسے زیادہ اہم قرار دیا جائے۔ اور درحقیقت یہی صحت اور زندگی ہے اس کے ماسوا صرف موت اور زوال ہے۔ خالق اور انسان دونوں مسلسل تخلیق کے عمل کی وجہ سے زندہ ہیں

وہ فن کار جو زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے پوری انسانیت کے لیے رحمت ہے وہ درحقیقت خالق کائنات کا دست و بازو ہے اور وقت اور ابدیت کو اپنی روح میں سمونے ہوتا ہے۔ فلسٹنے کے الفاظ میں یہ فنکار "فطرت کو مکمل بڑا اور بھرپور انداز سے دیکھتا ہے جبکہ اس کے علی الرغم دوسرے فنکار کو یہ کائنات ادھوری چھوٹی اور خالی خالی سی نظر آتی ہے" عصر حاضر فطرت سے سبق حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن فطرت محض "ہے" اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ "چاہیے" کی تلاش میں رکاوٹیں ڈالے۔ "چاہیے" کی تلاش فنکار کا مقصود ہونا چاہیے اور یہ اسے اپنی روح کی گہرائیوں میں تلاش کرنا ہوگا۔

جہاں تک اسلام کی تمدنی تاریخ کا تعلق ہے۔ میرا یقین ہے کہ فن تعمیر کے ماسوا اسلام کی روح کو ابھی جنم لینا ہے۔ (موسیقی مصوری اور حتیٰ کہ شاعری بھی اسی ذیل میں آتی ہے) وہ فن جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو انسانی زندگی میں سمونے کا عظیم مقصد لیے ہوتا ہے (تخلقو باخلاق اللہ۔ اپنے اخلاق کو اللہ کے اخلاق کے مطابق ڈھالو) انسان کو لامتناہی مسرتوں کے خزانوں سے معمور کر دیتا ہے۔ (اجر غیر ممنون) اور بالآخر اسے زمین پر خلافت الٰہی کا حقدار بنا دیتا ہے۔

ے مقامِ آدمِ خاکی نہاد دریا بند
مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق[1]

---

[1] دیباچہ مرقع چغتائی احسن برادرز لاہور تاریخ ندارد

آئیے آخر میں علامہ کی ایک اور تحریر کا مطالعہ کریں۔ علامہ کی یہ تحریر جو انگریزی زبان میں ہے اردو میں پیش کی جا رہی ہے اس میں علامہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تنقیدی معیارات پر جو روشنی ڈالی ہے وہ اپنے نوع کی واحد کوشش ہے۔ علامہ نے فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی پرانی بحث کو ایک بالکل نئے رنگ میں پیش کیا ہے اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ علامہ کے نظریات و تصورات جو کچھ بھی تھے۔ وہ سب قرآن پاک اور احادیث نبوی کی تعلیمات سے ماخوذ تھے۔ ان کی حیثیت اسوۂ رسول کی تشریح و توضیح کی تھی۔ اس دور میں جبکہ مغرب کے مخبوط الحواس اور ذہنی اعتبار سے ماؤف تنقید نگار اور فلاسفہ ہمارے مغرب زدوں کے لیے سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور انگلستان کے اداکاروں کے اقوال کو بھی انتہائی ادب و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اقبال نے فن کی پرکھ کے لیے کسی دیسی یا بدیسی کے قول کو اہمیت نہیں دی۔ اس نے فن اور ادب کے لیے جو اصول ڈھونڈے وہ اسی سرچشمہ ہدایت سے لیے تھے۔ جو عرب کے صحراؤں میں پھوٹا اور جس سے آج بھی تشنگانِ حقیقت کی پیاس بجھنے کا سامان ہو سکتا ہے

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

میرے خیال میں علامہ مرحوم کے علاوہ اردو ادب و تنقید میں ہمیں کم ہی ایسی تحریر ملے گی جس میں کسی شخص اسلام کا ادب کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی روشنی میں اس وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہو۔ یہ تحریر علامہ کی عبقریت کی دلیل بھی ہے اور ہمارے تنقید نگاروں کی تنقید نگاری کے لیے بالواسطہ آئینہ نما بھی۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اردو تنقید میں ابتدا سے لے کر اب تک مغرب کے ادبی تنقید کے اصولوں کی جگالی کے علاوہ ہمیں شاید ہی کچھ اور ملے مغرب کے خوانِ ادب کا وہ پس خوردہ جو کم و بیش چالیس پچاس برس پرانا ہوتا ہے ہمارے یہاں تنقید کے میدان میں حرفِ آخر گردانا جاتا ہے اور تازہ بتازہ نو بنو کے عنوان کے ذیل میں جگہ پاتا ہے۔ مغرب خود جن نظریات کو فرسودہ اور خارج از فیشن قرار دے دیتا ہے وہ ہمارے یہاں جدید ہونے کی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ علامہ کی تحریر کا ماخذ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ہیں اور ان کی بنیاد پر تنقید کے بنیادی اصولوں کو جس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے وہ اقبال ہی کا حصہ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تنقیدی معیارات

تاریخ نے ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عرب شاعری کے بارے میں ارشادات اور ان پر تنقید کو محفوظ رکھا ہے۔ یوں تو حضورؐ کی ہر بات فدا ہونے کے لائق ہے۔ تاہم ان میں سے دو تنقیدیں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے انتہائی سود مند ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کی پیداوار ہے اور اب جب کہ وہ ادبی معیارات کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ان کے لیے یہ تنقیدیں بہت عقدہ کشا ثابت ہوں گی۔ ان میں سے ایک کا تعلق اس بات سے ہے کہ شاعری کو کیا نہ ہونا چاہیے۔ اور دوسری کا تعلق اس بات سے ہے کہ شاعری کو کیا ہونا چاہیے۔

(۱) عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے بارے میں جو اسلام کے ظہور سے چالیس برس پہلے پھلا پھولا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع فقرہ ارشاد فرمایا۔

"الشعر الشعراء وقائدھم الی النار"

"وہ شعریت کے اعتبار سے تمام شعراء سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور جہنم کی طرف لیجانے میں ان کی رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔

آیئے اب ہم امراء القیس شاعری کا جائزہ لیں۔ ہمیں اس کی شاعری میں چھلکتی ہوئی شراب، ہیجان پیدا کرنے والے جذبات عشق کے تذکرے ان آبادیوں کے اجڑ جانے پر جنہیں طوفانوں نے برباد کر دیا ہے دل ہلا دینے والے مرثیے اور نوحے، خاموش صحراؤں کے دلفریب مناظر کی عکاسی، سبھی کچھ ملتا ہے۔ اور درحقیقت عربوں کی قدیم شاعری کا اتنا بھرپور اظہار کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔ امراء القیس انسانی جذبات سے کھیلتا ہے وہ ارادے یا انسانی شعور کی بات کم کرتا ہے اس کی شاعری کا نشہ رگ و پے میں اترتا چلا جاتا ہے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقید آرٹ کے اس بنیادی اصول کی نشاندہی کر دیتی ہے کہ "فن کی دنیا میں جو چیز انتہائی خوبصورت اور اچھی ہے ضروری نہیں کہ زندگی کے

نقطہ نظر سے بھی وہ اچھی ہو۔" یہ عین ممکن ہے کہ ایک شاعر انتہائی خوبصورت شاعری بھی کرے اور پھر بھی اپنے معاشرے کو دہکتے ہوئے جہنم میں لے جائے۔ ایک شاعر بنیادی طور پر ترغیب دلانے والا ہوتا ہے۔ اس کی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی المیہ نہیں ہو سکتا کہ وہ زندگی کی آزمائشوں اور کٹھن منزلوں کو خوبصورت اور دلفریب دکھانے کی بجائے زوال اور تنزل پذیری کو انتہائی دلکش رنگوں میں پیش کرے۔ وہ کھوکھلے ستونوں پر ایسے نقش و نگار بنائے جو دیکھنے میں مضبوط معلوم ہوں لیکن پورے معاشرے کی عمارت کو گرا ڈالیں یہ شاعر اپنی دلفریب آواز سے پوری قوم کو ہلاکت کی وادیوں کی طرف لے جا سکتا ہے کسی بھی تخلیقی فن کار کو چاہیے کہ وہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں سے زندگی اور قوت کی تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں پوری قوم میں حیات بخش کیفیات کا سحر پھونکنے کے لیے استعمال کرے۔ یہ نہ ہو کہ وہ چوروں کی طرح قوم کے حیات اور قوت کے اس سرمائے کو بھی جو پہلے سے ان کے پاس ہے لوٹ لے۔

(۱۲) قبیلہ عبس کے شاعر عنترہ کا یہ شعر حضور کی خدمت میں پڑھا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی واظله حتی انال به کریم المآکل

"مجھے قسم ہے کہ میں مشقتوں کی کتنی ہی طویل راتوں کے مسافت سے گذرا ہوں جب جا کر ایک باعزت شخص کی طرح روزی کمانے کی اہلیت حاصل کر سکا ہوں۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کا مقصد زندگی کو انتہائی اعلیٰ مقام پر فائز کرنا اور اس کی تمام تر مشقتوں اور کٹھن راہوں کو حسن و سلیقہ عطا کرنا تھا۔ اس شعر سے اس قدر خوش ہوئے کہ آپ نے اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا۔

"کسی عرب کی تعریف سننے کے بعد میرے دل میں اسے ملنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں اس شعر کہنے والے سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔"

تصور فرمائیے کہ وہ ذات اقدس جن کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے سے دلوں کی دنیا پر خوشی اور اطمینان کی بہار آجاتی تھی، ایک کافر عرب کو دیکھنے کی خواہش کرتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شاعر کو یہ غیر معمولی اعزاز و اکرام عطا کیا۔ اس کی کیا وجہ

ہے؟ یہ اس لیے کہ یہ شعر حد درجہ حیات بخش اور حیات آفریں ہے شاعر مشقت کی تکالیف میں پنہاں عزت کو ایک بلند و بالا درجے پر لے جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شعر کی تعریف کر کے ہمیں فنِ تنقید کے سلسلے میں ایک اور اہم اصول عطا فرمایا ہے اور وہ یہ کہ فن زندگی کے تابع ہے اس سے برتر نہیں۔ انسانی کوششوں کی تمام تر معراج خود زندگی ہے .... تمام تر حرارت لیے ہوئے پر شکوہ اور قوت سے بھرپور زندگی۔ انسانی فن کو اس اصل مقصد کے تابع ہونا چاہیے۔ اور ہر فن پارے کی پرکھ کا یہی معیار ہونا چاہیے کہ اس میں زندگی بخش قوت کس حد تک پائی جاتی ہے سب سے بلند و بالا فن وہی ہو گا۔ جو ہماری سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگائے اور ہمیں زندگی کی تمام تر مشکلات اور دشواریوں کو ہنستے کھیلتے برداشت کرنے اور زندگی کے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صلاحیت عطا کرے وہ فن جو ہمیں سلا دے اور ہمیں حقائق سے چشم پوشی کرنا سکھائے .... (جبکہ زندگی کا مقصد ہی ان کی تسخیر ہے) وہ درحقیقت زوال اور موت کا پیغام لیے ہوئے ہے فن میں افیون خوری کی قطعاً گنجائش نہیں۔ فن برائے فن کا تصور زوال کی پیداوار ہے۔ اور ہمیں زندگی اور قوت سے محروم کرنے کی چالاک سازش، اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عنترہ کے شعر کی جو تعریف کی ہے اس نے ہمیں ہر قسم کے فن کو پرکھنے کی اصل کسوٹی عطا کی ہے۔[1]

اقبال اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ جو فنکار انحطاط آمیز فن کو عوام تک پہنچاتا ہے۔ وہ ان کے حق میں چنگیز خان کی افواج سے زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے وہ ان فنکاروں کے خلاف تھے۔ جو بدن کو بیدار کرتے اور روح کو خوابیدہ بناتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ

ح موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں

زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

---

[1] نیو ایرا، لکھنو ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ہندوستان کی شاعری اور دیگر اصناف سخن، صورت گری اور فن کی دیگر اقسام سب کی سب ایک ہی محور کے گرد گھومتی تھیں۔ اور وہ تھی عورت یا دوسرے الفاظ میں جسم کی لذتوں کا تذکرہ اور بس۔ ہند ہی پر کیا منحصر ہے روم و یونان کی تہذیبوں پر نظر ڈالیے تو بھی یہی پتہ چلے گا کہ ان کے اعصاب پر بھی یہی کچھ سوار تھا۔ اقبال فن کے لیے کچھ اور مقاصد اور نصب العین تجویز کرتا ہے اور مقامات بلند سے آگاہ کرتا ہے۔ سنگ و خشت اور خطوط و رنگ یا الفاظ اظہار کا وسیلہ ہیں لیکن اس اظہار کا سرا یہ کیا ہو اور اس اظہار کے لیے کیا محرکات ہوں اس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتا ہے کہ ان سب کا اصل محرک دل ہے نہ کہ جسم

آیا کہاں سے نغمۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے؟
جس روز دل کی رمز مغنّی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

پھر فن محنت اور ریاضت کا طلبگار ہے اس میں شک نہیں کہ فن کار کا جذبہ اور اس کی خداداد صلاحیت اس کا بنیادی سرمایہ ہوتا ہے لیکن جب تک کوشش نہ کی جائے اس وقت تک ہنر کے بلند تر درجات تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ اسی موضوع کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اسی خیال کو ایک اور جگہ علامہ مسجد قرطبہ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود [1]

قطرہ خون جگر ہی موجود نہ ہو تو پھر صدا سوز و سرور سب بے معنی ہو جاتے ہیں اور حرف و صوت کی دنیا ہو یا خشت و سنگ ہوں وہ سب بے روح حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اقبال جہاں ایک طرف دل کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ وہاں خونِ جگر سے بھی غافل نہیں۔ پھر وہ چاہتے ہیں کہ یہ فن حیاتِ نو کا باعث بنے نہ کہ پیامِ مرگ بنے وہ لکھتے ہیں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا [2]

اقبال چاہتے تھے کہ نغمہ دل کی کشود کا باعث ہو نہ کہ دل کو افسردگی و یاسیت کی طرف لے جائے۔ ہندوستان کی موسیقی میں بنیادی طور پر افسردگی اور کم ہمتی کے اجزاء شامل ہیں۔ یہ موسیقی حیاتِ نو کا پیغام نہیں دیتی۔ اقبال اس موسیقی کے خلاف تھے۔ انہوں نے

---

[1] بال جبریل ۱۲۹
[2] (ضرب کلیم ۱۱۷)

ایک جگہ کہا تھا کہ ہندو تہذیب اور ہندوؤں کی غلامی میں ان کی موسیقی کا بہت بڑا ہاتھ ہے یہ موسیقی انفعالیت پرور ہے اس میں حیات تازہ کے آثار نہیں اور یہ ہمت اور جذبۂ عالی سے بالکل تہی دامن ہے۔ اقبال اس موسیقی کے قائل تھے۔ جو تلواروں کی جھنکار کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو اور جو زندگی کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرے نہ کہ انہیں سلا دے اس نوع کی موسیقی کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ

؎ ناتوان وزارمی سازو ترا
از جہاں بیزارمی سازو ترا
سوزِ دل از دل برد غم می دہد
زہر اندر ساغرِ جسم می دہد

(تجھے ناتواں وزار بنا دیتی ہے اور تجھے جہان سے بیزار کر دیتی ہے یہ دل کو سوز کی بجائے غم عطا کرتی ہے اور ساغر جم میں زہر بھر دیتی ہے۔)

اقبال جس موسیقی کے طلبگار تھے اس کے خدوخال کیا ہیں اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

نغمہ باید تند رو مانندِ نیل
تا برد از دل غماں را خیل خیل
نغمہ می باید جنون پرور دۂ
آتشِ دل خونِ دِل حل کردۂ
نغمہ گر معنی نہ دارد مردہ ایست
سوز او از آتشِ افسردہ ایست

(نغمہ دریائے نیل کی مانند تند رو ہونا چاہیے تاکہ وہ دل سے غموں کو ایک ایک کر کے نکال دے۔ نغمہ جنون پرور دہ ہونا چاہیے اور خون دل میں گرمیٔ دل کی آمیزش کرنے والا ہو۔ وہ نغمہ گر جس کی موسیقی بے معنی ہو۔ مردے کی حیثیت رکھتا ہے اس کا سوز بجھی ہوئی آگ سے ہے۔)

ایک اور جگہ مزید کہتے ہیں

کھل تو جاتا ہے مغنّی کے بم وزیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

یورپ میں رقص کو بھی فن کی حیثیت حاصل ہے اوپیرا Opera اور رقص کی دوسری بے شمار قسمیں یورپ کی تہذیب کے خمیر میں داخل ہے وہاں رقص سے نابلد ہونا تہذیب سے نابلد ہونے کے مترادف ہے اقبال کا نظریہ اس سے کس حد تک مختلف ہے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال بدن کے رقص کی بجائے روح اور جان کے رقص میں لانے کو اصل حقیقت شمار کرتے تھے وہ لکھتے ہیں

چھوڑ یورپ کے لیے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی
حلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن [1]
حلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

اس طرح انہیں تمثیل Drama کے بارے میں بھی اعتراض تھا اس لیے کہ اس میں انسان کی انا، جو زندگی کا اصل محور ہے مجروح ہو جاتی ہے کچھ افراد کی تفریح طبع کے لیے کسی فرد کی خودی کو ملیامیٹ کر دینا اپنی حقیقت کے اعتبار سے روم کے ان اکھاڑوں کے مناظر سے مختلف نہیں جنہیں روم کے 'مہذب' شہری اپنی تفریح اور لطف و سرور کے لیے زندہ

---

[1] (ضرب کلیم ۱۲۴)

انسانوں کو درندوں کے آگے ڈال کر ان کے چیخنے پکارنے کا منظر دیکھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ یا غلاموں کو آگ میں جلتا دیکھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ کچھ افراد کی تفریح کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو، اس درجہ عزیز نہ ہونی چاہیے کہ ان کے لیے کچھ افراد کی خودی، کو مجروح کر دیا جائے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

تمثیل کی ایک اور صورت سینما جو مغرب کے نقادوں کی نظر میں اب فن کا درجہ اختیار کر چکا ہے اقبال کی نظر میں صنعتِ آزری کی حیثیت رکھتا ہے آپ نے اسے تہذیب حاضر کی سوداگری قرار دیا اور کہا،

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
سینما ہے یا صنعتِ آزری ہے
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا
یہ صنعت نہیں شیوہ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی
وہ بتخانہ خاکی پر یہ خاکستری ہے[1]

سینما کا صنعت سے آرٹ کے درجے پر آجانا اور امریکہ میں اس کے ارتقاء کے بارے میں ہنری فورڈ نے اپنی کتاب International Jews میں تفصیل سے ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ صنعت تمام تر یہود کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کی مدد سے

---

[1] بالِ جبریل ص ۲۱۰

2. Henery Ford, International Jew, Ummah Publications, Bahadarabad, Karachi

امریکہ کے شہریوں کا اخلاق برباد کر رہے ہیں۔اس کی تفصیلات اس کتاب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ علامہ فن کو تعمیرِ خودی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ حفظِ خودی کے منافی ہو تو اس سے بڑھ کر مضر شے کوئی نہیں۔ کہتے ہیں۔

ے گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نے و سرود
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ [1]

فن کے بارے میں علامہ کا تصور "حرکی" تھا انہیں وہ Static (سکونی) تصور جو ہندوستان کے مزاج کا خاصہ ہے پسند نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو بیدل سے بہت دلچسپی تھی۔ علامہ نے پروفیسر حمید احمد خان سے ملاقات کے دوران یہ کہا "بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے یہاں تک کہ اس کا معشوق بھی صاحبِ خرام ہے

ہر گہ دو قدم خرامی کاشت
از انگشتم عصا بہ کف داشت

گویا سکون کو بھی بہ شکلِ حرکت دیکھا ہے مثالیں اس وقت یاد نہیں ہیں لیکن اگر آپ بیدل کا کلام پڑھیں تو بہت سے اشعار ہاتھ آجائیں گے۔ میں جن دنوں انارکلی میں رہتا تھا۔ میں نے بیدل کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اب میرے کاغذوں میں کہیں ادھر ادھر مل گیا ہے۔ نقشبندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی عقیدت کی بنیاد بھی یہی ہے۔ نقشبندی مسلک حرکت اور رجائیت پر مبنی ہے۔ Dynamic and Optimistic

——— مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے

Pessimistic and static ——— اسی وجہ سے چشتیہ سلسلے کا حلقہ ارادت زیادہ تر "ہندوستان" تک محدود ہے مگر ہندوستان سے باہر افغانستان، بخارا، ترکی وغیرہ میں نقشبندی مسلک کا زور ہے۔ دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے اس

---

[1] ضربِ کلیم ۹۸

میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے تصوف تقلید پر مبنی ہے سیاسیات، فلسفہ، شاعری، یہ بھی تقلید پر مبنی ہے لیکن نقشبندی سلسلے کے شعراء مثلاً ناصر علی سرہندی کو دیکھیے ناصر علی کی شاعری تقلیدی نہیں ہے اسی لیے حرکت والی قوموں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہے ہندوستان میں ناصر علی کی کچھ زیادہ قدر نہیں ہے۔ لیکن افغانستان اور بخارا کے اطراف میں لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں۔ بیدل کو بھی افغانستان کے لوگ بہت مانتے ہیں۔۔۔۔ اس کے بعد جب نیشنل اینتھم (قومی ترانے) کا ذکر آیا تو سعید اللہ صاحب نے کہا "بندے ماترم" پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی میں ہے دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے علامہ نے ذرا گرمی سے کہا آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں۔ ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالیے کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثناء ہے رامائن اور وہ بھی محض بعض حصوں میں۔

عبدالواحد: مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح منشیات سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کرے۔

عبدالواحد: کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے؟ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہیوں کا میلہ ہوتا ہے۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ یک دم حال میں آجاتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک دستور بنا لیا ہے یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے خوش جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا۔ اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ رکھتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات

ہیں۔ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے اور حال انہیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا فن موسیقی رائج ہے۔مسلمان جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فن تعمیر کے سوا فنون لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔[1]

اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا۔اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بت بھی تھے۔جن میں قوت اور ہیبت کی ایک ایسی شان تھی۔جس سے میں بہت متاثر ہوا۔قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلی کی مسجد قوت الاسلام بھی پیدا کرتی ہے بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہوا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔اور مغرب کا وقت قریب تھا میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں لیکن مسجد کی قوت وجلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا۔کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اس کے بعد پھر تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا یعنی تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آگیا ہے اور دراصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لیے توازن قائم کرتا ہے

سعید اللہ۔دلّی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ڈاکٹر صاحب:"وہ تو ایک بیگم ہے"

---

[1] (ملفوظات ۱۲۱ - ۱۲۵)

ہم اس فقرے پر ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پر اسلامی تعمیرات کے متعلق یہ دلکشا بحث ختم ہوئی۔"[1]

سیّد عابد علی عابد جنہوں نے اقبال اور فنون لطیفہ پر ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے علامہ کی زندگی میں ان کے پاس اس مقصد سے حاضر ہوئے کہ آپ سے آرٹ کے بارے میں پوچھیں وہ لکھتے ہیں۔

علامہ نے فرمایا۔ میرے کلام کو آرٹ (شائد اس کا مغربی تصور مراد تھا) سے کیا تعلق ہے؟ میری شاعری اسلامی تفکر اور ملّت کی تفسیر و تعبیر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس بات کو واضح کروں کہ آپ کے خیال میں فنون لطیفہ کا نصب العین کیا ہے فرمایا ہاں اس اعتبار سے مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ آرٹ کے زوال پذیر ہونے کے جو محرکات ہوتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ علامہ نے لیٹے لیٹے جواب دیا کہ آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے۔ جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے اور اسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے، اس وقت تک آرٹ زندہ اور جاندار رہتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پذیری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے.... اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم زوال پر آمادہ ہوتی ہے۔ تو ٹھوس چیزوں سے۔ مغز سے، معنی سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ چھلکے سے شکل سے وابستگی بڑھ جاتی ہے یہی آرٹ کی زوال پذیری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اردو شاعری میں شائد ناسخ اور اس کے سکول کا کلام آپ کے ارشاد کی بہترین تفسیر ہے۔ فرمایا۔ میں نے ناسخ اور اس کے سکول کا کلام بہت کم پڑھا ہے۔ میرا اردو ادبیات کا مطالعہ بہت محدود ہے البتہ یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اردو کی تاریخ میں دکنی ادبیات کا حصہ نسبتاً بہت جاندار نظر آتا ہے نیازی صاحب نے فرمایا کہ شائد اس کی وجہ یہ ہو گی کہ دکنی ادبیات کو مذہب سے نہایت گہرا تعلق ہے فرمایا، ہاں یا یوں کہو کہ زندگی سے دکنی ادبیات کا تعلق اصلی اور اساسی ہے۔" میں نے کہا" کچھ دن ہوئے ہیں رسالہ اردو

---

[1] ملفوظات ۱۲۵۔ ۱۲۶

میں ایک مقالہ نگار نے میر حسن اور پرانے دکنی ادیب کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ دکنی شاعر کا کلام زیادہ جاندار اور پُرجوش ہے۔ علامہ نے فرمایا، "مقالہ نگار کا خیال ٹھیک ہو گا۔ حسن کے وقت تک اردو شاعروں میں کافی ژولیدہ بیانی پیدا ہو چکی تھی یا تو کچھ کہنا ہی نہ چاہتے تھے یا کہنا چاہتے تھے تو کہہ نہیں سکتے تھے بلکہ جو بزرگوار کچھ کہنا چاہتے تھے ان کے کلام میں بھی ایک خاص قسم کی ژولیدہ گفتاری ہے جو ذہنی ژولیدگی اور پریشان فکری کی خبر دیتی ہے" میں نے عرض کیا کہ اس قسم کی ژولیدہ گفتاری کا معیاری نمونہ غالب کا ابتدائی کلام سمجھا جائے گا۔ علامہ کچھ عرصہ چپ رہے پھر فرمایا "کسی حد تک لیکن غالب سے کہیں زیادہ مومن ژولیدہ گفتار ہے۔ میں خود اگرچہ مومن کے مداحوں میں سے نہیں ہوں اور اس کے اسلوب فکر اور انداز تغزل کو ایک کارنامہ نہیں سمجھتا۔ لیکن کچھ نقادوں نے غالب کے مقابلے میں مومن کو اچھالا تھا۔" اس سلسلے کے تمام واقعات مجھے یاد آ گئے۔ اور مجھے خیال آیا کہ زوال پذیر قوموں کے نقاد بھی کس قدر ژولیدہ فکر ہو جاتے ہیں کہ پریشاں گفتاری کو، ندرت اسلوب اور ژولیدہ بیانی کو جدت ادا کا لقب دے کر معایب کو محاسن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بلھے شاہ کی کافیوں کا ذکر آیا۔ کچھ وقت تک پنجابی شاعری اور تصوف کا ذکر چلتا رہا۔ لیکن میرے دل کو چٹکی سی لگ گئی تھی۔ کہ موقعہ ملے تو علامہ سے کچھ اور پوچھوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسلام کی زوال پذیری کے سلسلے میں ایرانی تحریکات مذہبی کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ شاید اسلام کی زوال پذیری میں ان تحریکات نے کافی حصہ لیا ہے جنہیں مجوس کہا جاتا ہے فرمایا "ہاں اگر اسلامی علوم و فنون اور اسلامی روایات کا چشمہ بہت کم گدلا ہوا ہے تو وہ ترکان عثمانی کے یہاں ہے ورنہ اسلام کا چشمہ جس زمین سے گذرا ہے اس کو گدلا کر دیا گیا ہے۔ یا اس کا رخ پھیر دیا گیا ہے" ایک صاحب نے کسی نئی تصنیف کا ذکر چھیڑا جس میں آرٹ کے فلسفے سے بحث کی گئی تھی۔ علامہ نے فرمایا، "ایک جرمن مصنف کہتا ہے کہ فلسفے کے نظام دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ٹھوس وزنی ان میں مغز زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے ذرا ہلکے، جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ہر ٹھوس چیز سے بیگانہ ہو جاتی

ہیں، میں نے پوچھا "آرٹ بھی ٹھوس اور ہلکا ہو سکتا ہے فرمایا" ہو سکتا ہے زوال پذیر اقوام میں آرٹ کا رس نچوڑ کر نہیں پیا جاتا بلکہ پھل کی شکل بنا دی جاتی ہے اور اس کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آرٹ کی عظمت کا انحصار کس چیز پر ہے شکل پر یا مغز پر، علامہ نے ارشاد فرمایا کہ یوں تو شکل بھی مغز ہی کا ایک پہلو ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کی عظمت کا معیار مغز کی صحت مندی اور توانائی پر ہوتا ہے۔

علامہ نے ایک اور ملاقاتی خواجہ عبدالوحید سے اثنائے گفتگو فرمایا "اگرچہ آرٹ کے متعلق دو نظریے موجود ہیں اول یہ کہ آرٹ کی غرض محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے۔ اور دوم یہ کہ آرٹ سے انسانی زندگی کو فائدہ پہنچنا چاہیئے ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسان کی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے اور اس لیے ہر وہ آرٹ جو زندگی کے لیے مفید ہو اچھا اور جائز ہے جو زندگی کے خلاف ہو جو انسانوں کی ہمتوں کو پست اور ان کے جذبات عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابل نفرت و پرہیز ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔

آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لیے مردہ بنا دیتا ہے چنانچہ ہندو قوم کی تباہی میں اس کے فن موسیقی کا بہت حصہ رہا ہے [1]

علامہ موسیقی کو اقوام کی تباہی کا عنصر سمجھتے تھے ان کی تاریخ پر گہری نظر تھی اور وہ جانتے تھے کہ جب بھی اقوام نالے و چنگ و رباب کو اپنی زندگی میں اہمیت دینے لگتی ہیں ان کے قومی استحکام اور پامردی کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں سرود حلال کے عنوان سے انہوں نے لکھا۔

جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہان خودی
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود!

---

[1] ملفوظات ۱۸۶ - ۱۸۹

اسی طرح کہتے ہیں۔

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں [1]

وہ اپنے قارئین سے بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ ان سے نوائے چنگ کا مطالبہ نہ کریں۔ کیونکہ وہ عرصہ پیکار میں ہیں۔ ضربِ کلیم کے ابتداء میں کہتے ہیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق ہو پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

خود اپنے اشعار کے متعلق فرماتے ہیں۔

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں [2]

وہ مسلم ثقافت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں [3]

---

[1] ضربِ کلیم ص ۱۳۲
[2] ضربِ کلیم ۲
[3] بالِ جبریل ص ۵۹

تاہم یہ سرِ آتشہ ان لوگوں کے بس کا نہیں جو شعر و بیان کی صلاحیتوں کو قوم کے سلانے کے لیے استعمال کرتے ہوں اور انہیں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی بجائے انہیں مزید پختہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہوں۔ وہ غلامی کی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نفسیاتِ غلامی کے تحت لکھتے ہیں۔

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ!
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر نہ شیری کا فسانہ"
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ [1]

اٹلی کے قیام کے دوران "انسائیکلو پیڈیا اطالیانہ" کی ترتیب کے انچارج پروفیسر جنٹیلی کی زیرِ صدارت ایک علمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اقبال بھی شریک تھے۔ ایک صاحب نے اس کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ موسیقی اور شعر وغیرہ کو نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔ سلسلۂ گفتگو کے دوران یہ موضوع بھی زیرِ بحث آگیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا" قوم کی تعمیر و تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ تجویز نہایت مفید معلوم ہوتی ہے۔ جنٹیلی نے کہا کہ یہ چیزیں لوگوں کو..... کھینچ لانے کا اچھا ذریعہ ہیں اور اس کے بعد اچھی اور مفید باتیں ان کے ذہن نشین کی جا سکتی ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا" اس اعتبار سے بھی یہ طریقہ غلط ہے ہمارے ہاں اس کا تجربہ ہو چکا ہے لوگ خوش گلو شاعروں کے اشتہار دے کر لوگوں کو جمع کیا کرتے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ اب اگر..... علمیات کے لیے دعوت دی جائے تو کوئی بھی نہیں آتا"

---

[1] (ضرب کلیم ۱۴۲)

اس سلسلہ میں حضرت علامہ نے اسلام کی مثال دی جس میں ان چیزوں کو دبایا گیا تھا۔
پھر فرمایا "شعر شعر میں اور موسیقی موسیقی میں فرق ہے۔ اگر کوئی ایسا شاعر پیدا ہو جائے جو دنیا کو حقیقی زندگی، عمل اور حرکت کا موثر پیغام دے سکے یا کوئی ایسا موسیقی دان پیدا ہو جائے جو حیاتِ اقوام کے اصول کو ملحوظ رکھ کر نئی راگنیاں پیدا کر سکے تو خیر لیکن جو کچھ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس سے قوت عمل میں ضعف و انحطاط پیدا ہونے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا"۔ چونکہ اسی روز صبح کے وقت حضرت علامہ نے روما کے آثار قدیمہ کو دیکھا تھا۔ اس لیے ان کے متعلق بھی گفتگو شروع ہو گئی۔

حضرت علامہ نے فرمایا "مسلمانوں کے طرزِ تعمیر کو دیکھیے اس کے اندر اسلامی روح کا ظہور سب سے زیادہ بہتر صورت میں ہوا۔ اس لیے کہ عمارتیں زیادہ دیر تک قائم رہتی ہیں اور قوم کی روحِ عمل اور انداز و اسلوب فکر کی زیادہ مدت تک آئینہ داری کر سکتی ہیں"[1]

علامہ کی ادب و فن کے بارے میں رائے کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی آپ سے ۱۶/اکتوبر ۳۶ء کی ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ادبی تنقید کا ذکر نکلا تو فرمایا جہاں تک صحیح تنقید کا سوال ہے، ہندوستان ابھی مغرب سے سو سال پیچھے ہے ہندوؤں میں تو کچھ حقیقت پسندی شروع ہو چلی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں ابھی تک روحانیت کا اثر باقی ہے۔ گذشتہ پانچ سو سال میں مسلمانوں کے آرٹ لٹریچر اور شاعری کا رجحان یہ رہا ہے کہ حقائق سے گریز کیا جائے۔ اور خیالی دنیا میں زندگی بسر کی جائے۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر آپ پر کیا اثر ہوا۔ میں نے کہا۔

It is a Commentary on the Quran written in stones.

یہ قرآن حکیم کی وہ تفسیر ہے جو پتھروں کے ذریعے لکھی گئی ہے۔

سفر یورپ کے دوران لندن جاتے ہوئے علامہ کو مارسیلز میں کچھ دیر رکنے کا اتفاق ہوا وہاں چند گھنٹے قیام کے دوران علامہ نے سیر کی۔ لکھتے ہیں

---

[1] (گفتار ۲۶۴ - ۲۶۵)

"مارسیلز کا نوٹرڈام گرجا بہت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقوس ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام علوم و فنون کی محرک ہوئی ہے۔"[1] (ہاشمی ۱۰۲ - ۱۰۳)

علامہ نے اٹلی کے سفر کے دوران روما کے آثار قدیمہ کی عظمت جبروت وجلال اور وسعت کو بہت سراہا۔ انہوں نے اس دوران کیٹیا کو جب بھی دیکھے اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔ کیٹیا کو مب کے محافظوں نے بتایا کہ یہ زمین دوز اور پرپیچ راستے مسلسل آٹھ میل تک چلے گئے ہیں۔ حضرت علامہ نے کہا" مذہب بھی کیا چیز ہے کوئی دوسری قوت عقیدے اور ایمان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا مذہبی عقائد کے جوش میں ہوا۔ عقیدہ غلط بھی ہو لیکن جب مذہب کے رنگ میں دل پر قبضہ پا لیتا ہے تو انسان کے عمل میں عجیب وغریب حرارت پیدا کر دیتا ہے۔"[2]

علامہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے ذوق کا صحیح اظہار فنِ تعمیر میں ہوا ہے نظم مسجد قرطبہ میں بھی یہی خیال جھلکتا ہے جس میں انہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ فن کی تشکیل خونِ جگر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ علامہ کہتے ہیں

رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
فطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود[3]

ہسپانیہ کے سفر سے علامہ کو حجازی مسلمانوں کے فنِ تعمیر کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ وہ اس سے پہلے ہندوستان کے مسلم فن تعمیر کا گہرا علم رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک ملاقات میں اسلامی فن تعمیر کی قوت وہیبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلمانوں کی عمارات دو قسم کی ہیں۔ جلالی اور جمالی اور یہ دونوں قسم کی عمارات اپنے

---

[1] رفیع الدین ہاشمی خطوطِ اقبال ص ۱۰۲ - ۱۰۳ [2] سیاحتِ اقبال، حق نواز، ۱۴۷، ۱۴۸ [3] بالِ جبریل ص ۱۲۹

بنانے والوں کے کردار کا آئینہ ہیں۔ جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر میں محبت کا عنصر زیادہ تھا۔ اس لیے تاج محل، شاہدرہ، شالامار باغ اور شاہی مسجد حسن و جمال کا مظہر بن گئیں۔ شیر شاہ سوری پیکر جلال تھا۔ اس لیے اس کے تعمیر کردہ قلعوں میں ہیبت برستی ہے اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قفر زہرا دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے مسجد قرطبہ مہذب دیوؤں کا مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا۔ [1]

علامہ آئی آئی قاضی، مولانائے روم کا ایک قول یوں نقل کرتے ہیں۔ چونکہ علامہ کی فکر پر ان کے اثرات غالب تھے۔ اس لیے یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولانا روم فرماتے ہیں "یاراں کہ نزدِ من می آیند از بیم آں کہ ملول شوند شعری گوئیم تا بداں مشغول شوند۔ ورنہ من کجا و شعر از کجا! واللہ کہ من از شعر بیزارم پیش من بدتر ازاں چیزی نیست احباب میرے دوست میرے پاس آتے ہیں تو اس ڈر سے کہ وہ ملول نہ ہوں، شعر سنا دیتا ہوں کہ اس میں مشغول رہیں ورنہ میں کہاں اور شعر کہاں۔ اللہ کی قسم کہ شعر سے بیزار ہوں۔ میرے نزدیک اس سے بُری چیز کوئی نہیں ہے) علامہ کے نزدیک بھی شعر کی حیثیت اس سے بڑھ کر نہ تھی۔ کہ

نغمہ کجا و من کجا سوزِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطاری کشم ناقۂ بے زمام را

آپ اصلی خیال کا اظہار ایک جگہ خط میں یوں کرتے ہیں

Poetry is something more than the mere correctness of idioms and expressions. My ideals are different to the critics literary ideals. Poetry plays only subordinate role in my utterances and it is not my ambition to be classed among the poets of the day.

---

[1] (ذکر اقبال، عبدالمجید سالک، بزم اقبال لاہور ص ۱۸۱ - ۱۸۲)

(شاعری محض مخامات اور اظہار بیاں کی صحت سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے میرے معیار تنقید نگاروں کے ادبی معیاروں سے مختلف ہیں۔ میرے کلام میں شاعری محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے قطعاً یہ خواہش نہیں کہ دور حاضر کے شعراء میں میرا بھی شمار ہو)

آپ بخوبی سمجھتے تھے کہ شعر وہ قوت فراہم نہیں کر سکتا جو صرف اور صرف ایمان میں میسر ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ نے شعر گوئی کی طرف لوگوں کو توجہ نہیں دلائی۔ جہاں تک نوجوانوں کا تعلق ہے وہ انہیں ہمیشہ اس سے باز رہنے اور اپنی قوتوں کو بہتر مصرف میں لانے کے لیے کہتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی۔ کہ شعر کا دائرہ بالخصوص برصغیر میں کاکل و رخسار کے تذکروں اور رندی و ہوسناکی ہی میں محدود تھا۔ ہماری مشرقی شاعری کے پیش پا افتادہ مضامین میں وہ عنصر سرے سے ناپید تھا جسے علامہ قوم کی فوری اور بنیادی ضرورت سمجھتے تھے۔ آپ کے نزدیک شعر ملت اسلامیہ کے استحکام کا ذریعہ ہونا چاہیے نہ کہ اس کے ضعف اور اضمحلال کا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے شاعری کی روش کو اس مقصد کے بالکل خلاف پایا تو آپ نے اس کی بجائے اسلام کی بنیادی حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی۔ علامہ نے اسی اہم بات کو اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب کے نام ایک خط میں یوں تحریر فرمایا ہے۔

"جرمنی کے شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر نوجوانوں کے روحانی اضطراب اور بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔[1]

Art still has truth take refuge there

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت میں جرمنی کی تھی۔ اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے نام وہی ہے جو گوئٹے نے دیا صرف قدر فرق ہے کہ میں نے (Art) کے لفظ کی جگہ لفظ (Religion) رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے "آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں۔ مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔" (اقبال بنام شیخ اعجاز احمد اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۱، ص ۵۶)

بدقسمتی سے علامہ کے اس نظریے کو اس دور کے کوتاہ اندیش نہ سمجھ سکے اور علامہ کی

---

[1] (ہاشمی ۱۳۲ - ۱۳۳)

شاعری پر اس درجہ زور و شور سے بحث کی گئی ہے کہ ان کی زندگی کے دیگر انتہائی اہم پہلو نظر انداز ہو گئے ہیں۔ علامہ کا علم و فضل اور وہ خاص بصیرت جس کا تجربہ ان کی ایک ایک سطر اور ایک ایک مصرعے سے ہوتا ہے، علامہ کا گہرا تاریخی شعور اور ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر گہری نظر یہ سب کچھ تغافل کی نذر ہو گیا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ علامہ کے ان پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ آپ غنی کاشمیری کی طرح، بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔

ے زشعرِ من شدہ پوشیدہ فضل و دانش من

چو میوہ کہ بماند بزیر برگِ نہاں

میرے اشعار کی وجہ سے میرا فضل و دانش اسی طرح پوشیدہ ہو گیا ہے جیسے کہ پتوں کے نیچے پھل چھپ جاتے ہیں) علامہ شعر کے بارے میں جو تصورات رکھتے تھے ان کا بڑا خوبصورت اظہار آپ نے ان اشعار میں کیا ہے؛

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل

ملتے بے شاعرے انبارِ گل

سوز و مستی نقشبندِ عالمے است

شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

شعرِ مقصود اگر آدم گری است

شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

(شاعری کی حیثیت سینۂ ملت میں دل کی سی ہوتی ہے قوم شاعر کے بغیر مٹی کا ایک ڈھیر ہے دنیا کا تمام تر انحصار سوز و مستی پر ہے جس شاعری میں یہ نہ ہو وہ ماتم کے سوا کچھ ہے اگر شعر کا مقصد انسان سازی ہے تو شاعری پیغمبری کے ورثے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے)

اقبال کے نزدیک ہوش مندی کے کسی بھی دور میں شاعری محض دماغی تفریح یا خالی انجمن آرائی کا ذریعہ نہ تھی وہ بے مقصد شاعری کو ضیاع قوت وقت سمجھتے تھے۔ خاص قومی مقصد و نصب العین تو پہلے سے ان کے سامنے تھے۔ لیکن جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہی ان

کے قلب صافی پر منشرح ہوا۔ انشراح کامل کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ اردو زبان ان کے پیغام کے لیے ضرورت کے مطابق ساز گار نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا انہیں فارسی اختیار کرنا پڑی جو دقیق و بلند افکار کے اظہار کے لیے اردو سے زیادہ ثروت مند تھی۔ نیز کئی اکابر اس زبان سے حکمت فلسفے، تصوف، اخلاق، سیاسیات اور رزم و پیکار کے دائروں میں کام لے چکے تھے۔ اقبال خود فرماتے ہیں

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامہ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام

علاوہ بریں فارسی نے کم از کم اسلامی ممالک میں فی الجملہ بین المللی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ نیز فضلائے مغرب کا بھی خاصہ بڑا طبقہ اس سے شناسا تھا یہ کہہ لیجیے کہ بالکل نا آشنا نہ تھا۔ گویا فارسی کے ذریعے سے اقبال کا پیغام براہِ راست وسیع تر طبقوں تک پہنچایا جا سکتا تھا۔[1]

علامہ شاعری کو عبادت سمجھتے تھے نہ کہ وجہ شہرت۔ وہ اس کا تذکرہ اپنے عزیز دوست مولانا غلام قادر گرامی کے نام ایک خط میں یوں کرتے تھے۔

دوسرے حصے میں جواب شائع ہو گا۔ حیات ملی یعنی اجتماعی زندگی کے اصول پر بحث ہے اور خالص اسلامی نکتہ خیال سے..... میرا مقصد کچھ شاعری نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ احساس ملیہ پیدا ہو۔ جو قرون اولےٰ کے مسلمانوں کا خاصہ تھا۔ اس قسم کے اشعار لکھنے سے غرض عبادت ہے نہ شہرت۔ کیا عجیب کہ نبی کریم کو میری یہ کوشش پسند آجائے اور ان کا استحسان میرے لیے ذریعہ نجات ہو جائے۔[2]

---

[1] (غلام رسول مہر دیباچہ مکاتیب گرامی ۴ - ۵) [2] (بنام گرامی ۳ ستمبر ۱۷، گرامی ۳۶

جہاں علامہ اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں قرون اولے کے مسلمانوں کا سا جذبہ پیدا ہو جائے وہاں انہیں اس بات پر بے حد تشویش تھی کہ ان کے ذہن و عمل کے سانچے غیر اسلامی بنیادوں پر استوار ہیں اور اس وجہ سے ان میں اسلام کی حقیقی روح تک پہنچنے کی راہ میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جگہ جگہ عجمی تصورات اور مقامی زناری اثرات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ عجمی تصوف نے مسلمانوں کو بے عملی کی طرف راغب کیا تو برہمنی اثرات نے ان میں مشرکانہ رسوم و رواج کے بندھن جوں کے توں رہنے دیئے۔ علامہ اس صورت حال کا شدید احساس رکھتے تھے۔ اور ان کے خیال میں معاشرے میں اسلامی اقدار کی راہ میں فرنگی غلامی کے علاوہ یہ بڑی رکاوٹیں تھیں جنہیں عبور کیے بغیر اسلامی نظام کی راہ استوار نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ استدعا کی۔

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

شاعری زیر مثنوی مقصود نیست

جلیل قدوائی صاحب کی ایک تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ کا رویہ ان لوگوں کے بارے میں کیا تھا۔ جو انہیں محض ایک غزل گو کی حیثیت دیتے تھے اور چاہتے تھے کچھ دیر تفریح طبع کا سامان رہے اور بس۔ علامہ نے تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے سلسلے میں مدارس میں جو خطبات دیئے تھے۔ وہی دوبارہ علی گڑھ میں بھی دیئے۔ یہ خطبات فلسفیانہ مضامین لیئے ہوئے تھے اور اس میں اسلام کے فکری احیاء پر بہت کچھ مواد موجود تھا۔

قدوائی صاحب لکھتے ہیں۔ "علی گڑھ میں جب وہ خطبات مدارس کے سلسلے کی تقریر فرما چکے تو ایک نشست میں یونین ہال میں جہاں ان کی تقریر ہوئی تھی۔ طلبا نے ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی تھی۔ کہاں تو آپ نہایت باوقار اور سنجیدہ بلکہ فلسفیانہ انداز سے اپنے موضوع

پر اظہار خیال فرما رہے تھے مگر شعر سنانے کی فرمائش سنتے ہی آپ کے مزاج کا اعتدال جاتا رہا اور آپ نے نہایت تلخ اور تیز بلکہ غصہ کے لہجہ میں نوجوانوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور فرمایا کہ جس قسم کی شاعری موصوف نے کی وہ محفل گرم کرنے اور مشاعرہ بازی کے لیے نہیں بلکہ اصلاح احوال قوم کی خاطر تھی اور چونکہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس لیے آپ نے شعر کہنا بند کر دیا۔ آپ نے نوجوانوں کو تاکید کی کہ شعر گوئی اور شعر خوانی کی لغویت سے دور رہیں۔

آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے شعر کہنا بند کر دیا مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے متفرق اشعار یا نظمیں کہنی بند کر دی تھیں۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کا کلام مجموعوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے بازار میں آیا۔ متفرق کلام آپ نے نہ سنایا نہ رسالوں میں شائع کرایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل کہتے رہتے تھے اور اسے کتابی صورت میں شائع کراتے تھے۔ جستہ جستہ کہہ کر اور سنا کر اس کا اثر اور وقار ضائع نہ کرتے تھے۔"[1]

یوں بھی شاعری کے متعلق اقبال کے جو نظریات تھے وہ ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ علامہ نے بارہا وضاحت سے کہا کہ مجھے شاعر نہ کہا جائے۔ حتیٰ کہ شکایت کے انداز میں کہا کہ

مرا یاراں غزل خوانے شمردند

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "کلام کا بہت سا حصہ نظر ثانی کا محتاج ہے لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں، تاہم جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس، اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غائیت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں۔ جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے۔ یعنی گوئٹے اور اویلنڈ، گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اسے پورا موقع مل گیا۔ اویلنڈ تمام

---

[1] (اوراق گم گشتہ ص ۲۸۰)

عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشو و نما نہ پا سکا جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ موجودہ حالات میں میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لیے سید سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو لیکن اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے۔ اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں۔ اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہو گا۔[1]

افسوس کی بات یہ ہے کہ علامہ کو دل و دماغ کی سرگذشت لکھنے کا موقع نہ مل سکا ورنہ ان کے کلام کے بارے میں بہت سے اعتراضات جو عام طور پر وارد کیے جاتے ہیں دور ہو جاتے اور معترضین کو طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کا موقع کم رہ جاتا۔

اقبال ادبیات اسلامیہ کی اصلاح کو ملت اسلامیہ کی اصلاح اور قوت کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں حرارت اور قوت پیدا کرنے کے لیے بلند خیالات کی سخت ضرورت ہے۔ وہ مایوسی اور افسردگی پیدا کرنے والے آرٹ اور شاعری کے قائل نہ تھے۔

بلبل کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اکبر منیر صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں" خیالات کے لیے طبیعت پر زور دینا چاہیے مطالب جلیلہ کی مشرقی نظم کو بہت ضرورت ہے حکیم سنائی اور مولانا روم کو زیر نظر رکھنا چاہیے۔ اس قسم کے لوگ اقوام و ملل کی زندگی کا اصل راز ہیں۔ اگر یہی لوگ غلط راستے پر پڑ جائیں تو اقوام کی ہلاکت بھی انہی کے ہاتھوں سے ہوتی ہے مولانا روم کے تو اسرار و حقائق زندہ جاوید ہیں۔ حکیم سنائی سے طرز ادا سیکھنا چاہیے۔ کیونکہ مطالب عالیہ کے ادا کرنے میں ان سے بڑھ کر کسی نے قدم نہیں رکھا۔

ایرانی اخبارات میں اس قسم کی نظمیں شائع کیا کیجئے۔ مغربی اور وسط ایشیاء کی مسلمان

---

[1] (سید سلیمان ندوی ۱۰، اکتوبر ۱۹۱۹ء اقبال نامہ اول ۱۰۸ - ۱۰۹)

قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ مضامین اتحاد کی سخت ضروری ہے۔ میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلال اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔ ہندوستان میں بظاہر... امن و سکون ہے مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخ امم میں بے نظیر ہے۔ ہم لوگ جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں۔ اس کی عظمت اور اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے۔ آئندہ نسلیں اس کی تاریخ پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔ ایشیاء کی مسلمان اقوام کی حرکت بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ کیا عجب کہ اس نئی بیداری کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں بھی جولائی یا اگست کے مہینے میں ایران جا نکلوں۔[1]

مکتوب الیہ مختلف اسلامی ممالک کا سفر کر رہے تھے۔ اقبال کی خود دیرینہ آرزو تھی کہ وہ بلاد اسلامیہ کا سفر کریں جو اگرچہ پوری نہ ہوئی تھی۔ لیکن ان کا بس چلتا تو وہ اڑ کر جا پہنچتے اس حالت میں بھی کہ انہیں درد نفرس (گاؤٹ) کی وجہ سے سخت تکلیف رہی تھی اور دو ماہ تک چارپائی سے نہ اتر سکے تھے۔ ایران جانے کے متمنی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان کی فطرت کو ایران سے ایک مناسبت خاص ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کا ان پر اچھا اثر ہو۔ اکبر منیر صاحب کے سفر کے حالات پڑھ کر بے حد خوش ہوئے اور انہیں لکھا۔

خط آپ کا ابھی ملا ہے جسے پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کو اسلامی ممالک کے سفر سے بہت فائدہ ہوا ہے اور ہوگا۔ اشعار جو آپ نے بھیجے ہیں نہایت دلچسپ ہیں اور بالخصوص "مسلمانے نمی بینم" نے تو مجھے رلا دیا۔ اللّٰھم زد فزد.... دنیا کے دل میں انقلاب ہے اس واسطے قلوب انسانی اس سے متاثر ہو رہے ہیں اسلام کی عظمت کا زمانہ انشاء اللہ قریب آ رہا ہے۔[2]

پروفیسر اکبر منیر صاحب کے جن اشعار کی علامہ نے تعریف کی اور اس سے اتنا اثر لیا کہ اس کا اندازہ مسلمانے نمی بینم، کے ٹکڑے سے ہوتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ ہر

---

[1] (بنام پروفیسر محمد اکبر منیر اقبال نامہ حصہ دوئم ص ۱۶۲۔ ۱۶۳)

[2] (بنام پروفیسر محمد اکبر منیر ۲ فروری ۲۴ء اقبال نامہ حصہ دوئم ص ۱۶۵۔ ۱۶۶)

چند جوانوں کو شاعری سے منع کرتے تھے۔ لیکن اکبر منیر صاحب کی شاعری کی اس وجہ سے تعریف کی کہ وہ اسلام کی روح کے قریب تر ہے اور انہیں اس سے منع نہیں کیا۔ علی گڑھ میں تو یہ صورت حال پیش آچکی تھی کہ علامہ نے شعر سنانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح جب بھی نوجوان شعر میں دلچسپی کا اظہار کرتے تو علامہ انہیں نثر اور سنجیدہ مضامین کی طرف متوجہ کرتے شاعری ہمارے یہاں یاسیت کی نقیب رہی ہے شاعری میں رجائیت یا روشن فکر کے چراغ جلتے نظر نہیں آتے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں تو یورپی شاعری میں بیمار قنوطیت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس کے اثرات جدید شاعری پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کی بیمار شاعری کی بجائے اقبال کے حیات بخش پیغام کو سمجھا جائے اور ان کی تحریک اصلاح ادبیات اسلامیہ کو عملی شکل دی جائے۔

اقبالؒ اور تحقیقاتِ اسلامی

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال نہ محض شاعر تھا۔ نہ سیاسی لیڈر بلکہ ایک اسلامی فلاسفر۔ یہ معاملہ دوسرا ہے کہ اس نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے نثر کی بجائے نظم کا انتخاب کیا۔ اس صنف ادب کو بھی وہ جان بخشی کہ باید وشاید"۔ [1]

علامہ اقبال نے جہاں اپنے کلام کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کے مردہ دلوں کو گرمایا وہاں انہوں نے اس بات کی کوشش بھی کی کہ مسلمانوں میں علمی تحقیق کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں میں ایسی تنظیمیں بن جائیں جو علم و تحقیق کے میدان میں کام کریں تو اس کے بہت مفید نتائج نکلیں گے۔ مسلمانوں نے تعلیم و تحقیق کا میدان ایک عرصہ سے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کی تمام تر سرگرمیاں چند نوکریوں، مناصب اور عہدوں کے لیے مخصوص ہو چکی تھیں۔ وہ سیاسی، علمی، تعلیمی ہر میدان میں نہ صرف پسماندہ تھے۔ بلکہ انہیں ان کی ان شعبوں میں آگے بڑھنے کی طلب بھی ختم ہو چکی تھی۔ اقبال نے اس صورتِ حال کو سمجھا اور صدسالہ غلامی کے منفی اور تباہ کن اثرات سے نجات دلانے کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل اور طریقِ کار منتخب کیا جس پر وہ تمام عمر کاربند رہے۔ انہیں جہاں کوئی جوہر قابل نظر آتا۔ وہ اس کی تربیت کو اپنا فرض سمجھتے۔ انہیں جس پلیٹ فارم سے بات کرنے کا موقع ملتا وہ محض رسمی صدارتی تقریر پر اکتفاء نہ کرتے، مسلمانوں کو علمی تجاویز دیتے اور اس سلسلے میں تاکید و توجہ سے کام لیتے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ جہاں مسلمانوں کا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے اصولوں کو نہیں سمجھتا وہاں علماء بھی عصرِ حاضر کے مسائل اور قانونی ضروریات سے پوری طرح واقف نہیں اس لیے وہ چاہتے تھے کہ وہ آپس میں تعاون کر کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوں۔ انہوں نے اپنی عمر کا خاصا بڑا حصہ اسی جدوجہد میں گذارا کہ دونوں طبقوں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ وہ چاہتے تھے

---

[1] جلال الدین بارات لاء (ملفوظات ۶۷)

کہ علماء اور مسلمان قانون دان حضرات کا ایک ایسا مشترک ادارہ قائم کیا جائے۔ جو مسلمانوں کی تمام قانونی ضروریات کو پورا کرسکے۔ اور فقہ اسلامی کی تشکیلِ نو کا وہ اہم فرض ادا کرے جس کی طرف وہ بار بار توجہ دلاتے رہے ہیں۔ جب ۱۹۳۲ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد لاہور میں خطبۂ صدارت پڑھا تو اپنی تقریر میں پانچ تجاویز پیش کیں جن میں سے آخری تجویز یہ تھی۔ کہ علماء کی جمعیت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس میں مسلمان وکلاء بھی جو جدید فقہ سے واقف ہوں شامل ہوں وہ کہتے ہیں۔

"میں علماء کی جمعیت کے قیام کا مشورہ دوں گا۔ جس میں وہ مسلمان وکلاء بھی شامل ہوں جو موجودہ فقہ سے واقف ہیں۔ اس کا مقصد اسلام کی حفاظت، وسعت اور تجدید ہو لیکن اس طرح کہ بنیادی اصولوں کی روح قائم رہے اس جماعت کو دستوری سند حاصل ہو تاکہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لاء (شخصی قانون) پر اثر انداز ہوتا ہو اس جماعت کی منظوری کے بغیر قانون نہ بن سکے۔ اس تجویز کے محض عملی فائدہ کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ کہ زمانۂ حاضر (اور اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں) کو ابھی اسلام کے قانونی ادب کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں۔ خصوصاً سرمایہ دار ذہنیت کی دنیا کے لیے جہاں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جا چکی ہیں۔ اس قسم کی اسمبلی کا قیام اس ملک میں اسلامی اصولوں کے سمجھنے میں بہت مدد دے گا۔" [۱]

علامہ اقبال تحقیقات اسلامی کی تنظیم کے قیام کی ضرورت پر بے حد زور دیتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی تنظیم یا کسی درسگاہ میں ایسے شعبے کے قیام سے اسلام کے اصل مقاصد پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹانے اور مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی روح کے سمجھانے میں بہت مدد ملے گی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کئی افراد کو متوجہ کیا۔ جب ۱۹۳۷ء میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ لاہور نے یوم اقبال منایا تو سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب نے علامہ کو دو لاکھ روپے کی تھیلی پیش کرنے کی تجویز کا اظہار کیا۔ علامہ کی سیر چشمی اور طبیعت کی قلندری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس رقم کے اکٹھے کیے جانے کی تجویز کو مسترد کر دیا اور کہا کہ میری

---

[۱] (حرف اقبال۔ لطیف احمد شیروانی، لاہور ۱۹۵۵ء ص ۷۶، ۷۷)

قوم غریب ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ان پر یہ بار پڑے۔ اس کے علی الرغم انہوں نے اجتماعی ضروریات کا ذکر کرتے ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ اس موقع پر عوام کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شعبہ تحقیقات اسلامیہ قائم کرنے کی تجویز سامنے لائی جائے۔ انہوں نے کہا۔

"میں سر سکندر حیات خان کا نہایت ممنون ہوں، کہ انہوں نے انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ لاہور کو پیغام دیتے ہوئے میرے متعلق بہت مشفقانہ رائے کا اظہار کیا۔

میں ان کی اس تجویز پر کہ میرے کلام کے ناظرین اور میری تصانیف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات مجھے ایک تھیلی پیش کریں۔ کچھ ضرور کہنا چاہتا ہوں میرے خیال کے مطابق عوام کی ضروریات بحیثیت مجموعی کسی ایک فرد واحد کی ضروریات سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہیں خواہ اس کی تصانیف عامۃ الناس کے لیے روحانی فیضان کا ذریعہ ہی کیوں نہ ہوں ایک شخص اور اس کی ضروریات ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن عوام اور ان کی ضروریات ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔"

علامہ اقبال کا انجمن حمایت اسلام سے جو گہرا تعلق تھا۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ علامہ نے پہلے پہل انجمن ہی کے سٹیج سے اپنی مشہور نظمیں نالۂ یتیم، یتیم کا خطاب ہلال عید سے، اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے، فریادِ امت، تصویرِ درد، شکوہ، شمع اور شاعر خضرِ راہ سنائیں۔ علامہ کا خیال ہے کہ انجمن حمایت اسلام اور اس کے ادارے برصغیر کے مسلمانوں میں اسلام کا شعور پیدا کرنے کے لیے اہم خدمات انجام دے سکیں گے۔ یہی وجہ ہے، کہ علامہ کا انجمن اور اس کے اداروں سے گہرا تعلق رہا اور علامہ اپنے پیغام کو اسی سٹیج سے پہنچاتے رہے۔

علامہ چاہتے تھے کہ اسلامیہ کالج علم و فضل کا ایک ایسا گہوارہ بن جائے جو اپنی فضیلت کی وجہ سے وہی کام کرے۔ جو نظامیہ نے سلجوق دورِ حکومت میں کیا تھا۔ علامہ چاہتے تھے کہ تعلیم کا یہ سرچشمہ غرناطہ و بغداد کے علمی اداروں کی یاد تازہ کر دے۔ انہوں نے ۱۹۰۲ء میں انجمن کے سالانہ اجلاس میں ایک نظم پڑھی جس کا نام تھا "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے، علامہ اسلامیہ کالج کی زبانِ حال سے یہ اشعار کہلواتے ہیں۔

طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر
آہ وہ دلکش مرقع پھر دکھا سکتا ہوں میں

آئیں اڑ اڑ کے پتنگے روم و مصر شام سے
شمع اک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں

آزما کر تم ذرا دیکھو میرے اعجاز کو
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دکھا سکتا ہوں میں

گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اس زمانے میں سنا سکتا ہوں میں

ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں[1]

علامہ کو اس اسلامی درسگاہ سے جو توقعات تھیں وہ بڑی حد تک پوری ہوئیں۔ اسلامیہ کالج نے ایسے طلبا پیدا کیے جنہوں نے آگے چل کر تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور ملک و قوم کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ چند نام جو اسلامیہ کالج سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے اور جو اتفاقاً ذہن میں آرہے ہیں۔ یہ ہیں۔ چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان، شیخ محمد عبداللہ، حمید نظامی، سید قاسم رضوی، ڈاکٹر تاثیر، علامہ عبداللہ یوسف علی، مولانا مودودی، مولانا علم الدین سالک، نسیم حجازی اور دوسرے بے شمار زعماء۔

علامہ نے اسی نظم میں آگے چل کر کہا تھا۔

یہ نظامیہ سلامت ہے تو پھر سعدی بہت
ہاں ذرا ویسا منور اپنا کاشانہ تو ہو

یادگارِ فاتحانِ ہند و اندلس ہو تمہیں
شانِ شاہانہ نہ ہو میری امیدانہ تو ہو

وہ غنی ہے علم کی دولت بھی کرتا ہے عطا
ہاں مگر پہلے روشن تیری گدایانہ تو ہو

---

[1] اسرار و رموز ص ۳۳

رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے
زندگی تیری جہاں میں دل ربایانہ تو ہو [1]

علامہ جہاں پوری دنیا اور برصغیر کے مسلمانوں کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ وہاں انہیں پنجاب کے مسلمانوں کی دینی ضروریات کا بھی احساس رہتا تھا۔ علامہ نے انجمن حمایت اسلام اور اس کے اداروں سے جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہیں اس بات کا خاص طور پر احساس تھا کہ پنجاب کے مسلمانوں میں علمی بیداری کا فقدان ہے اور ان میں اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے کا جذبہ موجود ہونے کے باوجود، صحیح اسلامی شعور نہیں جس کی وجہ سے مختلف مفاد پرست حضرات انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پنجابی مسلمان کے بارے میں علامہ نے لکھا۔

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

اس علاقے میں قادیانیت نے جس طرح پر پرزے نکالے اس سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا اسلامی شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ مرزا غلام احمد کو متبع مل جائے۔ علامہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار کرنے کے لیے تحقیقاتِ اسلامی کو مقدم سمجھتے تھے۔ آپ نے اسلامیہ کالج میں تحقیقاتی شعبہ قائم کرنے کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا، "مقامی اسلامیہ کالج میں اسلامیات کے متعلق طرز جدید پر تحقیقی شعبہ کا قیام صوبے کی اہم ترین ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان کے کسی صوبہ میں اسلامی تاریخ الٰہیات، فقہ اور تصوف سے لاعلمی کی وجہ سے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا گیا جتنا پنجاب میں۔

یہ بہترین وقت ہے کہ اسلامی فلسفہ اور زندگی کا غائر مطالعہ کر کے لوگوں پر واضح کیا جائے کہ اسلام کا اصل مقصد کیا ہے۔ اور کس طرح اس خول نے جو موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے ضمیر پر

---

[1] (سرودِ رفتہ ص ۳۷)

چھایا ہوا ہے۔ ان اصولوں اور خیالات کو دبا دیا ہے اس خول کو فوراً دور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نئی پود کا ضمیر اس آلائش سے پاک ہو کر فطری اور آزادانہ طریق پر پرورش پا سکے۔

اس قسم کے ادارے سے اب بھی مسلمان کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ اسلام ایشیائی قوموں کی زندگی میں بڑا اہم جزو ہے اور رہا ہے۔ اور نیز نوع انسان کے مذہبی اور عقلی ارتقاء میں اس کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔"[1]

اقبال کی تمام تر توجہ اور کوشش کے باوجود اسلامیہ کالج نے تو اس سلسلے میں باقاعدہ طور پر تحقیقی شعبہ قائم نہ کیا تاہم لاہور کے نوجوانوں نے مل کر ایک ادارہ بنام ادارہ معارفِ اسلامیہ (اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) قائم کر لیا۔ اس کے متعدد اجلاس ہوئے جن میں علامہ نے بھی شرکت کی۔ اس کی روحِ رواں اس کے سیکرٹری خواجہ عبدالوحید تھے۔ ادارہ معارف اسلامیہ اپنے نوع کی پہلی کوشش تھی اور اگرچہ یہ ادارہ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ تاہم اس نے بہت سے ہم خیال لوگوں کو اکٹھا کرنے اور اسلامی تحقیقات کے کام کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عرب دنیا کے نامور محقق اور فاضل ڈاکٹر احسان حقی صاحب بھی اس کے رکن تھے۔ علامہ اقبال نے ادارہِ معارفِ اسلامیہ کی جانب سے ان کو ایک سرٹیفکیٹ بھی مرحمت فرمایا۔ جو ڈاکٹر صاحب کی معروف کتاب "باکستان ماضیہا وحاضرہا" میں جو پیروت سے چھپی ہے، شامل ہے۔ اس ادارے نے متعدد اجلاس کیے۔ اور مختلف موضوعات پر اہل علم حضرات کی تقریریں کروائیں۔ اس سے جہاں پڑھے لکھے افراد میں کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا وہاں انہیں ایک ایسا پلیٹ فارم بھی مل گیا جہاں سے وہ اپنے نتائج فکر کو عوام تک پہنچا سکتے تھے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں یہ اپنے نوع کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے بعد چوہدری نیاز علی خان صاحب نے پٹھانکوٹ کے مقام پر دارالاسلام کی بنیاد رکھی اور علامہ کی کوششوں سے مولانا مودودی حیدر آباد دکن چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ علامہ نے فرمایا تھا کہ اگر مودودی صاحب آ جائیں تو وہ خود بھی سال کا کچھ حصہ وہاں بسر کیا کریں گے۔ یہ ۳۷ء کے اواخر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اپریل ۳۸ء میں ان کا وہاں سے بلاوا آ گیا۔ جہاں ہم سب کو جانا ہے اور اس طرح پٹھانکوٹ میں

---

[1] (حرفِ اقبال مرتبہ لطیف احمد شیروانی لاہور ۱۹۵۵ء ص ۲۲۱، ۲۲۲)

قدیم و جدید علماء کو اکٹھا کر کے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے علمی بنیاد فراہم کرنے کے اہم کام میں علامہ شریک نہ ہو سکے۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے جہاں کئی نمایاں علمی اجلاس منعقد کیے اور اس طرح مسلمانوں میں علمی ذوق کو جلا بخشی وہاں اس کا یہ کام بھی انتہائی اہم حیثیت رکھتا ہے کہ مسلسل لکھا جائے۔

پہلا یوم اقبال اسی ادارے کے تحت وائی ایم سی اے ہال لاہور میں ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو منایا گیا۔ دوسرے دن لاہور کے اس وقت کے مشہور ریسٹوران "لورینگ" میں حضرت علامہ کے اعزاز میں عصرانے کا بندوبست کیا گیا۔ پہلے اجلاس میں حکیم احمد شجاع نے "اقبال ایک شارح تعلیم اسلام کی حیثیت" کے موضوع پر تقریر کی۔ اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے "اقبال اور سیاست عالیہ" پر اظہار خیال کیا۔ اسی روز دوسرا اسیشن ہوا جس میں شیخ اکبر علی ارسطو، ڈاکٹر تاثیر اور ایم اے مجید نے اظہار خیال کیا۔ اس اجلاس کی صدارت مشہور ہندو سائنس دان ڈاکٹر بھٹناگر نے کی۔ اس اجلاس کا تمام تر انتظام انسٹی ٹیوٹ کے سیکرٹری خواجہ عبدالوحید نے کیا۔ دوسرے روز عصرانے میں ڈیڑھ سو مقامی معززین موجود تھے۔ مولانا سالک مدیر انقلاب نے مختصر تقریر میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور حضرت علامہ سے استدعا کی کہ وہ انسٹی ٹیوٹ کے مخلص کارکنوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کچھ ارشاد فرمائیں۔ علامہ نے مختصر لیکن عالمانہ تقریر میں بعض شعبہ ہائے علم و تحقیق کی طرف انسٹی ٹیوٹ کے ارکان کو توجہ دلائی اور اس تحریک کی تحسین فرمائی جو مسلمان نوجوانوں میں اسلامی ادبیات، اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کی تحقیق اور نگہداشت کے لیے پیدا ہوئی ہے[1]

اسی ادارے کی جانب سے یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو ٹاؤن ہال لاہور کے باہر باغ میں علامہ اقبال کے اعزاز میں چائے کی دعوت میں علامہ نے ایک تقریر میں کہا۔

"میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ ۳۵ سال اسلام اور موجودہ تہذیب و تمدن کی تطبیق کی تدابیر کے غور و فکر میں بسر کر دیئے ہیں اور اس عرصہ میں یہی میری زندگی کا مقصد وحید رہا ہے میرے حال کے سفر نے مجھے کسی حد تک اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایسے مسئلے کو اس شکل میں پیش نہیں کرتا

---

[1] (اوراق ۱۹۸ - ۱۹۹)

چاہیے کیونکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں کہ اسلام موجودہ تمدن کے مقابلے میں ایک کمزور طاقت ہے میری رائے میں اس کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام کے قریب تر لایا جائے۔ (گفتار اقبال ۱۶۸)

(۱) سفر یورپ

علامہ اقبال نے ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کی انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانان ہند کو اسلام کے معاشی پہلو اور دیگر علوم طبعی کی تحقیق و تدقیق کی طرف متوجہ کیا۔ لاہور کے اہل علم حضرات کے جوش و خروش، نیز استادان باکمال کے فیض تربیت سے فائدہ پانے والے نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو دیکھ کر علامہ اقبال نے ایک ایسے ادارے کی تاسیس کی تحریک کی جس کے پیش نظر تحقیقات اسلامیہ کا عظیم کام ہو۔ یہ جو فلسفہ تمدن اسلام اور طبیعات کے میدان میں کام کرے۔ وہ مسلسل اہل علم و تحقیق اور ذہین طلبا کو اس کام کی طرف متوجہ کرتے رہے حتی کہ اس کام کے لیے میدان ہموار ہو گیا۔ آپ نے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں علمی جماعت کی بنیاد رکھی جو برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ تھا۔

۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء کو ادارہ معارف اسلامیہ کا اجلاس علامہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا۔

"وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اب ہم فقہی جزئیات کی چھان بین کے بجائے ان اہم شعبہ ہائے علم کی طرف متوجہ ہوں جو ہنوز محتاج تحقیق ہیں۔ ریاضیات، عمرانیات، طب اور طبیعات میں مسلمانوں کے شاندار کارنامے ابھی تک دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مستور و پنہاں ہیں۔ جن کے احیاء کی سخت ضرورت ہے۔ ان ذخائر و دفائن کی تلاش کا کام ادارے کو اپنے ذمے لینا چاہیے۔ یورپ کے علماء بیسویں صدی میں جن نظریات و انکشافات کو اپنے لیے نئی چیز سمجھتے ہیں۔ ان پر عرب علماء و فضلا صدیوں پہلے سیر حاصل بحثیں کر چکے ہیں آئن سٹائن کا نظریہ اضافت یورپ کے نزدیک نیا ہو تو ہو لیکن علمائے اسلام کی کتابوں میں صدہا سال پہلے اس کے مبادی زیر بحث آ چکے ہیں۔ برگساں کے فلسفہ امتیازی کو سمجھنے کے لیے ابن خلدون کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔" آپ نے سپنگلر کی شہرہ آفاق کتاب

"زوال مغرب" کے ان ابواب کا حوالہ دیا۔ جن میں عربی تمدن پر بحث و تمحیص کی گئی ہے آپ نے مصنف کے نتائج پر ناقدانہ تبصرہ فرماتے ہوئے خود مسلم علماء و فضلاء کو دعوت دی کہ وہ اپنے تمدن کی گہرائیوں کا مطالعہ کریں اور ان اسرار و ممکنات کو قوم کی تقدیر کے روشن کرنے اور قوم کی قوتِ فکر و عمل کی تربیت کرنے میں صرف کریں تاکہ مسلمان اپنے قابلِ صد فخر و مباہات تمدن کو بیش از پیش خوبی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔[1]

مرزا بلال الدین بار ایٹ لا، اقبال کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں یوں رقم طراز ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کا خیال ہمیشہ رہا۔ وہ مجھ سے فرمایا کرتے کہ اگر حالات مساعدت کرتے تو میں ایک اسلامی دارالاشاعت کی طرح ڈالتا جو اسلامی فلسفہ و تعلیم کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی سعی کرتا وہ کہا کرتے کہ علوم اسلامی کے متعدد اوراق ایسے ہیں جن کی اشاعت اس زمانے کے لیے از بس ضروری ہے۔ انہوں نے کئی مرتبہ ایک ایسی اسلامی لائبریری کی ضرورت کو بھی شدت سے محسوس کیا، جہاں مذہب کے متعلق تمام ضروری کتابیں مہیا ہوں۔ اسی طرح وہ ایک ایسے اسلامی ادارے کے قیام کے بھی خواہشمند تھے۔ جس کے توسط سے علوم اسلامی کا احیاء ہو..... انہوں نے کئی مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ اگر کہیں سے زمین اور اخراجات کا انتظام ہو سکتا تو وہ اپنی دیرینہ آرزو کو عملی شکل دیتے.... آخری دنوں میں انہوں نے اعلحضرت سرکار بہاولپور کی خدمت میں اسی سکیم کے بارے میں ایک خط بھی ارسال کیا۔ ان کے اس تجویز نے خود مجھ پر اس قدر اثر کیا کہ میں نے بہاولپور میں اس کی سرپرستی کا انتظام کرنا چاہا۔ بلکہ بہاولنگر کے گرد و نواح کو اس کام کے لیے اپنے ذہن میں منتخب بھی کر لیا۔ جن دنوں وہ بیمار تھے۔ میں کرنل مقبول حسین قریشی وزیر بہاولپور کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچا اور میں نے انہیں بتلایا کہ میں کرنل موصوف کے توسط سے سرکار بہاولپور کی خدمت میں ان کے ادارے کی سرپرستی کے لیے درخواست کرنے والا ہوں اس خبر سے وہ بہت خوش ہوئے مگر ان کی بے وقت موت نے اس کام کو وہیں روک دیا۔[2]

مرزا جلال الدین بار ایٹ لا، جو اقبال کے قریب ترین دوست میں سے تھے۔ واحد شخص

---

[1] گفتارِ اقبال" ۱۷۱ - ۱۷۲ [2] (ملفوظات ۷۵)

نہ تھے جن سے علامہ نے پنجاب کے مسلمانوں کی علمی ضروریات کے بارے میں بالخصوص اور برصغیر کے مسلمانوں کی علمی ضروریات کے بارے میں بالعموم بات کی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اس مسئلہ کو بہت زیادہ شدت سے محسوس کرنے لگے تھے کہ مسلمانوں میں علمی بیداری کے بغیر ان کی مجموعی اصلاح ممکن نہیں انہوں نے خود اسی مقصد کو اپنے اشعار کے ذریعے سے پورا کیا تھا اور اب جبکہ زندگی کے آخری سالوں میں قدم رکھ رہے تھے، یہ چاہتے تھے کہ ان کے ذہن میں کام کا جو نقشہ رہا ہے اس پر عمارت کھڑی ہو جائے۔ علامہ اسے اپنی زندگی کے اہم کاموں میں شمار کرتے تھے۔ اور ان کے خطوط، گفتگوؤں، تقریروں میں غرض کہ ہر جگہ یہی آرزو نظر آتی ہے کہ جو حقائق وہ دیکھ رہے ہیں۔ انہیں دیکھنے والی کچھ اور نگاہیں بھی پیدا ہو جائیں۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

علامہ اپنے ان خیالات کا تذکرہ زبانی اپنے ان احباب سے بھی کیا کرتے تھے جو ان سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے۔ اور جن کے دل میں ان کے سے دردمند جذبات موجزن تھے۔ وہ ان سے اس سکیم کے عملی پہلوؤں کے بارے میں مشورہ کیا کرتے جس کا ذکر اوپر مرزا جلال الدین صاحب کی زبانی آچکا ہے۔

ایسے ہی افراد میں سے پنجاب کے ایک دردمند مسلمان چوہدری نیاز علی صاحب تھے۔ جنہوں نے پٹھانکوٹ میں ایک وقف دارلاسلام کے نام سے قائم کیا تھا۔ چوہدری صاحب کے علامہ اقبال سے دیرینہ مراسم تھے۔ جس کا اندازہ ان کے نام ان خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو اب الگ کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ چوہدری صاحب یہ چاہتے تھے کہ دارلاسلام میں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ علامہ ان کی رہنمائی کریں اس مقصد کے پیش نظر وہ ۱۹۳۷ء میں علامہ سے آکر ملے۔ ان کے ہمراہ علامہ محمد اسد (مصنف The Road to Mecca) بھی تھے۔ چوہدری صاحب کا خیال تھا کہ بعض علمائے دین کو بھی دارلاسلام آنے کی دعوت دی جائے۔ وہ اس سلسلے میں علامہ سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ علامہ نے کہا کہ دینی مدارس کی تو کوئی کمی نہیں بہتر ہوگا۔ کہ چوہدری صاحب اس وقف سے کوئی اور کام لیں۔

چوہدری صاحب عرض کیا کہ آپ ہی فرمائیے کہ اس وقف سے کیا کام لینا چاہیے حضرت علاّمہ نے فرمایا۔

"میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ بحالتِ موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹ رہے ہیں۔ اور اس کی وجہ وہ سیاسی و اجتماعی مسائل ہیں جنہوں نے موجودہ زمانے میں خاص شکل اختیار کر لی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں"

جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اکابر علماء کا دارالاسلام میں آنا مشکل ہے کیونکہ وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں تو علامہ نے کہا کہ ٹھیک ہے مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوان کی کمی نہیں جن دل میں اسلام کا درد ہے اور جو مسائل حاضرہ سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں ان میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ بھی شامل ہیں ضرورت ان کو جمع کرنے کی ہے۔ پھر حضرت علامہ نے محمد اسد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوہدری نیاز صاحب سے کہا، دیکھیے یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں کیوں نہ یہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔

چوہدری صاحب نے کہا کہ اسد صاحب ضرور اس کام میں ہاتھ بٹائیں گے لیکن اس کام کے لیے تو ایک جماعت کی ضرورت ہے حضرت علامہ نے فرمایا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جہاں تک کچھ اور لوگوں کو جمع کرنے کا تعلق ہے شاید میں کچھ نام تجویز کر سکوں۔ سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے حیدر آباد سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے۔

اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ مودودی صاحب کو دارالاسلام آنے کی دعوت کون دے، طے یہ پایا کہ اس پوری گفتگو کے حوالے سے سید نذیر نیازی صاحب ان کی خدمت میں علامہ کی طرف سے ایک مفصل خط لکھیں اور دریافت کریں کہ وہ دکن سے دارالاسلام آسکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ انہوں نے مودودی صاحب کی خدمت میں مفصل خط لکھا جسکے جواب میں انہوں نے دارالاسلام

آنے پر آمادگی ظاہر کر دی مگر اس کے ساتھ اپنی بعض مجبوریوں اور ذمہ داریوں کا ذکر بھی کیا۔ جن کی تفصیل چوہدری نیاز علی صاحب کو پہنچا دی گئی۔ کچھ دنوں بعد چوہدری صاحب پھر لاہور تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے مودودی صاحب کے دارالاسلام آنے کے لیے جملہ انتظامات کر دیئے ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ آپ نے بہت اچھا کام کیا۔ کام کی ابتداء کر دیجئے جیسے جیسے کام بڑھے گا اور لوگ بھی اس میں شریک ہوتے جائیں گے۔"[1]

دارالاسلام میں آنے کی روداد کا تذکرہ مولانا مودودی نے خود یوں کیا ہے

"علامہ اقبال نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں پنجاب میں چلا آؤں زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی مصلحت کیا ہے البتہ ۱۹۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے خود یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کا رخ کرنا چاہیے۔ اسی زمانے میں چوہدری نیاز علی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے اس مقام کو دیکھ لوں جو انہوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے وقف کیا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کہ شمالی ہند کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کروں جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے۔ اسی خیال سے میں نے شاید اگست کا آخر تھا ۱۹۳۷ء میں پنجاب کا سفر کیا اور جالندھر اور لاہور سے ہوتا ہوا پٹھانکوٹ پہنچا اس سفر میں علامہ اقبال مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ چوہدری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے میں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم کروں جس کا خاکہ میں نے چوہدری صاحب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا۔"[2]

علامہ اقبال نے اس سلسلے میں مولانا مودودی سے تفصیلی گفتگو کی اور دارالاسلام کے قیام میں علامہ کی کوششوں اور توجہات کا خاصا دخل تھا۔ چوہدری نیاز علی خان صاحب نے ایک خط میں اس ادارے کے قیام کے سلسلے میں اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

"کچھ عرصہ بعد انہوں (مولانا مودودی) نے ترجمان القرآن میں وہ سلسلہ مضامین شروع کیا جو بعد میں "مسلمان اور سیاسی کشمکش" کے نام سے موسوم ہو کر کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ

---

[1] (اوراق گم گشتہ ص ۸۶-۸۷)

[2] (سیارہ لاہور مئی ۱۹۶۳ء)

مضامین پڑھ کر میں نے حضرت مولانا صاحب کو لکھا کہ اگر آپ کے یہی خیالات ہیں اور جیسا کہ معلوم ہوتا ہے آپ اس پر کچھ اقدام کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر آپ حیدر آباد میں کیوں بیٹھے ہیں علامہ اقبال کا مشورہ قبول کیجئے اور پنجاب میں چلے آیئے۔ اس کا انہوں نے مجھے جواب دیا۔ کہ ہاں میرا خود بھی یہی خیال ہو رہا ہے کہ میں پنجاب میں یا کسی جگہ بالائی ہندوستان کے کسی مقام پر منتقل ہو جاؤں۔ اس کے ساتھ انہوں نے مجھے یہ بھی لکھا کہ وہ دہلی آ رہے ہیں میں ان کو وہاں آکر ملوں۔ وہ مجھ سے کچھ مشورہ کریں گے۔

چنانچہ ان کے دہلی تشریف لانے کی اطلاع ملنے پر میں اور ایک مشہور مجاہد اسلام مستری محمد صدیق صاحب دہلی پہنچے اور ایک دوست کے مکان پر ٹھہر کر حضرت مولانا سے ملتے رہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ مولانا صاحب خود تشریف لا کر ہمارے پٹھانکوٹ والے ادارے کو دیکھیں چنانچہ وہ تشریف لائے اور چند روز میرے پاس ٹھہرے۔ اس کے بعد میں مولانا صاحب کو لاہور لے آیا اور اپنے ایک قدیم بزرگ مہربان کے ہاں ٹھہر کر حضرت علامہ کے ساتھ مولانا صاحب کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرایا۔ ہم تین دن لاہور ٹھہرے اور تینوں روز مولانا صاحب کی طویل ملاقاتیں حضرت علامہ کے ساتھ ہوتی رہیں۔

لاہور سے واپسی پر حضرت مولانا صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اچھا میں آپ کے ادارہ میں آجاتا ہوں۔ میں نے کہا الحمد للہ [1]

علامہ اقبال نے جہاں ایک طرف حیدر آباد دکن سے مولانا مودودی کو بلوایا۔ وہاں دوسری طرف انہوں نے اس ادارے کے لیے کسی مصری عالم کی خدمات بھی حاصل کرنا چاہیں چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر جامع الازہر کے شیخ علامہ مصطفےٰ المراغی کے نام بھی ایک مکتوب لکھا۔

اس خط کی اہمیت کے پیش نظر اس کا مکمل ترجمہ اور جواب درج ہے اصل خط عربی میں لکھا گیا تھا۔

۵ راگست ۱۹۳۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

---

[1] (اوراق ص ۹۰ - ۹۱)

از ڈاکٹر محمد اقبال ۔ بخدمت جناب صاحب الفضیلۃ علامہ شیخ مصطفیٰ المراغی شیخ الازہر الشریف ادام اللہ مجدہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بلاشبہ ازہر شریف کو عالم اسلامی میں بھرپور اہمیت حاصل ہے وہ ایک منفرد علمی مرکز ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر تشنہ کام اس کی طرف لپکتا ہے تاکہ اس کے سمندروں سے چلّو بھر سکے اور اس کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں سے ہونٹ تر کر سکے۔ اور جب بھی کوئی علمی یا دینی ضرورت پیش آتی ہے انگلیاں اسی کی طرف اٹھتی ہیں۔ ہمیں بھی آپ سے ایک ضرورت درپیش ہے۔

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کی ایک بستی میں ایک اہم ادارے کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا۔ اور انشاء اللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہو گی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو جو جدید علوم سے بہرہ ور ہوں کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں۔ جنہیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہوں۔ جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیت پائی جاتی ہو۔ اور جو اپنا وقت دین اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں۔ اور ہم ان لوگوں کے لیے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شور و شغب سے دور ایک دارالاقامت بنا دیں جو ان کے لیے ایک اسلامی علمی مرکز کا کام دے اور اس میں ہم ان کے لیے ایک لائبریری ترتیب دیں۔ جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں جن کی ضرورت پیش آسکتی ہے مزید برآں ان کے لیے ایک کامل اور صالح گائیڈ کا تقرر کیا جائے جسے قرآن حکیم پر بصیرت تامہ حاصل ہو اور جو دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی باخبر ہو تاکہ وہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ و حکمت اور اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکر اسلامی کی تجدید کے سلسلے میں انہیں مدد دے سکے۔ تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور اپنے قلم سے اسلامی تمدن کے احیاء کے لیے کوشاں ہو سکیں

آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیت واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ آپ ازراہِ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو جامع ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں تاکہ وہ اس کام میں ہمیں مدد دے سکے۔ لازم

ہے کہ یہ شخص علوم شرعیہ نیز تاریخ تمدن اسلامی میں کامل دستگاہ رکھتا ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ اسے انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہو۔

علاوہ ازیں مجھے مصری وفد کے اراکین سے، جنہوں نے پچھلے دنوں ہمیں اپنی زیارت سے مشرف فرمایا تھا، معلوم ہوا تھا کہ جامع ازہر اپنے خرچ پر ہندوستان میں مختلف مبلغین مختلف مقامات پر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مرکز اسلامی کی بنا جیسا کہ میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ مقصد تبلیغ کے لیے مختلف مبلغین بھیجنے سے زیادہ اولےٰ و اقرب ہے۔ مجھے توقع ہے کہ دین حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف و اکناف میں پھیلے گا اور اگر آپ میرے ساتھ اس لائحہ عمل پر اتفاق کریں تو آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔ اگر آپ مجھے اپنے خیال سے جلد از جلد مطلع فرمائیں۔

بصد احترام والسلام

مخلص محمد اقبال

اس خط کے جواب میں علامہ المراغی نے ذیل کا مکتوب حضرت علامہ کی خدمت میں روانہ کیا۔

دفتر شیخ الجامعہ الازہر

استاد کامل جناب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا مکتوب مورخہ ۵/اگست ۱۹۳۷ء میری نظر سے گذرا۔ اور مجھے آپ کے اس عزم پر بے حد مسرت ہوئی جو آپ نے ایک ایسے ادارے کی داغ بیل ڈالنے کے سلسلے میں کیا ہے جس میں جدید طرز کے تہذیب یافتہ لوگوں کو ان لوگوں کے ساتھ یکجا کیا جا سکے۔ جنہیں دینی علوم میں دستگاہ حاصل ہو۔ آپ نے مجھ سے مطالبہ فرمایا ہے کہ ایک ایسے عالم کو ازہر کے خرچ پر روانہ کیا جائے جو علوم شرعیہ نیز تاریخ تمدن اسلامی میں مہارت رکھتا ہو۔ اور انگریزی زبان پر بھی قادر ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ وضاحت کرنی پڑتی ہے۔ کہ ہمارے ہاں علمائے ازہر میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتا ہو۔ کیوں کہ انگریزی ازہر میں صرف گذشتہ

سال سے کالجوں کے طلبا کے لیے شامل کی گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں آپ کی خواہش کی تکمیل اس کھیپ کی واپسی سے قبل نہیں کر سکوں گا۔ جو گذشتہ سال انگلستان بھیجی گئی ہے۔ جو کچھ میرے بس میں ہے اس کے لیے آپ مجھے یہاں تیار پائیں گے۔ اور آپ کے تمام عزائم میں میری طرف سے آپ کو غایت درجے کا خلوص حاصل رہے گا۔

مخلصانہ آداب کے ساتھ

محمد مصطفےٰ المراغی[1]

۲۱، اگست ۱۹۳۷ء

نوٹ: چوہدری نیاز علی خان (وفات ۲۴ فروری ۱۹۷۶ء) ایک دردمند اور مخلص مسلمان تھے۔ ۱۹۳۵ء میں محکمہ نہر سے اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو خدمت دین کے لیے انہوں نے موضع جمال پور نزد پٹھان کوٹ میں ایک ادارہ قائم کرنے کی سکیم بنائی۔ چوہدری نیاز علی اپنے ایک مضمون "دارالاسلام کی حقیقت" میں لکھتے ہیں۔ "مدت سے میرا خیال تھا کہ ملازمت سے فارغ ہو کر اپنے بقایا ایام زندگی اور محدود وسائل کو خدمت دین میں صرف کروں گا۔ چنانچہ علامہ سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے سب حالات سننے کے بعد ایک ایسی سکیم کا ذکر کیا۔ جس کا انہیں عرصے سے خود خیال تھا۔ یعنی کسی پرسکون مقام پر ایک ایسی مختصر سی بستی کی بنیاد رکھی جائے جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔ اور وہاں بہترین دل و دماغ کے نوجوانوں کو ایسی تربیت دی جائے جس سے ان میں مسلمانان عالم کی صحیح رہنمائی کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ حضرت ممدوح کے اس تخیل کو پیش نظر رکھ کر میں نے مارچ ۱۹۳۶ء میں ایک قطعہ اراضی ساٹھ ایکڑ کا تعلیم قرآن کے لیے وقف کر دیا۔ اور اس میں ضروری مکانات یعنی مسجد، مکتب، کتب خانہ دارالاقامۃ، رہائشی مکانات، غلہ، چاہ وغیرہ کی تعمیر شروع کر دی۔۔۔۔ اس دوران میں مجھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ اس ادارے کے متعلق خط و کتابت کا موقع ملا اور حضرت

---

[1] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی، ص ۲۸۶-۲۸۸

.... علامہ نے اپنے خطوط، اپنے دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں اور مختلف خطبات میں کئی موضوعات کی جانب توجہ دلائی۔ علامہ کا ذہن دنیا بھر کے موضوعات، تصورات اور نظریات کی جانب مبذول ہوتا تھا۔ ان کے مطالعے کی وسعت، ان کے ذہن کا انتہائی حساس تعامل سب مل کر انہیں جہاں اشعار کے میدان میں جولانیاں دکھانے کا موقع دیتیں۔ وہاں وہ معیشت جیسے بظاہر خشک موضوع سے لے کر تاریخ، فلسفہ، تہذیب و تمدن اور معاشرت کے الجھے ہوئے مسائل تک ہر مسئلہ پر اظہار خیال کرتے، مختلف سوالات سوچتے اور پھر وہ چاہتے کہ وہ خود ان موضوعات پر کام کریں یا کوئی نوجوان ان پر خاطر خواہ کام کرے۔ علامہ نے آج سے نصف صدی قبل جن مسائل کے بارے میں کام کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ان میں سے کئی آج بھی تشنۂ تکمیل ہیں، اس سے جہاں ہماری ذہنی تہی مائیگی کا احساس ہوتا ہے وہاں علامہ کے فکر کی ہمہ گیری وسعت کا ادراک بھی ہوتا ہے آیئے ہم ان موضوعات کو ایک نظر دیکھیں۔ کیا عجب کہ ان کا ترتیب وار بیان کسی حساس اور متجسس ذہن میں تحقیق کے میدان میں سبقت کرنے کا سبب بن جائے۔ اقبال کو محض زبانی خراج عقیدت پیش کرنے کی بجائے یہ کہیں بہتر ہوگا۔ کہ ان کے مجوزہ موضوعات کی جانب مناسب دھیان دیا جائے۔ اور تحقیقی مزاج رکھنے والے افراد کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ذمے لے لے۔

(۱) برصغیر میں مسئلہ جہاد کی تاریخ - سرسید، مولوی چراغ علی اور غلام احمد قادیانی کے خیالات کا جائزہ۔[1]

(۲) ٹیپو سلطانؒ کی تاریخ کے متعلق قلمی مسودے کی ترتیب

علامہ کی نظر جوہر شناس بھی سید صاحب پر جا پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حیدر آباد سے یہاں کا موقع محل دیکھنے آئے اور حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تین صحبتوں میں ان سے مفصل گفتگو کرنے کے بعد اس ادارے میں جس کا نام انہوں نے دارالاسلام تجویز کیا نقل مکانی کرنے کا فیصلہ کیا۔

---

[1] صحیفہ اقبال نمبر حصہ اوّل، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲۹ - ۲۳۰

(۳) حافظ شیرازی کے دور میں عالمِ اسلام کی سیاسی اور معاشرتی حالت کا جائزہ

(۴) عراقی کے "لمحات" اور "وقت" کا مطالعہ

(۵) حارث محاسبی کا مطالعہ جنہوں نے یہودی اور عیسائی صوفیاء پر گہرے اثرات ڈالے،

(۶) وسط ایشیاء اور عرب میں اسلام کے ظہور سے پہلے اور بعد کے دور پر بدھ مت کے اثرات،

(۷) فلسفہ کے میدان میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کا جائزہ بالخصوص ان میدانوں میں

(ا) منطق کے میدان میں ۔ ارسطو کی منطق پر تنقید

(ب) زمان و مکاں کے تصورات

(ج) حساب کا میدان

(۸) مسلم فلسفہ کے ارتقاء میں برصغیر کے مسلمانوں کا کردار۔ تفصیلی مطالعہ

(۹) امام (خلیفہ) کی دستوری حیثیت ابن قیمؒ کے طرق الحکمیہ اور اعلام الموقعین کا مطالعہ

(۱۰) حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خصوصی مطالعہ بحوالہ ارتفاقات

(۱۱) قرآن حکیم کی روشنی میں اجتماعی دفاع کے تصور کا مطالعہ

(۱۲) مندرجہ ذیل موضوعات پر تفصیلی مطالعے

(ا) اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ

(ب) تصوف

(ج) فقہ

(د) اسلام کے تہذیبی اور فلسفیانہ پہلو کا مطالعہ

(۱۳) نبوت کا سامی تصور

(۱۴) مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تاریخ

(۱۵) مسلمانوں کے اخلاقی اور سیاسی نظریات کا مطالعہ

(۱۶) شاہ محمد غوث گوالیاری کا مطالعہ

(۱۷) ہادی سبزواری اور ملا صدرہ کا مطالعہ

(۱۸) جاوید نامہ کا مصور ایڈیشن

(۱۹) فخرالدین رازی کا مطالعہ

(۲۰) خوشحال خان خٹک اور سنائی کا مطالعہ

(۲۱) سکھوں سے قبل مسلمان دور کے پنجاب کی تاریخ

(۲۲) مسلم ہند کی تاریخ مابین ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء

(۲۳) تقابلِ ادیان

(۲۴) اسلام میں غلامی کا مسئلہ

(۲۵) جدید یورپ پر مسلم تہذیب کے اثرات

(۲۶) امیر عبدالقادر الجزائری کی تاریخ

(۲۷) جہاد کی مفصل تاریخ

(۲۸) مختلف سیاسی نظریات (سنّی، شیعہ اور خارجی)

(۲۹) شیخ احمد رفاعیؒ کے سوانح

(۳۰) وسطی اور مغربی ایشیاء کے مسلمانوں کی دسویں صدی کے مابعد کی علمی تاریخ

(۳۱) مسئلہ زمان کے اخلاقی مضمرات

(۳۲) حیاتِ ابدی کا تصور

(۳۳) نسل کے تصور کی تاریخ اور اس کے اثرات

(۳۴) قرآن پاک اور احادیث کی روشنی میں معاشی اور جمہوری اداروں کا خاکہ

(۳۵) ابن عربی، عراقی اور مجدّد الف ثانیؒ

(۳۶) یورپ میں انسانیت پرستی کے تصوّر کا ارتقاء (مسلم اثرات کے نتائج کے طور پر)

(۳۷) مسلم سپین کی علمی زندگی اور یورپ پر اس کے اثرات

(۳۸) آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت

(۳۹) میکنگرٹ ؒ

(۴۰) مذہبی تجربے کا مطالعہ۔ پہلے دو خطبات مدارس کی روشنی میں (اس کو وسیع کر دیا جائے)

(۴۱) وجودی مفکرین، خدا پرست کرکے گارڈ اور[۲] عیسائیت۔ مارٹن بوبر[۳]

(۴۲) جدید عیسائی، مذہبی مفکرین مثلاً ٹلچ[۴]، نیبر[۵]، برڈیوی[۶]، بارتھ[۷] وغیرہ

(۴۳) وائٹ ہیڈ[۸] اور سپنگلر[۹] کے خیالات کا تنقیدی جائزہ

1. McTaggart
2. Kiergayaard
3. Martin Buber
4. Tillich
5. Niebuhr
6. Berdierey
7. Basth
8. Whitehead
9. Spengler

علامہ اس سلسلے میں ہمیشہ کوشاں رہے کہ وہ اپنا دردِ دل نئی نسل تک منتقل کر دیں۔ جہاں وہ نوجوانوں کی انجمنوں کی سرپرستی کرتے اور ان کو مشورے سے نوازتے وہاں وہ ان تک اپنے خیالات پہنچانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ وہ پرانی نسل سے شاکی تھے کہ انہوں نے نئی نسل کی تربیت کا کام نہیں کیا اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ پرانی نسل جس کا قبلہ و کعبہ محض نوکریوں کا حصول تھا اس ذمے داری کو پورا کرنے کی نااہل تھی۔ ان کا حال تو بقول اکبر الہ آبادی یہ رہا تھا کہ

ص شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

علامہ اس نسل کی مجبوریوں اور صلاحیتوں کے فقدان سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس دور کی عام روش کو دیکھا جائے تو اسے اقبال کی حقیقت پسندی قرار دیا جاسکتا ہے تاہم آئندہ نسل کے بارے میں وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں ان نوجوان سینوں میں اسلام کی گہری تڑپ نظر آتی تھی اور وہ اسے فزوں تر کرنا چاہتے تھے۔ علامہ کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ مقصد رہا کہ وہ نوجوانوں تک اپنا پیغام پہنچا کر انہیں اپنے فکر کا وارث بنا دیں۔ ایک خاص دور میں وہ اپنے دوست مرزا جلال الدین کی کوٹھی پر دس بارہ مخصوص طلبہ کو جو علامہ کے کلام کے مداح تھے، جمع کر کے ان کے سامنے اپنے اس کلام کی تشریح کرتے جو انہوں نے انجمن حمایتِ اسلام وغیرہ کے اجلاسوں میں پڑھا تھا اور جو کتابچوں کی صورت میں شائع کیا جا چکا تھا۔ اس محفل خاص کے شریک ہونے والوں میں مشہور مصنف ایم اسلم بھی ہوتے تھے۔ علامہ عام طور پر نوجوانوں کو شعر کی بجائے نثر لکھنے کی طرف رغبت دلاتے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ابتداء میں ایم اسلم شعر کہا کرتے تھے۔ لیکن علامہ نے انہیں مشورہ دیا کہ "اسلم شعر مت کہا کرو نثر لکھا کرو"۔ اس ایک جملے نے اسلم صاحب کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے شاعری چھوڑ دی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا لکھا جائے۔ انہوں نے علامہ سے اپنی الجھن کا ذکر کیا کہ نثر میں ناول اور افسانے ہی لکھے جاسکتے ہیں اور یہ اکثر بے مقصد ہوتے ہیں اس کا کیا کیا جائے؟ اقبال نے فرمایا "تم افسانہ لکھو یا ناول وہ بے مقصد نہیں ہونا چاہیے"۔ اسی طرح ایک روز فرمایا "جو کچھ

لکھو قومی نقطۂ نظر سے لکھو" سیّد نذیر نیازی صاحب علامہ سے اپنی ملاقات کے دوران گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ایک بار مجھ سے فرمایا کوئی افسانہ بیان کروں. میں نے سوچا الف لیلہ میں بغداد کے حجام کا جو پر لطف قصہ مزے لے لے کر بیان کیا گیا ہے. شاید حضرت علاّمہ اسے پسند فرمائیں. شاید یونہی ان کی طبیعت شگفتہ ہو جائے. میں نے یہ قصہ بیان کیا تو حضرت علامہ بہت محظوظ ہوئے. مگر پھر قصہ ختم ہوا تو الف لیلہٰ کے انداز داستاں گوئی اور اس سے مغربی ادب نے جو اثر قبول کیا اس کا ذکر آ گیا. مسلمانوں کے ماضی اور ان کی تہذیب و معاشرت کی باتیں شروع ہو گئیں. حضرت علامہ نے فرمایا" مسلمانوں کی زندگی کیسی شگفتہ تھی. انہوں نے حتی الوسع اسے ہر آلائش سے پاک رکھا. وہ اس سے لطف اٹھانا اور اس میں حسن و جمال، طاقت اور قوت کے جو لامتناہی امکانات موجود ہیں ان کی قدر کرنا خوب جانتے تھے.

دفعتاً ان کا ذہن عالم اسلام کی طرف منتقل ہو گیا. فرمایا" مسلمانوں کا زوال کیا حسرت ناک ہے" اور پھر جیسے ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئے.

میں بھی خاموش تھا. پھر اس خیال سے کہ حضرت علامہ سلسلہ گفتگو نہ چھیڑ دیں اور یہ گفتگو کوئی زیادہ سنجیدہ شکل نہ اختیار کر لے، جب منصور کے زمانہ طالب علمی کا ذکر کرنے لگا. جامعۂ قرطبہ میں کبھی تین طالب علم جمع تھے. انہوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں ایک دوسرے کی امداد کا وعدہ کیا تھا. یہ وعدہ جس طرح پورا ہوا اور پھر منصور نے جو عروج حاصل کیا اس کے تذکرے سے حضرت علامہ کی طبیعت میں کچھ شگفتگی سی پیدا ہو گئی. فرمایا کچھ اور واقعات بیان کرو:

پھر ارشاد ہوا مسلمانوں میں کیا ایسا کوئی افسانہ نگار نہیں جو افسانوں افسانوں ہی میں پتے کی بات کہہ جائے. شرر کے افسانوں سے بے شک تاریخ میں دلچسپی پیدا ہو گئی، لیکن ضرورت ہے پتے کی بات کہنے کی"

میاں اسلم صاحب کے والد کو اس سے اختلاف تھا لیکن علاّمہ نے کہا" میں نے اسلم کو ہدایت کر دی ہے کہ جو کچھ لکھے کسی مقصد کے تحت لکھے مقصد کے تحت لکھنا برا نہیں"

لہ اقبال کے حضور میں ۲۴۱ - ۲۴۲

ایم اسلم نے ایک مرتبہ مشہور امریکی ادیب مارک ٹوین ( ) کے
ایک انشائیے کا آزاد ترجمہ مرزا
مینڈکی کے نام سے کیا۔ چونکہ اس زمانے میں کانگرس کا زور تھا اس لیے علامہ نے کہا "اسلم!
جس انداز سے تم نے مرزا مینڈکی لکھا ہے اسی رنگ میں کانگریس کے متعلق لکھو" اس ضمن میں
انہوں نے کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ علامہ اقبال کی تعمیل حکم میں ایم اسلم صاحب نے مزاحیہ
انداز میں کانگریس کے خلاف کئی مضامین لکھے جن میں ہندو نیتاؤں کی کافرانہ ذہنیت اور کہیں کہیں
"ستر یمتی کانگریس بائی" کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ پھر ان مضامین کو انہوں نے ایک مجموعے کی صورت
میں "مرزائی" کے نام سے شائع کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ لیکن ہندو اس پوسٹ مارٹم کی تاب نہ
لاسکے اور ہندو پریس نے اس کتاب اور مصنف کے خلاف طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا۔ مشہور ہندو
اخباروں ٹریبیون (لاہور) اور امرت بازار پتریکا (کلکتہ) نے بھی خوب زہر اگلا۔ اسلم صاحب
اور ان کے والد ماجد میاں نظام الدین مرحوم پریشان ہوئے تو علامہ نے میاں صاحب کو تسلی دی
اور کہا "میاں صاحب فکر نہ کریں انشاء اللہ اسلم کا بال تک بیکا نہ ہو گا"، وہی ہوا حکومت پنجاب
کے سیکرٹری نے یہ کہہ کر کہ یہ کتاب مزاحیہ انداز میں لکھی گئی ہے اس لیے کسی کارروائی کی ضرورت نہیں
یہ مسئلہ طے کر دیا۔ اور علامہ کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ "اسلم کا بال تک بیکا نہ ہو گا"۔

"انقلاب اسلام" علامہ نے اب اسلم صاحب سے ایک اور اہم کام لیا وہ یہ کہ انہیں ایک
آسٹریلین نومسلم فیلکس ویلائی ( ) کی کتاب
ترجمہ کرنے کے لئے دی۔ ان دنوں ایم
اسلم کوہ مری جا رہے تھے وہ جاتے ہوئے یہ کتاب ہمراہ لے گئے اور اس کا ترجمہ بڑی محنت
سے کیا۔ اس کا عنوان "انقلاب اسلام" رکھا۔ ڈھائی تین مہینے بعد جب اسلم صاحب مری سے
واپس آئے اور مسودہ لے کر حاضر ہوئے تو علامہ نے داد دی اور کہا "بڑی ہمت کی تم نے" اور
مسودہ رکھ لیا۔ چند دن بعد جب اسلم صاحب پھر ان کی خدمت میں گئے۔ تو علامہ نے بہت تحسین و
آفرین کی اور اسلم صاحب کی درخواست پر حوصلہ افزائی کے لیے پانچ سات سطریں بطور تبصرہ لکھ
دیں۔ مسودے پر کئی ایک جگہ اصلاح بھی فرمائی اس سے علامہ کے احساسِ ذمہ داری اور علوم اسلامیہ

سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے ایک مقام پر مسٹر گاندھی کا بھی ذکر تھا. حضرت علامہ نے مسودے کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھ دیا. "گاندھی بین الاقوامی مساوات کا حامی نہیں. فیلکس ویلاٹی کا خیال بالکل غلط ہے اور ہندوستان کی سیاست سے اس کی بے خبری کی دلیل ہے اسلم صاحب اس کتاب کی اشاعت کی فکر میں تھے. کہ ایک روز ایک ملنے والے جو بڑے علم دوست سمجھے جاتے تھے آ گئے اور دو ایک روز میں واپس کرنے کے وعدے پر مسودہ مستعار لے گئے لیکن پھر نہ وہ لوٹ کر آئے نہ مسودہ بھیجا. اسلم صاحب نے اس واقعہ کا ذکر علامہ سے بھی کیا. اس واقعہ کے تقریباً ۱۲ سال بعد گم گشتہ مسودہ مل گیا. لیکن علامہ اقبال کا تعارفی تحریر والا صفحہ گم ہو چکا تھا. یہ کتاب اب چھپ چکی ہے اور نایاب ہے. اس کے آغاز میں اسلم صاحب کے مسودے کے ایک صفحہ کا عکس بھی شامل ہے. جس پر علامہ اقبال کے ہاتھوں سے اصلاح کا نمونہ بھی ہے.

اگر اصل مسودے پر علامہ اقبال کی اصلاحات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے علامہ کے افکار کے مطالعے میں مدد ملے گی. اس کتاب کے موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کو مسلمانوں کی بیداری کا کس قدر خیال تھا اور وہ اپنی ملت کے نوجوانوں کو ایسے علمی کاموں کے لیے ہمیشہ آمادہ کرتے رہتے تھے جو بعد میں ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بن سکیں.

مشہور ماہر تعلیم اور محقق ڈاکٹر محمد شجاع ناموس جو متعدد کتابوں کے مصنف ہیں علامہ اقبال کے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے. وہ لکھتے ہیں "میں نے ایم ایس سی کا امتحان ۱۹۲۱ء میں پاس کر لیا. پھر حاضر ہوا تو فرمایا دیکھو جدید دور میں ہمیں فارسی عربی کے دیوانوں کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہیں. مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اقوام عالم کے سامنے وضاحت کے ساتھ ان علوم وفنون کو نمایاں کریں جو ان کے بزرگان نے اپنے سنہری عہد میں تحقیق وتخلیق کیے تھے. اور جن کی بناء پر آج کی دنیا اس عروج تک پہنچ سکی. یورپ تو تجاویز بنا کر صرف کثیر سے اسلام کی عظمت کو پس پشت ڈال رہا ہے اور اپنے علماء کے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے اگرچہ عہد متوسط کے یورپ کے تمام علوم وفنون کے ماخذ اسلامی علوم ہیں اور اکثر اوقات تو وہ عربی کتابوں کے تراجم ہیں جو یورپ کے عالموں نے اپنے نام سے شائع کر دیئے.

تم اس تحقیق کی تکمیل کرو اور میں سمجھتا ہوں تم نے انگریزی زبان، فزکس، کیمسٹری، بالوٹنی،

زوآلوجی، ریاضی تو سبقاً سبقاً پڑھ لی مگر جب تک تم فارسی عربی پر کامل عبور حاصل نہیں کروگے تم اس اہم اسلامی فریضہ کو ادا نہیں کرسکو گے اس لیے لازم ہے کہ تم فارسی اور عربی پڑھو اور اتنی پڑھو کہ تم براہِ راست مسلمان علماء کی ان کتابوں سے بلا تکلف استفادہ کرسکو جو عربی میں لکھی گئی ہیں۔

علامہ اقبال نے میرے علمی کیریئر کو خود تجویز کیا اور اس کو عملی جامہ پہنایا اور ہر قدم پر میری رہبری کرتے رہے۔ علی گڑھ سے فارسی کا ایم اے کرنے کا حکم دیا تو اپنے ہاتھ سے وائس چانسلر اور جناب پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن کو خط لکھ کر میرے ہاتھ بھجوایا اس کے بعد میں نے فارسی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔

اب عربی کی باری آئی تو فرمایا" او واہی کاکا ایہہ تے تینوں پڑھنی ای پوے گی۔ عربی وچ ای تے سارے اسلامی علوم لکھے ہوئے نیں توں ریسرچ کی کریں گا جے تینوں عربی تے کامل عبور ناں ہووے گا پڑھ شاباش میں جانڑناں تو کر لئیں گا بس توں شروع کردے" اپنے ہاتھ سے عربی کے ماہر فاضلوں کو رقعہ جات لکھ کر دیئے اس کو عربی پڑھاؤ۔ ان کا خیال ہوگا کہ یہ سائنس کا آدمی ہے بھاگ جائے گا۔ میں نے عربی ایم اے حکم کے مطابق پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ عربی فاضل کا امتحان پاس کیا پھر ایم او ایل کی ڈگری ملی۔ استاد گرامی کے حکم کے مطابق پشتو کا امتحان بھی پاس کیا۔ پہلے میں نے کچھ سر پھیرا پشتو کون سی کلاسیکی زبان ہے۔ اور اس محنت سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔

استاد کچھ گرم ہو گئے، میں ڈر گیا اور بہت اچھا کہہ کر سر تسلیم خم کر دیا۔ حکم استاد سے فرار کفر کا اظہار ہے میں نے پشتو زبان کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اس موقعہ پر انہوں نے کہا تھا کہ دنیا میں مسلمانوں کی پانچ عظیم زبانیں ہیں۔ عربی اسلام کی مذہبی زبان ہے اور فارسی ثقافتی، ترکش اسلام کی تلوار ہے اور اردو سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کا درجہ رکھتی ہے اور پشتو اور پشتون عوام کی تاریخ ثقافت اور زبان کا مطالعہ کیے بغیر تم ان کی تعلیم و تحقیق پر کچھ نہیں لکھ سکتے۔

علامہ اقبال کا کرم صرف یہ نہیں کہ انہوں نے مجھے چند الفاظ پڑھائے یا پی ایچ ڈی کے

مقالے کی تیاری میں بہ نفس نفیس میرے ساتھ کام کرتے یا گھنٹوں میری رہبری کرتے رہے بلکہ یہ کہ میرے سینے میں سوز و ساز کا ایک بیج لگایا اس میں کونپل نکلی تو اس کی آبیاری کی کبھی اس کو زبان مبارک کے آبِ کوثر سے سینچا، تو کے گرم تھپیڑوں کا مزا چکھنے کے لیے کبھی اسے دھوپ میں کھڑا کر دیا۔[1]

علامہ نہ صرف یہ کہ خود جہاں کہیں جوہر قابل دیکھتے اس کی حوصلہ افزائی اور تربیت کرتے بلکہ دوسرے اصحاب کو بھی اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ عبدالماجد دریا آبادیؒ کے نام ایک خط میں علی گڑھ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"میں بھی ایک ہفتے کے لیے علی گڑھ گیا تھا۔ وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہو گی۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں۔ اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو میں کیا کریں تو نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف (اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کے لیے تڑپ ہے۔ لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔

(بنام مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ اقبال نامہ حصہ اوّل ص ۲۳۹۔ ۵ جنوری ۱۹۲۹ء)

مستقبل کے بارے میں اقبال کی سوچ، مغرب کی غلامی کے گہرے اثرات کا ازالہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت کا احساس انہیں اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ جہاں کہیں ایسے افراد کو دیکھتے تھے جو جدید علوم کے ساتھ ساتھ اسلام کا گہرا مطالعہ بھی رکھتے ہوں، وہ انہیں نوجوانوں کی تربیت کے اہم کام پر لگانا چاہتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا جو ایک طرف مغرب کے فکری سرمائے پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تو دوسری طرف خود اپنے یہاں کے سرمایۂ علم سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ علی گڑھ اس وقت مسلمانانِ برصغیر کا عصبی مرکز —— Nerve centre —— تھا۔ علامہ چاہتے تھے کہ یہاں کے طالبعلموں میں جو برصغیر

---

[1] اوراق گم گشتہ ص ۳۷۹-۳۸۱

کے ہر علاقے سے آئے ہوئے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں مستقبل کی باگ دوڑ ہو گی، اسلام کا جذبہ بیدار ہو اور وہ عالمِ اسلام میں بالعموم اور برصغیر میں بالخصوص اسلام کے احیاء کے لیے کام کریں۔

علامہ کے پاس حاضر ہونے والوں میں ایک اچھی خاصی تعداد نوجوانوں کی ہوتی تھی۔ جو علامہ کے افکار کو دل کے گوشوں میں جگہ دیتے اور ان سے مختلف مسائل میں اپنی تشفی چاہتے تھے۔ ایسے ہی نوجوانوں میں پروفیسر حمید احمد خان صاحب کا شمار ہوتا تھا۔ وہ بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ انہیں اسلام کی تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی۔ اور ان کا ایک کارنامہ تاریخ میں کبھی نہ بھلایا جا سکے گا۔ وہ یہ کہ ان کے دور میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور ایم اے تک کے امتحانات کے لیے اردو کو استعمال کیا جانے لگا۔ علامہ نے انہیں اسلامیہ کالج میں لیکچرار رکھوانے کے لیے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کے نام ایک سفارشی مکتوب لکھا جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ مسلم اساتذہ سے کس نوع کی توقعات رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ نجی نوع کا خط خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ لکھتے ہیں۔

"یہ خط ایم حمید احمد خان کے لیے لکھ رہا ہوں جو اسلامیہ کالج میں لیکچرار کی اسامی کے لیے درخواست دے رہے ہیں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی اور مجھے ان کی علمی کارگزاریاں جانچنے کا موقع ملا۔ میں کالج کمیٹی کو ان کے تقرر کا مشورہ دوں گا۔ اس وقت وہ حکومت کے شعبۂ حسابات میں ملازم ہیں۔ جہاں تک میں نے دیکھا انہیں ادب اور فلسفہ سے بہت شغف ہے۔ بلاشبہ وہ انگریزی ادب اور فلسفہ کے بہت اچھے اور کامیاب لیکچرار ثابت ہوں گے۔ علاوہ ازیں آج کل کے اکثر مسلم نوجوانوں کے برعکس وہ اسلام کی ثقافتی (کلچرل) تاریخ کے بارے میں بہت پرجوش ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلم نوجوانوں کے ساتھ ان کا رابطہ ان نوجوانوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو گا۔ میں زیادہ سے زیادہ مسلم اساتذہ کو ان جیسا دیکھنا چاہتا ہوں۔"[1]

علامہ نوجوانوں کی دلدہی کا کوئی موقع نہ جانے دیتے۔ وہ نوجوانوں کو اسلام کے بارے میں تحقیقی کاموں میں مصروف دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتے اور ان کی مناسب دلجوئی کرتے۔ پروفیسر محمد عبدالغنی نے جو ناگپور میں مورس کالج میں پڑھاتے تھے۔ بعض تاریخی شخصیات پر

---

[1] ہاشمی ۱۸۵

مختصر کتابیں لکھیں اور علامہ کو بھجوائیں، جواباً علامہ نے انہیں لکھا۔

"ازحد ممنون ہوں کہ آپ نے ازراہِ عنایت ہمایوں اور بابر کے بارے میں اپنی تصانیف کے نسخے ارسال کیے۔ یہ کتابیں بہت دلچسپ ہیں اور آپ نے جس سلسلہ کو لکھنے کا آغاز کیا ہے بلاشبہ اس سے ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہو گی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے نوجوان عالم تندہی کے ساتھ تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں" [1]

علامہ کا اضطراب ممالکِ اسلامیہ اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے متعلق حد درجہ بڑھا ہوا تھا۔ مغرب کے غلبے نے اسلامی ممالک میں ایسے افراد بہ کثرت پیدا کر دیئے تھے جو جدید علوم سے تو پوری طرح آگاہ تھے لیکن جنہیں اسلام کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں، اقبال اس صورت حال کو انتہائی تشویشناک سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کبھی انہیں ایسا منظر نظر آتا تو مستقبل کے اندیشوں کے پیش نظر تڑپ اٹھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ جب اسلامی ممالک آزاد ہوں گے تو حکومت کی باگ دوڑ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی، جو مغربی علوم سے اچھی طرح آگاہ ہیں، ان لوگوں کے ہاتھ میں امتِ مسلمہ کی رہنمائی کی باگ دوڑ ہونے کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان کا اسلام سے بے بہرہ ہونا پوری قوم کے لیے وبالِ جان بن جائے۔

علامہ فکر مند تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلام کی تعلیمات کے بارے میں معلومات کی کمی کی وجہ سے نوجوان نسل کوئی ایسا راستہ نہ اختیار کر لے۔ کہ خود تو ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے ہی اپنے ساتھ پوری قوم کو بھی لے ڈوبے۔ چنانچہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گمراہ کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرے۔ حال ہی میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی

---

[1] رفیع الدین ہاشمی ص ۱۹۲

خوب بولتا تھا مگر اسلام سے قطعاً بے خبر تھا۔ اس قسم کے واقعات مشاہدہ میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔[1]

علامہ اس صورت حال سے خاصے مضطرب تھے کہ نوجوانوں میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو مسلمان ہونے کے باوجود اسلام، مسلمانوں اور عالم اسلام سے بس واجبی سی دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی معلومات کا دائرہ انتہائی تنگ تھا۔ برصغیر میں تو علماء کی کوششوں اور صدیوں کی علمی روایات کی وجہ سے پھر حالات کسی حد تک غنیمت تھے لیکن مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا حال اس لحاظ سے اچھا نہ تھا۔ وہاں کے نوجوانوں میں مغرب کی مرعوبیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ برصغیر میں انگریزوں نے سوا سو سال کے عرصے میں اتنے اثرات نہ چھوڑے تھے جتنے کہ عرب دنیا میں مختصر عرصے میں مرتب ہو گئے تھے۔ یہ صورت اس وجہ سے بھی تشویشناک تھی کہ عرب مسلمان ایک بہت بڑے علمی ورثے کے وارث اور ثقافت اور تمدن کے میدان میں ایک انتہائی ترقی یافتہ معاشرے کے روایات کے امین تھے۔ ان کی جانب سے تہی دستی اور بے مائیگی کا یوں اظہار اور مغرب کے در پر ناصیہ فرسائی انتہائی اندوہناک تھی۔ شاید اسی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے یہ کہا تھا۔

ے وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

اس صورت حال کے ازالے کے لیے علامہ نے جہاں ایک طرف شعر کی زبان میں ملت اسلامیہ کو اس کے مستقبل کے راستے میں پیش آنے والے خطرات کی نشاندہی کی وہاں انہیں اس نورِ ہدایت کی طرف بھی متوجہ کیا جس کی روشنی میں چل کر ہمارے قافلۂ ملی نے شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں اور جو آج بھی روشن مستقبل کی ضمانت تھا۔ آپ اپنی قانونی مشغولیات اور دیگر قومی اہمیت کی ذمہ داریوں کے باوجود طلبہ تک اپنی بات پہنچانے کے لیے وقت نکالا کرتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی کے نام خط میں اسلامیہ کالج کے طلبہ کو پڑھانے کی مصروفیت کا یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

---

[1] بنام سید سلیمان ندوی ۲۴، اپریل ۱۹۲۶ء، اقبال نامہ اوّل ص ۱۵۵ - ۱۵۶

اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر بیگ چیچک کی بیماری سے دفعتہً انتقال کر گئے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے کالج کے ایم اے کی جماعت مجھ کو لینی پڑی۔ امید ہے دو ماہ تک نیا پروفیسر مل جائے گا۔ یہ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آجاتے ہیں۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے۔ اس میں ان کے لیکچر کے لیے کتب دیکھتا ہوں۔ لیکچر کیا ہیں، انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عرفِ عام میں تاریخِ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی میں ان کو آپ کا یہ شعر سنا رہا تھا۔

میں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تل کر نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کر

سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے جزاک اللہ!

بہرحال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈال دینے کا موقع مل جاتا ہے۔

علامہ جہاں کہیں ممکن ہوتا نوجوانوں تک اپنی بات پہنچانے سے دریغ نہ کرتے انہی سے ان کی مستقبل کی توقعات وابستہ تھیں۔ وہ اپنے اشعار میں لکھتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

سفرِ میسور کے دوران ان کی تحریص کی وجہ سے مسلم نوجوانوں میں تاریخی تحقیق کا شوق و ذوق پیدا ہو گیا۔ محمد جمیل صاحب کے نام ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مجھے اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ میرا سفرِ میسور مسلم نوجوانوں میں تاریخی تحقیق کے ذوق و شوق کا باعث ہوا۔ سیٹھ اباصاحب نے مجھے سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ سے متعلق ایک قلمی مسودہ جو ایک شخص کے پاس جو ہمیں سلطان کے مقبرہ پر ملا تھا ارسال فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ مجھے امید ہے وہ اس کوشش میں کامیاب ہوں گے۔ ان تک میرا سلام شوق

---

[1] انوار اکبر الہ آبادی ۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۷۳ - ۷۴

پہنچا دیجیے اور ان سے کہیے کہ اسلام کی خدمت کے لیے ان کے ذوق وشوق نے میرے دل پر ایک ایسا اثر پیدا کیا ہے جو کبھی محو نہ ہو گا۔ میں دست بدعا ہوں کہ انہیں بنگلور کے حاجی سر اسمٰعیل کی سی عظمت و منزلت حاصل ہو۔

چوہدری محمد حسین صاحب بخیریت ہیں اور تصاویر کی موجودہ قسط اور آئندہ اقساط ان کی دلچسپی اور مسرت کا باعث ہوں گی۔ چوہدری صاحب کو بھی سلطان مرحوم کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور آج کل وہ سلطان پر ایک مختصر آرٹیکل مرتب کر رہے ہیں۔ وہ سفر نامہ مدارس بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس میں تمام تصاویر جو آپ ارسال فرما سکیں کام آئیں گی۔ میں آپ کے دوست عمر ساسٹس کے لیکچروں کی اشاعت میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ ان میں کوئی خاص نئی بات تو ہے نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں شاید عیسائی قارئین پر ان کا کچھ اثر ہو۔"[1]

اس سفر کے دوران انہوں نے بنگلور کی مسلم لائبریری کا معائنہ بھی کیا۔ یہ لائبریری مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر مواد اکٹھا کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اس لائبریری کے بارے میں علامہ نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں تحریر کیے۔

" جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں اور خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے جس کو میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اراکین کتب خانہ کو چاہیے کہ تاریخ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ کریں۔"[2]

محمد اکبر میر کے نام ایک خط میں علامہ نے مختلف کتابوں کا تذکرہ کیا ہے اس سے ان کے علمی شغف کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ نوجوانوں کی علمی رہنمائی میں کشادہ دلی سے کام لیتے تھے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ انہیں کتابوں پر مصارف میں شرکت کے لیے بھی لکھ رہے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں

---

[1] بنام محمد جمیل ۱۸، فروری ۱۹۲۹ء اقبال نامہ حصہ دوئم ۸۸ - ۹۰

[2] اوراقِ گم گشتہ ص ۴۴۸

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ ایران جانے والے ہیں شیراز فارسیوں کے کلچر کا مرکز ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہاں کا قیام آپ کے لیے بہت مفید ہوگا۔ حال کی ایرانی شاعری میں کچھ نہیں۔ البتہ اس قوم کی بیداری کے شواہد کے طور پر اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔ علاوہ اس کی زبان کی تحصیل کے لیے بھی مفید ہے۔ ایرانی شاعری کا تو قاآنی پر خاتمہ ہوگیا۔ خالص فلسفہ میں اگر کتابیں آپ کو مل جائیں تو انہیں جمع کرتے جائیے۔ قلمی ہوں یا مطبوعہ۔ تصوّف کی کتب کا جمع کرنا بھی مفید ہوگا۔ حال کے ایرانی حکماء میں ہادی سبزواری مشہور ہیں۔ ان کی کتاب اسرارالحکم میری نظر سے گذری ہے محض افلاطونیت کا چربہ ہے اور بس۔ حال کے دیگر حکماء میں سے اگر کسی کی تصنیفات آپ کے ہاتھ آجائیں تو غنیمت ہے۔ فلسفے اور تصوّف کی کتابوں پر اگر خرچ ہو تو پرواہ نہ کیجیے اس میں مجھے بھی شریک سمجھیے۔ البتہ کتاب خریدنے میں احتیاط لازم ہے۔ کیونکہ نوے فیصد کتابوں میں کچھ بھی نہیں ہوتا لوگ نام کی وجہ سے خرید لیتے ہیں۔

ایک کتاب غالباً "لطائف غیبی" نامی ایران میں شائع ہوئی تھی۔ پروفیسر براؤن نے لٹریری ہسٹری میں اس کا ذکر کیا ہے یہ کتاب ان اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہے جو شیعہ حضرات نے وقتاً فوقتاً خواجہ حافظ[2] پر کیے ہیں۔ اگر کہیں سے دستیاب ہوجائے تو میرے لیے خرید کر بھیج دیجیے۔

یونانیوں کے فلسفے پر حال ہی میں ایک نہایت عمدہ چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی ہے

A critical History of Greek Philosophy by W.T. Stace

اسے ضرور پڑھیے۔ میکمیلن سے ملے گی۔ اس سے زیادہ صاف اور واضح کتاب آج تک میری نظر سے نہیں گذری۔ بعد کا یورپین فلسفہ سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

انہیں کے نام ایک اور خط میں ان کی نظموں کی تعریف کرتے ہیں لکھتے ہیں۔

"عصر آزادی" میں آپ کی دونوں نظمیں دلآویز ہیں۔ انشاء اللہ آپ کی زبان شستہ ہو جائے گی اور ایران کا قیام آپ کی شاعری کے لیے نہایت مفید ہوگا۔

۱۔ (بنام محمد اکبر منیر ۱۴ اگست ۲۰ء، اقبال نامہ دوئم ص ۱۵۶ - ۱۵۸)

۲۔ (بنام محمد اکبر منیر ۳۰ جنوری ۲۲ء، اقبال نامہ دوئم ص ۱۶۰)۔

ایک اور خط میں کہتے ہیں "آپ کو اسلامی ممالک کے سفر سے بہت فائدہ ہوا ہے اور ہو گا۔ اشعار جو آپ نے بھیجے ہیں نہایت دلچسپ ہیں اور بالخصوص 'مسلمانے نمی بینم' نے تو مجھے رلا دیا اللّٰھم زِدْ فَزِدْ[1]

ہر چند کہ علامہ اقبال نے ۱۹۰۰ء میں علم الاقتصاد کے نام سے اردو میں معاشیات کی پہلی کتاب لکھی لیکن جب ۱۹۱۷ء میں علی گڑھ سے پروفیسر الیاس برنی کی کتاب "المعیشت" شائع ہوئی تو اقبال نے جو داد مصنف کو دی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے اقبال کی علو ہمتی، علم دوستی اور عظمت کا پتہ چلتا ہے مصنّف کو لکھتے ہیں

"آپ کی تصنیف اردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل کہ اردو زبان میں علم الاقتصاد پر یہ پہلی کتاب ہے اور ہر پہلو سے کامل،"[2]

مولوی سراج الدین پال کے نام لکھتے ہیں: "حافظ پر ایک طویل مضمون شائع ہونے کا مجھے بھی احساس ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اس کو باحسن وجوہ اتمام کر سکتے ہیں۔ آپ کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ جو سامانِ عقلی و اخلاقی ایسا مضمون لکھنے کے لیے ضروری ہے وہ سب آپ میں موجود ہے۔

(بنام سراج الدین پال ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء، اقبال نامہ حصہ اوّل ص ۳۵)

براؤن کی تاریخ ادبیات ایران میں بھی حافظ پر کچھ ہو گا۔ یہ کتاب بھی جرمن میں ہے اور اورینٹل کالج لاہور کی لائبریری میں موجود ہے جب آپ مضمون لکھیں گے تو میں اس کا وہ حصہ آپ کے لیے ترجمہ کر دوں گا.... مرزا محمد دارا لی کی کتاب تلاش کر رہا ہوں مل گئی تو آپ کو بھی دکھاؤں گا۔ مولانا جامی کی نفحات الانس بھی ملاحظہ کیجیے۔[3]

تصدق حسین تاج صاحب، اقبال کی تصنیف Metaphysics in Persia کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہتے تھے۔ علامہ انہیں ترجمے کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اس

---

[1] بنام محمد اکبر میئر، ۲ فروری ۱۹۲۴ء، اقبال نامہ دوئم ص ۱۶۵)

[2] (بنام پروفیسر محمد الیاس برنی ۸، مارچ ۱۹۱۷ء، اقبال نامہ اوّل ۴۰۹)

[3] (بنام سراج الدین پال ۱۹ جولائی ۱۹۱۶ء، اقبال نامہ اوّل ص ۴۲ - ۴۳)

کی کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور پھر انہیں ترجمہ کرنے کی بجائے خود ایسی تاریخ لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں اس سے علامہ اقبال کی بلند ہمتی اور اخلاص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر علامہ انہیں محض ترجمہ کرنے کی اجازت دے دیتے تو بھی علمی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تصنیف نہایت اعلیٰ پائے کی تھی اور ظاہر ہے کہ مترجم اس کی علمی کمزوریوں سے آگاہ نہ ہوتا لیکن پھر بھی علامہ اسے اپنے معیار سے فروتر سمجھنے کی وجہ سے اس کے ترجمے کی بجائے مکتوب الیہ کو ایسی کتاب لکھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ علامہ لکھتے ہیں۔

"مجھے کوئی تامل نہیں۔ آپ بلا تکلف اس کا ترجمہ شائع فرما سکتے ہیں مگر میرے نزدیک اس کا ترجمہ مفید نہ ہوگا۔ یہ کتاب اس سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیال میں بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ جرمن زبان میں غزالی طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں۔ میرے خیال میں اس کتاب کا اب تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔ آئندہ آپ کا اختیار ہے میری رائے میں ترجمہ کرنے سے بہتر یہ بات ہے۔ کہ آپ خود ایسی تاریخ لکھیں۔"[1]

غلام قادر فصیح صاحب نے تاریخ اسلام سے متعلق ایک رسالہ لکھا تھا ان کی حوصلہ افزائی ملاحظہ ہو لکھتے ہیں۔

میرے نزدیک یہ رسالہ نہایت مفید ہے اور ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ عام مسلمانوں میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لیے اس سے اچھا ذریعہ اور کوئی نہیں کہ اس قسم کے تاریخی رسالے شائع کیے جائیں۔ جن سے ان کو اسلاف کے حالات معلوم ہوں اور ان کے طرزِ عمل کا ان پر اثر پڑے۔ قوموں کی بیداری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی تاریخ سے کہاں تک دلچسپی ہے آپ کے رسالے کی اشاعت سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمان کہاں تک اپنے اسلاف کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

حالاتِ موجودہ کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ایک قسم کی

---

[1] (بنام تصدق حسین تاج ۱۱ جنوری ۱۹۲۷ء اقبال نامہ دوم ص ۱۰۰)

قومی بیداری پیدا ہوگئی ہے اور تاریخی مضامین کو نہایت توجہ سے سنا جاتا ہے۔اس واسطے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا رسالہ بر محل نکلا ہے اور ہماری ضروریات موجودہ کا کفیل ہوگا۔ خود مجھ پر جو اثر اس کے مطالعے سے ہوتا ہے اس کا اظہار میں اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کر سکتا کہ بسا اوقات دورانِ مطالعہ میں چشم پر آب ہو جاتا ہوں اس کا اثر میرے دل پر کئی کئی دن رہتا ہے خدا کرے کہ کوئی مسلمان گھر اس رسالے سے خالی نہ رہے [1]

اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ علمی میدان میں مسلمانوں کی فروماندگی کی وجہ سے ان کی قومی زندگی میں بھی انحطاط پیدا ہو گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں جہاں کہیں جوہر قابل نظر آتا تھا اس کی بے حد حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے۔ان کی حیثیت ایسے چراغ کی سی تھی کہ اس کی لو سے کئی اور چراغ جل اٹھے۔خاص طور پر قرآن حکیم اور اس کے موضوعات سے متعلق اگر کسی کو کام کرتے دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے۔جب مولانا محمد مبین عباسی کیفی چڑیا کوٹی نے رسالہ "العلم" نکالا اور علامہ کو بھجوایا تو اس کے جواب میں انہوں نے لکھا۔

"مخدومی اسلام علیکم رسالہ العلم کے لیے ممنون ہوا نہایت عمدہ رسالہ ہے۔اس کے مضامین تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے نہایت مفید ہوں گے۔مضمون الحیوانات فی القرآن نہایت قابلیت سے لکھا گیا ہے جسے میں نے خصوصیت سے پسند کیا۔اسی مضمون پر ایک مغربی مستشرق نے بھی لکھا ہے جس کا عنوان ہے "حیوانات کے نام سامی زبانوں میں" مجھے یقین ہے کہ آپ کا رسالہ کامیاب ہوگا اور مسلمانوں کے لیے باعث برکت" [2]

یہی نہیں کہ علامہ تعریف کرنے میں کسی بخل یا ذہنی تحفظ سے کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ حوصلہ افزائی کے لیے وہ الفاظ لکھتے کہ معمولی شخص بھی اپنے آپ کو بہت بڑا فاضل سمجھنے لگے۔ درحقیقت بڑے آدمی کی یہی پہچان ہے کہ وہ اپنے مخاطب میں احساس کمتری پیدا کرنے کی بجائے اسے رفعتوں سے ہم کنار کر دے۔ایک صاحب محمد عمر الدین نے امام غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر ایک کتابچہ لکھا تھا علامہ انہیں خط میں لکھتے ہیں

---

[1] بنام غلام قادر فصیح اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۶۳ - ۲۴۴)

[2] بنام محمد مبین عباسی کیفی چڑیا کوٹی ۱۲ اگست ۱۹۱۶ء اقبال نامہ اول ص ۶۱

"آپ نے جو کتابچہ ارسال فرمایا ہے اس کے لیے ممنون ہوں۔ امام غزالی کے فلسفۂ اخلاق کا یہ نہایت ہی دلچسپ تذکرہ ہے۔ یہ درست ہے کہ مفکر کو ایک منظم عالم فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لیے وہ اخلاقیات اور مابعد الطبیعات کے نظام قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ اس میں بتاتا ہے کہ ایک عام فرد کو بھی انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے ایک نظام کی ضرورت ہے۔ اپنے اور اس مفاد کے پیش نظر جس سے وہ وابستہ ہے اسے اس نظام کی حاکمیت پر معترض نہ ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں اسلام کی قوت تعمیر اقوام کا یہی راز ہے۔ آپ کا مقالہ پر تاثیر و فیض انگیز ہے۔ مجھے امید ہے آپ اس سلسلہ میں مزید تفتیش و تحقیق جاری رکھیں گے۔"[1]

انہوں نے عمر الدین صاحب کو تفتیش و تحقیق جاری رکھنے کا کہہ کر اپنا دامن نہیں چھڑایا بلکہ جب انہیں اس موضوع سے متعلق کچھ مواد ملا اور وہ بھی ایسا جو صرف چند ماہ پہلے چھپا تھا تو ان کے استاد ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے نام خط میں صرف اسی موضوع پر خامہ فرسائی کی لکھتے ہیں

مائی ڈیئر ڈاکٹر ظفر الحسن! آپ کے شاگرد رشید محمد عمر الدین صاحب نے کچھ عرصہ گذرا مجھے الغزالی پر ایک چھوٹی سی کتاب ارسال فرمائی تھی ان سے کہیے کہ وہ مارگیرڈ سمتھ کی کتاب

حارث بن اسد المحاسبی کا جو چند An early Mystic of Baghdad

ماہ پہلے شائع ہوئی مطالعہ کریں۔ انہیں چاہیے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ نہایت غور سے پڑھیں۔ اس کتاب سے انہیں نہ صرف غزالی کی تعلیمات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی بلکہ غزالی کی مدد سے مشرق و مغرب کے یہودی اور عیسائی تصوف پر محاسبی کے اثرات کا بھی معقول اندازہ ہو سکے گا۔"[2]

علامہ نے جہاں مسلمان نوجوانوں کو قرآن حکیم کے بتائے ہوئے راستے پر اپنے کلام کے ذریعے سے چلنے کی ترغیب دی اور انہیں مفاہیم کو شعر کے پیرایے میں ڈالا وہاں ذاتی رہنمائی اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھانے کے علاوہ جب بھی کوئی نوجوان علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آپ اپنی مشغولیات کے باوجود اسے پورا وقت دیتے۔

---

[1] (بنام محمد عمر الدین ۲۲ نومبر ۱۹۳۵ء، اقبال نامہ اوّل ۶۶-۶۷)

[2] (بنام ڈاکٹر سید ظفر الحسن ۱۳ دسمبر ۱۹۳۵ء، اقبال نامہ اوّل ۶۸-۶۹)

علامہ مستقبل کے پردے میں جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ انہیں جہاں اپنے دور کے لوڈیوں اور انگریز کے کاسہ لیسوں سے نفرت تھی۔ وہاں انہیں یہ توقع بھی تھی کہ نوجوان ان کا پیغام سمجھ کر ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کے لیے کچھ کر گزرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کی تربیت کے لیے انہوں نے دارلاسلام پٹھانکوٹ کے قیام کے سلسلے میں کوششیں کیں۔ ذاتی طور پر بھی طلبہ کو اسلام سمجھانے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ علامہ کی یہ کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ آپ کا پیغام آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ راہ بنا اور جن طالب علموں کے ذہنوں کی تربیت آپ نے خود کی تھی وہ پاکستان بنانے کی تحریک میں پیش پیش رہے۔

اقبالؒ اور اجتہادؒ

انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مغربی طاقتیں مسلم ممالک پر قابض ہوئیں تو ان کا مقامی روایات کے ساتھ سخت تصادم ہوا، ان کا خیال تھا کہ مسلمان اپنی روایات کو چھوڑ کر ان کے بنائے ہوئے قوانین کو اپنا لیں گے لیکن انہیں اس مقصد میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مسلم معاشرے کی قدریں، اصول اور روایات صدیوں کے بنے ہوئے قوانین کے ماتحت تھیں اور وہ انہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بہت سی روایات مقامی اثرات سے متاثر ہونے کی وجہ سے کسی حد تک ترمیم طلب تھیں۔ پھر بھی مسلمان غیر ملکی اثرات کے تحت انہیں بدلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مغرب اور مسلم معاشرے کا یہ تصادم اپنے جلو میں کئی مسائل لے کر آیا جن میں سے ایک اہم مسئلہ تقلید اور اجتہاد کا بھی تھا۔ غلامی کے اس نئے دور میں جب کہ سیاسی قوت غیر مسلم اقتدار کے ہاتھوں میں تھی علماء کے پیش نظر اہم مسئلہ یہ تھا کہ آیا تقلید کا راستہ اختیار کیا جائے یا اجتہاد سے کام لیا جائے۔ خود مقامی افراد میں ایسے جاہ پرست اور موقع شناس لوگوں کی کمی نہ تھی جو وقتی مصالح پر خود شریعت تک کو قربان کر دینے کے لیے تیار تھے۔ غیر مسلم اقتدار نے ان لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنایا اور معاشرے کی قدروں میں شکست وریخت اور اصولوں کی مستحکم عمارت میں نقب لگانے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ جہاں ان افراد میں سے کچھ اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر اس کام کو کرنے کے لیے تیار تھے وہاں ان میں سے ایسے افراد بھی تھے جو خلوص نیت سے غیر ملکی آقاؤں کی غلامی کا طوق پہننے کو باعث سعادت سمجھتے تھے اور ملت اسلامیہ کو بھی انتہائی خلوص سے یہ طوق پہنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قوم کے لیے ترقی کرنے کا ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ غیر مسلم اقتدار کا ساتھ دیا جائے اور ان کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ملک کی تہذیب، تعلیم اور دیگر معاشرتی اداروں کی ترتیب نو کی جائے۔ مسلم معاشرہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو اس کے اصولوں سے متصادم ہو لیکن مغربی استعمار کو ایسے لوگ میسر آ گئے جو ایک طرف ان کے معتمد علیہ تھے وہاں انہیں عوام میں بھی کسی حد تک پذیرائی حاصل تھی۔ ان افراد نے معاشرے کی ترتیبِ نو اور اصولوں کی شکست وریخت کے لیے اجتہاد کے اصول کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ تقلید کے خلاف ابھار کر ہی مغرب

کے اصولوں کو اپنانے پر آمادہ کیا جاسکتا تھا اس لیے تقلید کے خلاف لٹریچر کا ایک انبار لگا دیا گیا اور اجتہاد کو معاشرتی اداروں کی اکھاڑ پچھاڑ اور مغربی تقلید کا ذریعہ بنا دیا گیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں پوری دنیا میں مسلم معاشرہ اس چکی میں پس رہا تھا کہ اقبال نے اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں اور اس فضا کا جائزہ لیا۔ انہیں یہ پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اجتہاد کا مسئلہ ان نئے حالات میں کن اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے غلامی کے اس دور میں جس سے کہ مسلم قومیں پوری دنیا میں گزر رہی تھیں واضح طور پر غور و فکر کی سمت متعین کر دی اور بڑے واشگاف الفاظ میں اس بات کا اظہار کر دیا۔

ز اجتہادِ عالمان کم نظر — اقتداء بر رفتگان محفوظ تر
عقل آبایت ہوس فرسودہ نیست — کار پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں رسید ہمی باریک تر — ورع شاں از مصطفٰی نزدیک تر

ترجمہ: کم نظر علماء کے اجتہاد کی بجائے پچھلے لوگوں کے راستے پر چلنا کہیں زیادہ محفوظ ہے تمہارے آباء کی عقل ہوس آمیزی سے پاک تھی اور ان پاک نفس لوگوں کی ذاتی اغراض نہ تھیں۔ ان کے فکرِ رسا نے انتہائی باریک نکات کو حل کیا اور ان کا تقویٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے نزدیک تر تھا

اسی طرح ایک اور جگہ علامہ تقلید کو استحکام کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں

مضمحل گردد چو تقویم حیات — ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است — معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

ترجمہ: جب زندگی کا نظام کمزور ہو جائے تو ملت تقلید کے ذریعے استحکام حاصل کرتی ہے اپنے آباء کے راستے پر گامزن ہو کہ یہ قوت کا ذریعہ بنے کیونکہ تقلید کا مفہوم ملی استحکام ہے۔

مغرب کے فکری نظام کے تحت معاشرے کی قدروں کو تبدیل کرنے کا جو منصوبہ مشرق کے غلام ذہنوں میں پرورش پا رہا تھا اور جو بعد میں برگ و بار لایا، اقبال کے خیالات کے بالکل برعکس تھا۔ علامہ نے مغرب کے فلاسفہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا وہ ان کے

ساتھ اٹھے بیٹھے تھے اور ان کے خیالات کے بودے پن سے بہت اچھی طرح آگاہ تھے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں

مے از میخانۂ مغرب چشیدم　　بجانِ من کہ درد سر خریدم
نشستم با نکو یانِ فرنگی!　　ازاں بے سود تر روزے ندیدم

ترجمہ: میں نے میخانۂ مغرب کی مے چکھی ہے جس کا حاصل دردِ سر کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں فرنگیوں کے بہترین افراد کے ساتھ بیٹھا ہوں لیکن اس سے زیادہ لاحاصل وقت شاید ہی گذرا ہو۔[1]

اسی طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
سردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

جدید تعلیم کے اثرات سے خیالات کے بے ربط و نظام ہونے کی وجہ سے یہ افراد جو اس نظام تعلیم کے تحت پڑھ کر نکلے ہیں اس قابل نہیں کہ اسلام کی حقیقی روح تک پہنچ سکیں۔ اس کے برعکس یہ کیسے ہیں فرنگی صنم کردہ آباد کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ نئی تعلیم نے نوجوانوں کے دل و دماغ کو مرعوبیت کا شکار کر ڈالا تھا اور ان کی نظر میں افرنگ کی چکاچوند روشنیوں سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ یہ تو اقبال ہی تھا جو اس نظام میں رہنے کے باوجود متاثر نہ ہوا اس کی وجہ بھی وہ خود ہی بتاتا ہے کہ

؎ خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

---

[1] ارمغان حجاز ص ۶۳

حریت افکار کے پردے میں جو تازہ شریعت ایجاد ہو رہی تھی اور جس طرح اسلامی معاشرے کی دوامی قدروں سے صرفِ نظر کر کے مغربی تمدن کو سمونے کی کوششیں کی جا رہی تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں!

ہے کس کو یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حرّیت افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتشکدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد[1]

ایک اور نظم میں جس کا عنوان "حریتِ افکار" ہے وہ اس کے نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ[2]

اقبال کی تند و ترش تنقید ممکن ہے آج کے دور میں جب ہم آزادی حاصل کر چکے ہیں، عجیب سی لگے لیکن جس دور میں علامہ کو ایسے نوجوانوں سے سابقہ پیش آتا رہا ہو جو یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ اسلام ایک جداگانہ نظامِ حیات کا نام ہے اور یہ کہ مغرب تباہی کے گڑھے میں جا پہنچا ہے اس کی تقلید سے سوائے ہلاکت کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا اور جو مسلمان ہوتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی گستاخی یا بے ادبی سے لیتے تھے (ہر چند ایسے نوجوان خال خال تھے لیکن ان چند افراد کی وجہ سے

---

[1] ضربِ کلیم ص ۱۵۹
[2] ضربِ کلیم ص ۱۷۴

جن سے اقبال کو واسطہ پیش آیا تھا، اقبال اس نتیجہ پر پہنچنے میں مجبور تھے)

حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد عام ان کم نظر کے بس کی بات نہیں۔ اجتہاد کے لیے جہاں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں، قدیم و جدید پر گہری نظر اور تقویٰ کا اعلیٰ معیار چاہیے وہاں عوام الناس کا اس شخص پر پورا اعتماد بھی ضروری ہے۔ قدیم سے صرفِ نظر کر کے اگر کوئی شخص محض مغربی علوم کی بنیاد پر کسی نوع کا اجتہاد کرے گا تو وہ سراسر غلطی پر ہوگا۔ علامہ اقوام کی زندگی میں قدامت اور تاریخ کے عنصر کو بے حد اہم سمجھتے تھے۔ وہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں

"زندگی اپنے ماضی کا بوجھ کاندھے پر اٹھائے ہوئے سفر کرتی ہے۔ کسی نوع کی معاشرتی تبدیلی کرنے سے پہلے قدامت پسندی کی قوتوں اور ان کے مقاصد سے صرفِ نظر کرنا مناسب نہیں۔ کوئی قوم بھی اپنے ماضی کو مکمل طور پر مسترد کرنا گوارا نہیں کر سکتی کیونکہ ماضی ہی سے ان کا انفرادی تشخص متعین ہوتا ہے اسلام کے معاشرے میں خاص طور پر قدیم اداروں میں ردوبدل کرنا اور زیادہ نازک مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے مصلح کی ذمہ داریاں اور زیادہ گہری اور سنگین ہو جاتی ہیں۔"

انہی فرنگ زدہ افراد کے بارے میں علامہ کہتے ہیں

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر[1]

وہ انہیں کور ذوق سمجھتے تھے اور ان کے شیوۂ تقلید پر نقطہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کے
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
وہ فرنگی مدنیّت کہ جو ہے خود لبِ گور

[1] (ضربِ کلیم ۲۸)

وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس دور کے مسائل پہ خود اپنی نظر سے غور کریں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے دوسروں کی دریوزہ گری نہ کریں۔ وہ کہتے ہیں

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیاء تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی[1]

وہ ان نام نہاد مذہبی مصلحین سے سخت بیزار تھے جو غلاموں کو غلامی پر رضامند کرنے کے لیے تاویلِ مسائل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

شاعر بھی ہیں پیدا علماء بھی حکماء بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ[2]

---

[1] (ضربِ کلیم ۱۲۰)

[2] (ضربِ کلیم ۱۴۲)

اسی طرح ایک اور جگہ خطبات میں تحریر کرتے ہیں

"آج عالم اسلام کے رہنماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ یورپ کے واقعات کا بغور مطالعہ کریں اور ضبط نفس کے ساتھ آگے بڑھیں۔ انہیں یہ بات ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیے کہ اسلام کی معاشرتی اقدار اور اس کے اعلیٰ مقاصد کیا ہیں"۔[1]

وہ متجدد دین کے اس گروہ سے جو کہ قرآن کی من مانی تاویلات کے ذریعے عوام کو گمراہ کرنا چاہتا تھا، سخت نالاں تھے مغرب زدہ طبقے کے بارے میں وہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں۔

"مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ انتہائی پست فطرت واقع ہوا ہے"

وہ ایک بیان میں یہاں تک کہتے ہیں کہ۔ نئے دستور میں اس طبقے کے خلاف دستوری ضمانت ہونی چاہیے۔ لکھتے ہیں

'مجھے قدامت پسند ہندوؤں کا یہ مطالبہ بے حد پسند آیا کہ نئے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف دستوری تحفظ حاصل ہونا چاہیے۔ درحقیقت مسلمانوں کو سب سے پہلے ایسا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔[2]

علامہ کا خیال تھا کہ چونکہ معاشرے میں ایسے افراد کی سخت کمی ہے جو اجتہاد کے لیے مناسب صلاحیتیں رکھتے ہوں اس لیے اس کمی کو ایسے افراد کی کمیٹی سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ جس میں ایک طرف علماء ہوں تو دوسری طرف جدید مسائل پر نظر رکھنے والے اسلامی سیرت وکردار کے لوگ ہوں۔ علماء اور مسلمان قانون دانوں کا اجتماع اس کمی کو دور کرسکتا تھا۔ ۱۹۳۲ء کے خطبے میں آپ نے یہی بات کہی۔

'میں علماء کی ایسی مجلس قائم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہوں جس میں ایسے مسلمان قانون دان بھی ہوں جنہوں نے جدید فقہ کا مطالعہ کیا ہو۔ مقصد یہ ہے۔ کہ موجودہ حالات کے تحت قوانین اسلام کا تحفظ، توسیع اور اگر ضرورت ہو تو بنیادی

---

[1] خطبات ۱۶۳)

[2] (شاملو المنار لاہور ۸۴ء ص ۹۸)

اصولوں کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تشکیل جدید کی جائے۔ اس مجلس کی دستوری حیثیت متعین ہونی چاہیے اور مسلمانوں کے شخصی قوانین سے متعلق کوئی بھی قانون اس مجلس کی منظوری کے بغیر قانون ساز ادارے کے پاس نہ جانا چاہیئے ،[1]

آیئے اب دیکھیں کہ اسلام کے اس اہم اصول اجتہاد کے بارے میں قدیم علماء کیا کہتے ہیں۔ اجتہاد کے لغوی معنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کرنا، زحمت برداشت کرنا، مشقت اٹھانا ہیں۔ اصطلاحاً اجتہاد عبارت ہے اس کوشش سے جو کسی قضیے یا حکم شرعی کے بارے میں مجدِّا امکان ذاتی رائے (ظنِ غالب) قائم کرنے کے لیے کی جائے۔[2]

اجتہاد کی بنا اس آیت قرآنی پر ہے۔

الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

ترجمہ : جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کریں گے۔ ہم ان کو راستے کی رہنمائی کریں گے۔

حدیث میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا والی مقرر کیا تو فرمایا "تمہارے فیصلوں کی بنیاد کس چیز پر ہوگی؟ انہوں نے عرض کیا کہ کتاب اللہ پر، ارشاد ہوا" اگر کتاب اللہ کسی معاملے میں خاموش ہو تو پھر انہوں نے عرض کیا۔ سنت رسول اللہ پر فرمایا اگر سنت رسول میں بھی مسئلہ زیر بحث کی طرف کوئی اشارہ نہ ملے تو بنائے فیصلہ کیا ہوگی؟ حضرت معاذ نے کہا "میری اپنی رائے یعنی اجتہاد" (Réconstruction)

---

[1] شاملوص ۶۰)

[2] (کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم ص ۱۹۸، لسان ۴ : ۱۰۹)

امام شاطبیؒ الموافقات لکھتے ہیں

"اجتہاد اس عظیم جدوجہد کا نام ہے جو احکام شریعت کو معلوم کرنے کے لیے کی جائے اور جدید حالات پر ان احکام کے اطلاق کے لیے عمل میں لائی جائے۔"

علامہ ترکی میں کیے جانے والے اجتہاد سے مطمئن نہ تھے کیونکہ اس میں فکر و نظر کی بہت سی غلطیاں موجود تھیں۔ قرآن حکیم کے ترکی زبان میں پڑھے جانے (عربی متن کو نظر انداز کر کے) کو فیصلے کی سنگین غلطی قرار دیتے تھے۔[1]

اسی طرح قانون وراثت میں سوئٹزرلینڈ کے قانون کو اختیار کرنے کے بارے میں بھی ان کا یہ کہنا تھا کہ ہر چند یہ نوجوانی کے جذبات کے تحت ہوا ہے لیکن ایک شدید غلطی ہے[2]

ترکی میں مغرب کی تقلید کی جو فضا اس دور میں شروع ہو گئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ ترکوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی
سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب
سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

ایک اور جگہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی[3]

---

[1] (شاملو ۱۳۵)

[2] (شاملو ۱۳۶)

[3] (بالِ جبریل ۱۱۳)

کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

جاوید نامہ میں وہ کہتے ہیں

مصطفیٰ کو از تجدّد می سرود — گفت نقش کہنہ را باید زدود
نو نگردد کعبہ را رختِ حیات — گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگ نو در چنگ نیست — تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

ترجمہ: مصطفیٰ کمال نے تجدّد کا راگ الاپا اور کہا کہ ہمیں نقش کہنہ کو مٹا دینا چاہیے۔ کعبہ کو افرنگ کے لات و منات کے ذریعے نیا نہیں بنایا جا سکتا۔ ترکوں کے نغمے میں نیا آہنگ نہیں ان کی نئی چیزیں فرنگیوں کے کہنہ چیزوں کے سوا اور کیا ہیں۔ تاہم انہیں بجا طور پر یہ گمان تھا کہ الحاد اور مغرب پرستی کی یہ ہوا جلد ختم ہو جائے گی وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"ترکوں کے ایک خدا پرست جرنیل کے بقول الحاد کی یہ ہوا کچھ عرصے میں نکل جائے گی" (خطوط ۔۔۔)

ترکوں میں احیائے اسلام کی نئی روح نے اقبال کے اس خیال کو تقویت بخشی ہے کہ ترک واپس اسلام کی طرف لوٹیں گے۔ اور اسلام کے مستقبل میں ایک نمایاں کردار ادا کریں گے۔ اقبال کو یہ توقع تھی کہ اجتہاد کے میدان میں نیا کام ہوگا اور یہ کہ مسلمان نوجوان علماء کے ساتھ شریک ہو کر اس کام کو بجا طور پر انجام دیں گے جس کے بغیر اسلام کا احیا ممکن نہیں۔

اجتہاد:

علامہ صرف فقہی جمود ہی نہیں بلکہ کئی اور خرابیوں کو مسلمانوں کے زوال کا سبب سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عظیم کارنامے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ذہن انسانی کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ تقلید کے خلاف ایک آواز اٹھی۔ اجتہاد پر زور دیا گیا۔ عالم اسلام نے ایک کروٹ لی اور صدیوں کے جمود و تعطّل کے بعد قوائے عمل کو تحریک ہوئی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ صرف تقلید اور فقہی جمود ہی نہیں بلکہ منجملہ اس کے اور بھی کئی ایک خرابیاں ہیں۔ جن سے اسلام کی روح پائمال ہو رہی ہے مثلاً ملوکیت، خانقاہی، علم و حکمت کا زوال، سیاسی اور معاشی ابتری، مغربی تہذیب اور مغربی شہنشاہیت کے غلبہ و

استیلا کا بڑھتا ہوا ریلا"

ارشاد ہوا، "یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ جب کوئی انسان جسے اللہ تعالیٰ نے ذہن کا فہم عطا کیا ہے اور جسے اس کے ساتھ ایمان و یقین اور عزم و حوصلے کی دولت بھی ملی ہے کسی بنیادی مسئلے کو چھیڑتا اور امت کو اصلاح کی دعوت دیتا ہے تو یہ دعوت کوئی بھی شکل اختیار کرے رائیگاں نہیں جاتی۔ اس سے کئی ایک اور نتائج بھی مرتب ہو سکتے ہیں، بلکہ ہو جاتے ہیں خواہ کسی دوسرے رنگ میں"

ارشاد ہوا "شاہ صاحب ہی کو دیکھئے کیسے بالغ نظر اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کی ذات جس تحریک کا سبب بنی اور یہ تحریک جہاں تک بھی کامیاب ہوئی ان کی دور اندیشی اور امت کے لیے غیرت و حمیت کا ناقابل انکار ثبوت ہے ان کے ارشادات کی قدر و قیمت آج واضح ہو رہی ہے۔"[1]

علامہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عظیم کارنامے اور ان کے نقطۂ نظر کی تجدید چاہتے تھے۔ جس طرح شاہ صاحب نے اپنے دور میں مختلف مسائل پر اظہار رائے کیا اور برسوں کے جمود کو جھنجھوڑا، علامہ اس دور میں اس جمود کو توڑنا چاہتے تھے جو ڈیڑھ سو برس کی غلامی کے اثرات کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ فقہ اسلامی کو نئے سرے سے قرآن حکیم کی روشنی میں جانچا جائے اور ان نئے مسائل کا جو اس دور میں پیدا ہوئے ہیں، حل تلاش کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ علماء کی ایک جماعت مل کر اس کام کو سرانجام دے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ فقہا دورِ جدید کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ ایک جرأت مندانہ آواز تھی جو مغرب سے مرعوبیت کی وجہ سے نہیں اٹھی تھی بلکہ اسلام کی سچی دردمندی کا نتیجہ تھی

فقہ کی تجدید

علامہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں "میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے

---

[1] (اقبال کے حضور میں ص ۳۲۱)

بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا. قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان تمام ممالک میں بھی امروز و فردا میں یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں. ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے. ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں. میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے. کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"[1]

علامہ کو مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے جو عقیدت تھی اور ان کے علم و فضل پر جس درجہ اعتماد تھا اس کے پیش نظر انہوں نے سید صاحب کو اس کام کی طرف توجہ دلائی کہ وہ فقہِ اسلامی سے متعلق کام کریں اور دیگر علماء کو ساتھ ملائیں تاکہ اقوامِ اسلامیہ کو فقہِ اسلامی کی اصلی حقیقت معلوم ہو. سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہِ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی. جو میری نظر سے گذری ہے. مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے. اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا. میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ سے بھی کئی امور میں استفسار کیا تھا مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی. مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہنما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا

---

[1] (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء اقبال نامہ اوّل ۵۰-۵۱)

مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح یو تھرنے مسیحیت کے لیے کیا کیا نتائج پیدا کیئے۔ ہندوستان کی جمعیۃ العلماء کی توجہ اس طرف دلانا ضروری ہے۔ آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملایئے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی اصلی حقیقت معلوم ہو۔۔۔۔ ایران کو بابیت سے اندیشہ ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اسمٰعیلی تحریک کہیں پھر زندہ نہ ہو جائے۔ ایک قدیم اسلامی اصطلاح ہے "صوت الحی" شائد اس کا مفہوم قبیلہ کی آواز ہے کیونکہ اس وقت دنیائے اسلام میں کوئی خاص مذہبی شخصیت نہیں جو طبائع کے اس انقلاب کو ٹھیک رستہ پر لگائے۔ مختصر اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو رہنمائی کی ضرورت ہے اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علماء اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوام اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے ہاں دماغی اعتبار سے ان کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔[1]

اسی مضمون کو ایک اور خط میں یوں لکھا ہے "میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں قدیم، ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ 'جدید' بلکہ میرا ذاتی میلان 'قدیم' کی طرف ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے 'معنوی استیلا' کا اندیشہ ہے جس کا سدباب ضروری ہے۔ میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہ میں 'ندوہ' علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ہو۔[2]

---

[1] (بنام سید سلیمان ندوی ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء، اقبال نامہ اوّل ۱۴۲ - ۱۴۵)

[2] (بنام سید سلیمان ندوی ۷ اپریل ۱۹۲۶ء، اقبال نامہ اوّل ص ۱۴۸)

اجتہاد دورِ جدید میں ؛ مغربی طاقتوں کے اثرات کے تحت مسلم ممالک میں تجدّد پسند طبقہ میں ایسے افراد پیدا ہو چکے تھے جو اسلام کی تمام تر پابندیوں سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مغرب کی ملحدانہ اور مذہب دشمن تعلیم کے زیر اثر انہوں نے اسلام کے قوانین کو جو معاشرے کے استحکام اور فرد کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے تھے، تبدیل کر کے مغربی قوانین کے نفاذ کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس راستے میں انہیں بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مسلم عوام کسی ایسے اصول کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہو سکتے جو خدا اور اس کے رسولؐ کے بنائے ہوئے اصولوں سے ٹکراتا ہو۔ تجدّد پسند طبقے نے تاویل کا سہارا لیا اور نئی نئی تعبیروں کے ذریعے اسلام کے اصولوں کو تاخت و تاراج کرنے کا پروگرام وضع کیا۔ آیئے ہم ان کی تاویلات کا ایک سرسری سا جائزہ لیتے چلیں۔

مغرب میں نکاح اور طلاق کے قوانین اسلام کے قانون ازدواج سے بالکل مختلف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مغرب نے مسلم علاقوں پر قبضہ کیا تو انہیں جس چیز پر سب سے زیادہ حیرت ہوئی وہ تعدّدِ ازدواج اور مرد کے طلاق دینے کے حق کا مسئلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مستشرقین نے اس کو اپنا ہدف تنقید قرار دیا اور اس پر بے شمار اعتراضات کیے۔ مغرب کے مقلدین کے اس گروہ نے جو مشرق میں تجدد پسندی کا علمبردار تھا ان تمام اعتراضات کا خاطر خواہ جواب دینے اور مغرب کے خاندانی قوانین پر اعتراضات کرنے کی بجائے خود اپنے یہاں کے قوانین کو ناقص قرار دیتے ہوئے 'اصلاح' کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان اعتراضات کا لبِ لباب یہ تھا کہ "خاوند کو طلاق دینے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں، طلاق کے بعد خاوند کو بچوں کے اپنے پاس رکھنے کا حق ہے۔ تعدّدِ ازدواج پر کسی نوع کی پابندی نہیں۔ ایک بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی کر لینے پر کسی قسم کی قید نہیں"

—

یہ تو تھا شخصی اور خاندانی قوانین کا مسئلہ، اب تجدّد پسندوں نے عبادات کے میدان میں بھی اپنی فکر کے گھوڑے دوڑائے اور مغربی اعتراضات کا جواب یہ دیا کہ ان تمام عبادات

کی ایسی تاویل کی جائے کہ یہ غیر مؤثر یا بالکل منسوخ ہو کر رہ جائیں۔ ان کا کہنا یہ ہے

"رمضان کے روزوں کی وجہ سے قوت کارکردگی میں کمی آجاتی ہے اس لیے روزہ رکھنے کی بجائے اس کا کفارہ ادا کر دیا جانا چاہیے۔ حبیب بورقیبہ نے جو تیونس کے صدر ہیں کچھ عرصہ پہلے یہ کہا کہ مزدور اور دیگر صنعتی کارکن جو مشقت کرتے ہیں وہ معذوروں کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے ان کو روزے معاف ہونے چاہییں"

اسی طرح "حج کے موقع پر ہزارہا جانوروں کی قربانی کو ضیاع قرار دیا گیا" پھر یہ کہا گیا کہ "سود کے حرام ہونے سے معاشی نظام نہیں چل سکتا" زکوٰۃ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ "ریاست کے نظام محاصل (Taxation) کی موجودگی میں اس کی کیا ضرورت ہے" اور جب مغرب نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو تشویش کی نظر سے دیکھا تو انہوں نے "ضبطِ تولید کے تمام ذرائع قرآن حکیم کی تعلیمات کی ضد نہیں" کا فتویٰ پیش کر دیا۔ غرض یہ کہ مغرب کی جانب سے شاذ ہی اسلام پر کسی نوع کا اعتراض ہو جس کا جواب اسلام کے اصولوں کی قطع و برید اور "تاویل" کے ذریعہ پیش نہ کیا گیا ہو۔ یہ ہیں اسلام کے جدید محققین جن کے بارے میں اقبال کا کہنا ہے

ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا
ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیاد
اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد [1]

اس 'تجدید' کے بارے میں جس کا دعویٰ اسلام کے نام نہاد محققین کو ہے اقبال کا کہنا تھا کہ

ع لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

---

[1] بالِ جبریل ۲۳۲

اسلامی تحقیقات

علامہ کی نظر میں اگر اجتہاد کا کوئی معیار تھا تو وہ امام ابو حنیفہؒ کی ذاتِ گرامی تھی۔ آپ کی نگاہوں میں ان کا جو بلند مرتبہ و مقام تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تحریر سے کیا جا سکتا ہے

امام ابو حنیفہؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر مذہب اسلام کی رو سے مجسموں کے ذریعے بڑے بڑے حکماء اور علماء کی یادگاریں قائم رکھنے کا دستور جائز ہوتا تو یہ عظیم الشان فقیہ اس عزت کا سب سے پہلا حق دار تھا۔ دینی خدمت کے اس حصے، یعنی فلسفۂ شریعت کی تفسیر و توضیح میں امیر المومنین جناب علیؓ کے بعد جو کچھ اس فلسفی امام سے سکھایا ہے قوم اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ لیکن اگر موجودہ حالاتِ زندگی پر غور و فکر کیا جائے تو جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصولِ مذہب کے لیے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے، اسی طرح قانونِ اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بناء پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اسلامی دنیا میں اب تک کوئی ایسا عالی دماغ متفنن پیدا نہیں ہوا اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شائد ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے یہ بحث بڑی دلچسپ ہے مگر چونکہ قوم ابھی ٹھنڈے دل سے اس قسم کی باتیں سننے کی عادی نہیں ہے اس واسطے میں اسے مجبوراً نظر انداز کرتا ہوں۔"[1]

علامہ کا یہ ارشاد کہ یہ کام شائد ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے اس خیال کے پیش نظر تھا کہ غلامی کی اس شبِ تاریک

---

[1] (مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۳ء)

ہیں جس سے علامہ اور ان کے ہم عصر گذر رہے تھے، اس قسم کا کام ہونا غیر ممکن تھا۔ یہ کام تو مردانِ حر کے کرنے کا تھا۔ علامہ غلاموں کی بصیرت پر اعتماد نہ کر سکتے تھے وہ لکھتے ہیں۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے سے ہے وہی زیبا

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر [1]
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

وہ فرنگی افسوں اور فرنگی دانش کے سحر سے پوری طرح باخبر تھے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل انہیں اس سحر سے محفوظ رکھے۔

وہ بے قراری کے عالم میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں کہتے ہیں

ع تو اے مولائے یثربؐ آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری [2]

پھر وہ مولانا رومؒ کے کلام کی روشنی کو افرنگی افسوں کا علاج قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں [3]

فرنگیوں کے اس سحر کا ایک اور جگہ یوں ذکر کرتے ہیں

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس دور میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم [4]

---

[1] بال جبریل ۴۰
[2] " ۵۸
[3] " ۴۴
[4] " ۸۸

اس میں شک نہیں کہ اس صدی میں جن نت نئے مسائل نے معاشرے پر یلغار کی ہے ان کے حل کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو انتہائی بالغ نظر ہوں۔ ان میں ملت اسلامیہ کے قدیم پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ موجودہ تہذیب کی پیدا کردہ الجھنوں کو حل کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں وقت کا پہیہ کچھ اس تیزی سے گردش کرنے لگا ہے کہ جو تبدیلیاں صدیوں میں رونما ہوتی تھیں اب وہ ایک دہے (Decade) میں پیش آنے لگی ہیں۔ مسلمان معاشرہ دیگر معاشروں پر اثر انداز ہونے کی بجائے اثر پذیری کے عمل سے گذر رہا ہے اس میں شک نہیں کہ کچھ ذہن وقت کے تیز دھارے کو موڑ دینے کی صلاحیت رکھنے والے ہیں لیکن اکثریت اس دھارے پر بہنے کو ہی اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہے۔ ان حالات میں ایک بالکل نئے تجربے کی ضرورت ہے اب تک مسلمان فکر کی تاریخ عصری مسائل میں الجھتی رہی ہے کبھی یونان کے فلسفہ و حکمت نے اسے متوجہ کیا تو کبھی عقل پرستی کی تحریکات اسے اپنے ڈھب پر لگائے رہیں۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف تک مغرب کے علوم و فنون کا سحر اس طرح رہا کہ جہاں کچھ مفکرین اس کی اتباع میں اسلام میں ترمیمات کرتے نظر آئے تو دوسرے مفکرین نے مغرب کی اصطلاحات اور استعاروں میں اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مغرب کی فکر کا مقابلہ کیا لیکن اس میں کہیں کہیں ٹھیٹھ اسلامی فکر کو دھچکا بھی لگا۔ یہ بھی بہرحال فکری تاریخ کا ایک دور تھا جو گذر گیا۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے ضمیر میں ڈوب کر براہ راست قرآن حکیم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ موجودہ دور کے مسائل کا حل آج بھی اسی فکر میں ہے جو عرب کے تپتے صحراؤں میں اس شان سے رونما ہوئی تھی کہ تمام فلسفے منہ تکتے رہ گئے تھے۔ ہمیں یونان و عجم کی بھول بھلیوں سے نکل کر اپنے مسائل کا حل سیرتِ رسولؐ اور اسوۂ اصحابہؓ میں تلاش کرنا چاہیے اقبال جسے رجعتے سوئے عرب می بایدت کے عنوان سے یاد کرتے ہیں، اسے ہماری فکری تاریخ کے ارتقاء میں انتہائی اہم مقام حاصل ہونا چاہیے۔ اجتہاد کی اگر کوئی حیثیت ہے تو اسی عنوان سے ہے

تاہم اس کی اہلیت وہی لوگ رکھتے ہیں جو مغرب کی فکر سے مرعوب ہونے کی بجائے اسلامی روایات کے پس منظر میں جدید کو قدیم کے حوالے سے پرکھنے اور دیکھنے کے عادی ہیں۔

اقبال اور قدیم وجدید کی کش مکش

انیسویں اور بیسویں صدی میں جب یورپی طاقتوں نے مسلم ممالک پر غلبہ حاصل کیا اور مقامی معاشروں میں اپنے سیاسی تعلیمی اور ثقافتی اثرات ڈالے تو اس سے قدیم بنیادوں پر قائم اصول وضوابط کی شکست وریخت کا عمل شروع ہوگیا۔ جہاں مغربی طاقتوں نے مقامی رسوم ورواج اور معاشرتی روایات کو تہس نہس کرنے کی کوشش کی وہاں دوسری طرف اس کا ردِ عمل بھی انتہائی شدید ہوا۔ قدیم وجدید کی کشمکش تمام مسلم ممالک میں شروع ہوگئی تھی۔ علماء جو ہمیشہ سے معاشرے کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے چلے آرہے تھے نئے استعمار کے تحت معاشرے کی رہنما قوت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے اور ان کی جگہ مغربی اثرات کے تحت ڈھلے ہوئے نئے رہنماؤں نے لے لی جن کی پشت پر حکومت کی پوری قوت موجود تھی اس طرح قدیم وجدید کی کشمکش درحقیقت علماء اور نئے رہنماؤں کے درمیان تنازع کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس ساری صورت حال کا حل صرف اس گروہ کی شکل میں ممکن تھا۔ جو ایک طرف قدیم پر گہری نظر رکھتا ہوا ور دوسری طرف مغرب سے مرعوب ہوئے بغیر مغربی علوم وفنون اور تہذیبی اصولوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ مسلم ممالک میں اس گروہ کے عدم وجود نے مسائل کو اور دشوار کر دیا تھا۔ علامہ اقبال وہ واحد شخص تھے جو اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا وجود نہ تھا۔ جہاں وہ ایک طرف قرآنِ حکیم حدیث اور قدیم لٹریچر پر گہری نظر رکھتے تھے وہاں انہوں نے مغرب کے تہذیبی اصولوں کا بھی اچھی طرح مطالعہ کیا تھا وہ مرعوبیت کا شکار نہ تھے اور ایک آزادانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک مناسب رویہ اختیار کیا تھا۔ وہ مسلم مصلحین کو اسلام کی حقیقی روایات اور جدید تہذیب کی تصویر کا غور سے مطالعہ کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ سرسید

اور مرزا غلام احمد میں مغرب سے جو مرعوبیت نظر آتی ہے اس سے بالکل محفوظ تھے۔ ساتھ ہی ان کا رد یہ ان لوگوں جیسا بھی نہ تھا جو مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو کفر و الحاد سے تعبیر کرتے تھے۔ قدیم و جدید کی اس کشمکش پر اظہار رائے کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں۔

"اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام میں قدامت پسند جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پرست اسلام بغیر جد و جہد کے سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے جو چیزیں غیر ضروری ہیں ان کو ملتوی کر دینا چاہیے کیونکہ صرف ضروری چیزیں فی الحقیقت قابل لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں ہے کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر منزلِ ارتقاء طے کرتی ہے۔ انسان نے اپنی معاشرتی تہذیب کو تشکیل دینے کا سلیقہ حال ہی میں سیکھا ہے، اس لیے جائز حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے"[1]

اسلام زمانی اور مکانی حدود سے بلند تر ضابطہ حیات ہے اسی لیے اس میں قدیم و جدید کی کشمکش کا تصور نہیں پایا جاتا اسلام ہمیں ایسے خدا کا تصور عطا کرتا ہے جو حیّ اور قیوم ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں اس نوع کی بحثیں بہت کم وجود میں آئی ہیں جن سے مغربی تہذیب کو سابقہ پیش آیا ہے یہاں ایک حقیقتِ ابدی ہے جس میں کسی نوع کا تغیر نہیں اور وقت کی گردشوں کے ساتھ ساتھ اس کے اصولوں کو ترمیم و اصلاح کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اس میں ہر دور کے مسائل کا حل بخوبی موجود ہے۔ یورپ کی مادہ پرستانہ تہذیب کے اثر کی وجہ سے ہمارے یہاں بھی اسلامی تعلیمات سے روگردانی کرنے کا رویہ آ چلا تھا۔ انیسویں صدی کی عقل پرستی کا آفتاب ابھی گہنایا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے اس مسئلہ پر بار بار اظہار رائے کیا۔ انہوں نے درسگاہوں میں دینی تعلیم دینے کے بارے میں زور دیا اور کہا۔

---

[1] (گفتار - ۸۶)

"میں اس امر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہیے، امر واقعہ یہ ہے کہ میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے مذہب کو سوراج (Self Rule) پر مقدم خیال کرتا ہوں. ذاتی طور پر مجھے ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہ ہوگا جو مذہب سے بے نیاز ہو. یورپ میں تعلیم کا خالصتاً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے. میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دوچار ہو. یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگان ایشیا، یورپ کے خالص دنیاوی رویہ کو بھی فراموش نہیں کر سکتے. ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح ایک جگہ جمع کیا جائے....

ہمارے نوجوانوں کی بابت کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہیے، یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں جس کی مادہ پرستی یورپ کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لیے پیام موت ثابت ہو چکی ہے.

روحانیت اور مادیت کو یک جا جمع کرنے میں ترکی کی ناکامی کی زبردست وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یورپ کی نقالی شروع کر دی اگر وہ اس مسئلے کو حل اسلام کی وساطت سے ڈھونڈتے تو معاملہ دگرگوں نہ ہوتا. کیونکہ میرے نزدیک اسلام تخیل اور حقیقت یعنی روحانیت اور مادیت کے درمیان تطابق پیدا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش ہے. ترکی کے عامۃ الناس مذہب کے ویسے ہی دلدادہ ہیں جیسے پہلے تھے! اس معاملے میں ترکی کے مسلمان اور ہندوستان کے مسلمان میں کوئی فرق نہیں..... اس میں شک نہیں کہ ایشیاء اور افریقہ کے مسلمانوں کو زندہ رہنے کی خاطر دنیائے حاضرہ میں داخل ہونا پڑے گا. لیکن اس داخلے کے وقت صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو زمانہ حاضرہ میں انسان کے معاملات کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتوں سے باخبر ہوں گے۔"[1]

عالم اسلام میں قدیم و جدید کی جو کشمکش جاری تھی، علامہ اس کے نتائج کے بارے میں سوچ کر بے حد متفکر ہوتے. علامہ اپنے دور میں شکست و ریخت کا ایک عالمی عمل دیکھ رہے تھے اور بے چین تھے کہ اس کے مضر نتائج سے بچنے کے سلسلے میں اسلام کس حد تک اقوام

---

[1] (گفتار اقبال ۲۲۴ - ۲۲۶)

کی مدد کر سکتا ہے۔ اس بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے وہ سید سلیمان ندویؒ کو لکھتے ہیں:

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے، جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) ابھی حالتِ نزع میں ہے، غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمایئے۔ اور اگر کوئی کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ہو تو ان کے ناموں سے آگاہ فرمایئے۔"[1]

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان جو ذہنی خلفشار اور پہلی جنگ کے مضر اثرات کے نتیجے میں جو ذہنی پراگندگی پیدا ہو چکی تھی، اس کے اثرات برصغیر پر بھی پڑ رہے تھے۔ نظامِ عالم نئی کروٹ لے رہا تھا اور اس بات کا محتاج تھا کہ اس کی نئی تشکیل ہو۔ جرمنی اور اٹلی کی نسل پرست اور قوم پرست حکومتیں جمہوریت کے نام لیوا اور استعمار کو روا رکھنے والی اقوام کے خلاف پر تول رہی تھیں۔ جمہوریت کے پس پردہ ذاتی اغراض اور قومی اصولوں کے نام پر چند گروہوں کے مفادات برسرِ پیکار ہونے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ علامہ یورپ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ سمجھ رہے تھے کہ یورپ کی تہذیب قطعاً اس لائق نہیں رہی کہ یہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ اسلام اور اہل اسلام ہی اس فریضہ کو اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے مغرب کی تقلید کا بھوت ابھی تک ذہنوں پر سوار تھا۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر انہوں نے ارشاد فرمایا تھا:

؎ کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

"انسان جب کسی تہذیب سے متاثر ہوتا ہے تو اس کی اچھی بری سب باتیں اختیار کر لیتا ہے مغربی تہذیب کی نقالی اور اس کے ظاہری اور سطحی پہلوؤں کی دل کشی بجائے خود

---

[1] بنام سید سلیمان ندوی ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء، اقبال نامہ اوّل ص ۱۸۱ - ۱۸۲

ایک مصیبت تھی۔ مغربی تعلیم نے ہمارے لیے اور بھی فتنے پیدا کر دیئے۔ آج کی بات اور ہے۔ آج اس تعلیم کے مفر نتائج ہمارے سامنے ہیں جسے کبھی ترقی کا واحد ذریعہ ٹھہرایا جاتا تھا۔ ہم اس تعلیم کا ماتم کہاں کہاں نہیں کرتے۔ سیاست میں، اخلاق میں، فکر و فرہنگ میں، تمدن اور معاشرے میں۔ لیکن اس کی خرابیاں تو ابتدا ہی سے عیاں تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یوں دلوں میں جو فساد پیدا ہوا اس کے اثرات بہت آگے چل کر سامنے آئے،،[1]

مغربی تحقیق پر اسلامی اثرات

علامہ اسلامی علوم کے وسیع مطالعے کی وجہ سے یہ سمجھ سکتے تھے کہ مغرب کے فلسفیانہ ارتقاء کے مدارج میں مسلمانوں کا کیا حصہ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کے سیاسی غلبے کے باوجود انہیں مغرب کی علمی برتری کا کبھی خیال نہیں ہوا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقے میں اس نوع کے خیالات پیدا ہو چلے تھے وہ اس کی بھرپور تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جب سے کہ یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا۔ یورپ میں سائنس کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں مختلف یورپی ممالک کے طلبہ آکر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے حلقوں میں علوم و فنون کی اشاعت کرتے تھے۔ کسی یورپین کا یہ کہنا کہ اسلام اور علوم یکجا نہیں ہو سکتے سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے اور مجھے تعجب ہے کہ علوم اسلام اور تاریخ اسلام موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ علوم اور اسلام ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

بیکن، ڈیکارٹ اور مل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں جن کے فلسفے کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ حالت یہ ہے کہ ڈیکارٹ کا "میتھڈ" (اصول)، امام غزالیؒ کی احیاء العلوم میں موجود ہے اور ان دونوں میں اس قدر تطابق موجود ہے کہ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم ضرور

---

[1] اقبال کے حضور میں ص - ۲۶

اعتراف کرتے کہ ڈیکارٹ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے۔ راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا جان اسٹورٹ مل نے منطق کی شکل اوّل پر جو اعتراض کیا ہے بعینہٖ وہی اعتراض امام فخر الدین رازیؒ نے بھی کیا تھا۔ غرض یہ کہ وہ تمام اصول جن پر علوم جدیدہ کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو۔"[1]

علامہ کا یہ خیال تھا کہ اسلام کی تہذیب پرور قوت نے موجودہ دور کے ہر پہلو پر انتہائی گہرا اثر ڈالا۔ اسی لیے انہوں نے ایک جگہ یہ کہا کہ موجودہ دنیا اپنے تمام علم و تہذیب اور صنائع و بدائع سمیت مسلمانوں کی "مخلوق" ہے[2]

مسلمانوں نے پوری دنیا کے علمی و ادبی سرمایہ میں جو گراں قدر اضافے کیے وہ آج بھی مسلمانوں کے لیے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بہت سا سرمایہ یورپ کی لائبریریوں میں پڑا ہوا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

"غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را"[3]

تاہم اقبال یورپ میں مسلمانوں کے علمی سرمائے اور اس سے محرومی پر اک آہِ سرد ہی نہیں کھینچتے وہ اس صورت حال سے قنوطی نہیں ہو جاتے۔ وہ تمام دنیا کو مردِ مومن کی

---

[1] اوراقِ گم گشتہ ۱۸۲ - ۱۸۳

[2] (ملفوظات ص ۵۰)

[3] بانگ درا ص ۱۹۸ - ۱۹۹) مارچ ۱۹۰۷ء

میراث سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک[1]

علامہ سمجھتے تھے کہ اَلْحِکْمَتُہٗ ضَالَّتُہُ الْمُوْمِنُ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ تاہم اس سے انہوں نے مغرب کی تقلید کا جوازِ لطیف نہیں ڈھونڈا

اسلامی ریسرچ اور مغرب

علامہ مغرب میں کی جانے والی اسلامی تحقیقات کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اس میں بڑی حد تک ان کے ذاتی تجربے کا بھی دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تحقیقات کے لیے کسی طالب علم کو مغربی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے نہیں کہا بلکہ اس سے روکا۔ حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری صاحب اسلامی ریسرچ کے لیے یورپ جانا چاہتے تھے اور علامہ سے راہنمائی کے طالب تھے۔ ان کے نام لکھتے ہیں۔

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے فرانس جرمنی انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے سادہ لوح مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لیے یورپ جانا بے سود ہے۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

مصر جائیے۔ عربی زبان میں مہارت پیدا کیجیے۔ اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کر کے محمدِ عربی کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کیجیے پھر اگر ذہن خداداد ہے۔ اور دل میں خدمتِ اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے۔ ہاں یورپ کا فلسفہ پڑھنے

---

[1] بالِ جبریل ص ۹۷

کے لیے آپ یورپ کا سفر کر سکتے ہیں اگرچہ مسلمانوں کو موجودہ حالات میں فلسفہ اور لٹریچر کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس صورت میں بھی Thesis کے ذریعے ڈگری حاصل کرنا فضول ہے یورپ کے فلسفہ کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کر کے ڈگری حاصل کرنا چاہیئے"۔ [1]

حافظ فضل الرحمٰن انصاری صاحب اس دور کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک استثناء کی حیثیت رکھتے تھے کہ انہوں نے تحقیقاتِ اسلامیہ کے میدان میں آگے بڑھنے کو اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا۔ ورنہ اس دور میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو ملازمت کے علاوہ کسی اور چیز کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہوں۔ علامہ ایسے لوگوں کو ملک و ملت کے وسیع تر مفادات اور احیائے اسلامیہ کی راہ میں بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ان کے جذبات اس معاملے میں اس حد تک تند تھے کہ انہوں نے ایک بار کہا اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو اس 'ماڈرن' طبقے کو ختم کر دیتا۔

سید نذیر نیازی علامہ سے ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

علامہ نے فرمایا .... کی موجودہ ملازمت میں ابھی ایک سال باقی ہے لیکن .... کی فکر میں ہیں۔ تنخواہ کم ہے گذر نہیں ہوتی اس پر علی بخش نے جو پاؤں داب رہا تھا یہ فقرہ چست کیا کہ انارکلی میں تھانیدار کی جگہ بھی تو خالی ہے اس کے لیے کوشش کریں۔ حضرت کو ہنسی آگئی ارشاد ہوا "انگریزی حکومت نے یہ ایک عجیب طائفہ ملازمت پویاں (علامہ نے Job sniffers کا لفظ استعمال کیا تھا) پیدا کر رکھا ہے۔ میں نے تو عرض کیا تھا اللہ پر توکل رکھیے آپ کے پاس ماشاء اللہ بہت کچھ تھا۔ مجھے دیکھیے میرے پاس کیا ہے اور کیا تھا۔" [2]

دراصل مسلمانوں میں فضل الرحمٰن انصاری صاحب جیسے افراد کی بے حد کمی رہی ہے مسلمانوں کے یہاں علم و فضل کی جو روایات تھیں وہ دورِ انحطاط میں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں۔ پھر سیاسی زوال کے بعد معاشی ابتری کا جو دور آیا اس میں مسلمانوں کو دو وقت کی روٹی کمانے سے ہی فرصت نہ ملی کہ وہ لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ ہوتے۔ نصف صدی تک مسلمانوں پر ملازمتوں

---

[1] بنام حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری صاحب ۱۶ جولائی ۱۹۳۷ء، اقبال نامہ اوّل ص ۳۹۸ - ۳۹۹)

[2] اقبال کے حضور میں۔ ص ۹۳ - ۹۴

کے دروازے بند رہے۔ پھر انگریزوں کے زیر اثر جو تعلیم جاری ہوئی اس میں بھی تحقیق و تدقیق کی گنجائش نہ تھی۔ یہ تعلیم بقول اکبر محض سرکاری تھی اس میں علمی تحقیق کرنے کی طرف توجہ دینے کا رجحان پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک عرصہ تک ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جن کا مقصدِ حیات سول سروس اور اسی قبیل کی دوسری ملازمتیں تھیں اور جو بقول اقبال

طبقہ ملازمت بویاں"

"میں سے تھے۔ اکبر نے انہی افراد کے بارے میں کہا تھا

ع شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

اس میں شک نہیں کہ مغرب میں علم و ہنر کے بہت چرچے ہیں۔ وہاں کی یونیورسٹیاں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں پی ایچ ڈی پیدا کر رہی ہیں۔ صرف امریکہ میں ہر سال دس ہزار سے زائد حضرات تحقیق کی اعلیٰ ترین سند حاصل کر کے یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہاں کے پروفیسر ہر سال اعلیٰ درجے کے تحقیقی مقالات اور کتب میدان میں لاتے اور علم و فضل کی دنیا کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہاں سائنس کے میدان ہی میں نہیں بلکہ معاشرتی علوم کے میدان اور ادب و فلسفہ میں بھی نادر تحقیقات سامنے آتی ہیں۔ وہاں کی لائبریریاں اور تحقیقی ادارے اپنی مثال آپ ہیں۔ دنیا کے کونے کونے سے کتابیں حاصل کی جا رہی ہیں۔ نادر مخطوطات کا سراغ لگایا جا رہا ہے اور بیش بہا مشاہرہ پانے والے محققین ان پر کام کر رہے ہیں۔ اقبال جس دور میں جرمنی گئے تھے وہاں کی تعلیمی سرگرمیوں سے خاصا متاثر ہوئے تھے اور جرمنی کے نظام تعلیم کی بے حد تعریف کی تھی لیکن اس کے باوجود انہیں یہ کہنا پڑا کہ

ع یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
سچ یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علم کی اس فراوانی کے باوجود وہ روشنی جو اللہ تعالےٰ کی وحی کے سرچشمے سے حاصل ہوتی ہے یورپ اس سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام تر علم و تحقیق انسانیت کی فلاح و بہبود کے بجائے اس کی تباہی کے راستے میں استعمال ہو رہا

ہے مغربی سائنس دانوں کی تحقیقات انسانوں کو بہتر انسان بنانے کی بجائے انسانوں کو بہتر درندہ بنانے اور چیرنے پھاڑنے کے لیے بہتر آلات فراہم کرنے میں معروف ہے اس میں شک نہیں کہ انسان خلاؤں کو تسخیر کر چکا ہے اور اس کے قدم چاند کی سرزمین تک جا پہنچے ہیں لیکن اس کے باوجود اس زمین کے مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے۔ یہ شعر کہ

ے تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

اس دور کی خلائی پروازوں اور مصنوعی سیاروں کے دور میں کتنے چبھتے ہوئے طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اپنے کلام میں اس تمام ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے کیا خوب کہتے ہیں۔

ے ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس میں شک نہیں کہ مغرب نے چاند ستاروں پر کمندیں ڈالیں اور انفس و آفاق کے مشاہدات میں عمریں کھپانے والے افراد پیدا کیے لیکن بدقسمتی سے جہاں انہوں نے انتہائی جانفشانی اور محنت سے کام کیا وہاں ان کی تحقیق کی سمت کا تعین غلط ہونے کی وجہ سے انسانیت فائدہ اٹھانے کی بجائے سخت گھاٹے میں رہی۔ مغرب میں اسلام کے بارے میں تحقیقات کا مقصد یہ رہا ہے کہ کسی طرح چن چن کر کیڑے نکالے جائیں۔ فرقہ وارانہ اختلافات کو ابھارا جائے مسلمانوں کی مختلف نسلوں اور قبائل کو ایک دوسرے سے مختلف ثابت کیا جائے اور ان میں وحدت کے عناصر ڈھونڈنے کی بجائے انہیں چھوٹی چھوٹی جزئیات کے اختلافات کو بنیادی اور انتہائی گہرا ثابت کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کتابوں کے انبار کو دیکھ کر انسان مبہوت ہو جاتا ہے لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ درحقیقت یہ تمام تر علمی سرمایہ مغرب کے استعماری منصوبوں کے لیے ریسرچ رپورٹس کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے مسلم ہند پر قبضہ کرنے اور اسے ہندوؤں کے سپرد کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا یہ تمام تر علمی کام اس کے لیے ہراول دستے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت

اور ہندی علوم پر جو کام ہوا وہ مسلمانوں کے سرمایے پر کام کے مقابلے میں کہیں زیادہ اور بہت وقیع ہے۔

یورپین مستشرقین کے بارے میں علامہ کی رائے ڈھکی چھپی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کام کیا ہے لیکن ان کے مقاصد خاص ہیں جس کی وجہ سے وہ ان کتابوں میں کوئی خاص بات پیدا نہیں کر سکے۔ علامہ لکھتے ہیں "اسلام کے ثقافتی اور فلسفیانہ پہلو پر ابھی کام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ جرمن زبان میں چند کتابیں ہیں۔ جن کا حال ہی میں کلکتہ کے صلاح الدین خدا بخش صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لیکن وہ کتابیں بھی کچھ یونہی سی ہیں۔ [1]

انہی کے نام ایک اور خط میں رقم طراز ہیں "جہاں تک مجھے علم ہے گولڈزی[2] کی کوئی انگریزی تصانیف نہیں ہیں۔ وہ ایک جرمن یہودی ہے اور انگریزی میں نہیں لکھتا۔ اس کی مشہور ترین کتب جرمن زبان میں ہیں اور ان میں کوئی خاص چیز مجھے تو نظر نہیں آئی۔ میں یورپین مستشرقین کا قائل نہیں کیونکہ ان کی تصانیف سیاسی پراپیگنڈا یا تبلیغی مقاصد کی تخلیق ہوتی ہیں۔ [3]

جہاں تک ان کی علمی قابلیت کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مستشرقین میں سے انتہائی فاضل شخص نکلسن جنہوں نے اسرارِ خودی کا ترجمہ کیا۔ اس مصرعہ میں "صورت طفلاں زنے مرکب کنی" میں "بجائے "نے" کا ترجمہ "Reed" کرنے کے زنے کو اکٹھا پڑھ کر اس کا ترجمہ "Woman" کر ڈالا۔

مستشرقین کے بارے میں علامہ واضح نظریات رکھتے تھے۔ سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "مستشرقین کی غلطیوں کا کیا پوچھنا ہے۔ ان لوگوں کے چند ایک متعین نظریات ہیں اور چند ایک متعین مقاصد لہذا کوئی بھی مسئلہ ہو وہ اپنے مطلب کی رائے قائم کرتے ہیں۔" [4]

---

[1] بنام محمد جمیل ۱۸ فروری ۱۹۲۹ (اقبال نامہ حصہ دوئم ص ۹۰) [2] Goldziher

[3] بنام محمد جمیل ۴ مارچ ۱۹۳۰ (اقبال نامہ حصہ دوئم ص ۹۶) [4] بنام خواجہ غلام سیدین ۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ (اقبالنامہ حصہ اول ص ۳۲۱)

یہ بات بڑی حیرت ناک ہے کہ مسلمان اقوام میں جہاں کہیں تجدد پسند حضرات نے اسلام کی مرمت ضروری سمجھی ان کا قبلہ و کعبہ یہی مستشرقین رہے ہیں۔ ان کے بارے میں انتہائی طالب علمانہ نیازمندی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں کہ انیسویں صدی کے مستشرقین کے بارے میں غلامی کے دور میں اس طرح کا رویہ تھا، آج بھی جبکہ عالم اسلام سیاسی اعتبار سے آزاد ہو چکا ہے، مغرب کے مستشرقین کے بارے میں یہی رویہ پایا جاتا ہے۔ اس میں اضافہ یہ ہوا ہے کہ آج پورے عالم اسلام سے مسلمان طالب علم ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں۔ ان کے وظائف، مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم، وہاں کے مخصوص معیار بود و باش، ڈگریوں کی چمک اور اپنے ملک میں واپسی پر اعلیٰ درجے کی ملازمتیں اور اثر و رسوخ یہ سب چیزیں مل جل کر ہمارے طلبہ میں سے ذہین افراد کو علوم اسلامیہ کے اس انداز سے مطالعہ کی طرف راغب کر رہی ہیں جو مغربی مستشرقین کا ہے۔ چنانچہ آج ہر مسلم ملک میں ایسے فاضلینِ علوم اسلامیہ مل سکتے ہیں جو اسلام کی مرمت میں اپنے استادوں سے بھی زیادہ پیش پیش ہیں۔ اسلام کے بارے میں اظہار خیال کا کوئی بھی موقع ہو یہ افراد پیش پیش نظر آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں ابھی اتنا دم خم موجود ہے اور ہمارے علماء کا اثر و رسوخ ایسے افراد کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں انہیں کسی اسلامی موضوع پر حرفِ آخر نہیں سمجھا جاتا لیکن پھر بھی ایسے افراد کی روز افزوں بہتات اور ان کی سرکاری سرپرستی کے علاوہ بین الاقوامی مذاکروں اور فورموں (Forums) پر ان کی چہرہ نمائی کا اہتمام جس طرح کیا جا رہا ہے وہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مستقبل کے لیے خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی نہیں یہ افراد غیر ملکی استخبارات ـــ Intelligence --- کے لیے بھی انتہائی مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اس طرح ملک و قوم کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور بیرونی مفادات کو پروان چڑھانے کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف علوم اسلامیہ بلکہ دیگر معاشرتی علوم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے خود ملک ہی میں انتظام کیا جائے اور اس طرح ملک کے ذہین افراد کو ملت کے مفادات کی پاسداری کے عظیم کام کے قابل بنایا جائے۔

اقبالؒ کا نظریۂ علم

قرآن کریم نے علم کی جو تعریف کی ہے وہ یہی ہے کہ علم اپنے سمع بصر اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ پ ۱۵۔ ۴

"جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سمع بصر اور قلب، ہر ایک کی بابت پرسش ہو گی"۔

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطور علم تسلیم کیا تھا کیا تم نے اسے سماعت، بصارت کی رو سے تجربات و مشاہدات کے ذریعے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے قلبِ سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس ان ذرائع سے کام نہ لینے والوں کو قرآن حکیم نے جہنمی قرار دیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ پ ۹، ۱۳ پ ۱۷۔ ۵

"وہ لوگ دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ یہ تو بالکل ڈھور ڈنگر ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ان سے بھی زیادہ بے راہ رو"۔

علامہ نے علم کے مسئلہ پر اپنے ایک مکتوب میں روشنی ڈالی ہے۔ خواجہ غلام السیدین نے علامہ کا ایک خط نقل کیا ہے جو ان کے نام تھا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

In response to my request to elucidate the relationship of

knowledge gained through intellect and that gained through love or intuition. Iqbal wrote to me as follows :

میں نے یہ درخواست کی تھی کہ اس علم کا جو عقل کے ذریعے حاصل کیا جائے، اس علم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہوتا ہے جو وجدان یا عشق کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، علامہ اقبال نے اس کا جواب یوں تحریر فرمایا :

علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے "جاوید نامہ" میں لکھا ہے

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور
آخرِ ادمی نہ گنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامے میں کئی اشعار ہیں۔

علمِ بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے۔ "بولہب را حیدرِ کرار کن" اگر یہ بولہب حیدرِ کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسان کے لیے سراپا رحمت ہے"[1]

علامہ علم کو محض زندگی کی خارجی حقیقت نہ سمجھتے تھے بلکہ وہ اسے حفظِ خودی اور حفظِ زندگی کا سرمایہ تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک علم خارجی حقائق کو سمجھنے اور برتنے کا محض ذریعہ نہیں (نہ یہ زندگی کہ آسائشوں اور آرائشوں کو بہم کرنے کی مددگار قوت ہے

---

[1] (اوراقِ گم گشتہ ص ۴۸ - ۴۹)

اور نہ رزق حاصل کرنے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں سبقت لے جانے اور ہم عصروں میں ممتاز ہونے اور شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان کے نزدیک علم ان تمام پست تصورات اور مہمل خیالات سے بلند اور ارفع ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ نظم قوم آئین رسوم اور علوم کی تازگی کا راز کیا ہے۔ کیا یہ وہ آرزو ہے کہ اپنے ہی زور سے ٹوٹ کر پیدا ہوئی اور دل کے نہاں خانہ سے نکل کر ظہور پذیر ہوئی، ہاتھ، دانت، دماغ، آنکھیں کان، فکر، تخیل، شعور، یاد اور ہوش، زندگی کے عرصۂ جنگ میں محض آلات کی حیثیت رکھتے ہیں جو زندگی کی حفاظت کے لیے کام آتے ہیں علم و فن کا مقصود آگہی نہیں اور اس چمن کا مقصد محض غنچہ و گل نہیں۔ علم زندگی کی حفاظت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور تقویم خودی کے اسباب میں سے ہے۔ علم و فن کی حیثیت پیش خیزانِ حیات اور خانہ زادانِ حیات کی ہے علامہ لکھتے ہیں۔

چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم — چیست رازِ تازگیہائے علوم
آرزوئے کو بزورِ خود شکست — سر ز دل بیروں زد و صورت ببست
دست و دندان و دماغ و چشم و گوش — فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت — بہر حفظِ خویش ایں آلات ساخت
آگہی از علم و فن مقصود نیست — غنچہ و گل زیں چمن مقصود نیست
علم از سامانِ حفظِ زندگی است — علم از اسبابِ تقویمِ خودی ست
علم و فن از پیش خیزانِ حیات — علم و فن از خانہ زادانِ حیات [1]

علامہ علم و فن کے حصول کو سعیٔ رائیگاں نہ سمجھتے تھے بلکہ اسے زندگی کو جلا بخشنے والی اور تقویم حیات کا ذریعہ جانتے تھے۔ علم و فن اپنی جگہ بہت اہم سہی لیکن اگر ان سے قوت حاصل نہ ہو تو ان کی کوئی حیثیت نہیں یہی وجہ تھی کہ آپ نے فرمایا:

ص من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و تبر بیگانہ سازد مردِ غازی را

---

[1] کلیاتِ اقبال ص ۱۷

(میں اس علم و فراست کو گھاس کے تنکے کے برابر بھی نہیں سمجھتا جو مردِ غازی کو تیغ و تیر سے بیگانہ کر دے) جب مسلمانوں میں علم و فضل کا چرچا تھا تو صاحبانِ سیف و قلم کی کوئی کمی نہ تھی۔ امام ابنِ تیمیہؒ اپنے وقت کے علمی امام ہونے کے ساتھ ساتھ میدانِ جنگ کے بھی غازی تھے خود برصغیر میں سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسے افراد موجود رہے ہیں لیکن مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ایسے افراد پیدا ہونے بند ہو گئے۔ خود علمی میدان میں بھی انحطاط پیدا ہوتا گیا۔ علمی و تحقیقی کام کو مزید آگے بڑھانے اور علوم میں تازگی پیدا کرنے۔ نئے نئے دریچے وا کرنے کی بجائے مدون کرنے کا اور حواشی لکھنے کا کام رواج پانے لگا۔ سمع بصر اور فواد کی قرآنی تشریح سے بے نیازی دستور بنتی گئی۔ علامہ اقبال قوم کی اس روش کے خلاف تھے کہ جو علمی یا تحقیقی کام پہلے انجام پا چکا ہے، اسی پر حواشی لکھے جائیں اور اسی کو یا مختصر کر کے مدون کر دیا جائے یا اس کی تشریح میں دفاتر کے دفاتر لکھ دیئے جائیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے زوال کے دور میں یہ روش خاصی عام ہو گئی تھی۔ تحقیق کی آزاد اور کھلی فضا میں سانس لینے کا تصور دم توڑ چکا تھا۔ اس گھٹے ہوئے ماحول میں اقبال نے ایک نئی آواز بلند کی اور وہ یہ کہ مسائل کا حل افلاطون و فارابی کے بجائے قرآن میں غوطہ زن ہو کر اور اپنی خودی میں ڈوب کر تلاش کیا جائے۔ اقبال دوسروں کی دریوزہ گری کی بجائے خود اپنے ضمیر سے گہرہائے آبدار تلاش کرنے کا پیغام لے کر آئے تھے انہوں نے سعدی کے اس مضمون کی ہم نوائی کی کہ

؎ اے تماشا گاہِ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

پھر نئی تقلید کا نہج بھی مختلف تھا، یہ اپنے آباء کے قیمتی ورثے کے تحفظ اور اس کی تربیت و تدوین نہیں بلکہ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز پر آمنا و صدقنا کہنے کا دوسرا نام تھا۔ یہ تقلید قومی زندگی کے سرچشمے سے نہیں پھوٹتی تھی، اس کا منبع مغرب کے ازکار رفتہ اور فرسودہ نظام ہائے فلسفہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے ہمیں نئی راہوں پر چلنے کی تلقین کی اور یہاں تک کہا

؎ تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است[1]

وہ پرائی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے کورچشمی کو بہتر سمجھتے تھے اور کسی سے دریوزہ گری چشم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا

؎ میان آب و گل خلوت گزیدم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نہ کردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم[2]

وہ ان نام نہاد دانشوروں سے، جو دیگر اقوام کے نظام ہائے فکر و فلسفہ کو اپنا لینا اور اس کی اندھی تقلید کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اس نادان شخص کو کہیں بہتر سمجھتے ہیں جو اپنے بُرے بھلے کی تمیز کر سکتا ہے۔ وہ علم کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ اس کی محدودیت کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کہا

؎ عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں — ایک بھی صاحبِ سرور نہیں[3]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

ہزار بار بگو تر متاعِ بے بصری — ز دانشے کہ دل او را نمی کند تصدیق
بہ پیچ و تابِ خرد گرچہ لذتے دگر است — یقینِ سادہ دلاں بہ ز نکتہ ہائے دقیق
کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم — ضمیرِ خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق[4]

وہ اس تمام کلام و فلسفہ، علم و دانش کو جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے دین کی

---

[1] (کلیات ۲۲۹)
[2] (کلیات ۲۳۰)
[3] بالِ جبریل ۱۶۵)
[4] (کلیات ۵۰۵، ۵۰۶)

آگہی عطا نہیں کرتا محض بت و بت خانہ سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں

دانشِ مغرب بیاں فلسفۂ مشرقیاں
ہمہ بت خانہ و در طوفِ بتاں چیزے نیست[1]

وہ افرنگ کے بت کدوں میں کھو جانے والے افراد سے سخت شاکی تھے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے آباد کی میراث کو حاصل کریں اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر تحقیقات کے میدان میں گوئے سبقت لے جائیں۔ افرنگ کے سحر میں گرفتار ہونے والوں سے ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس دور میں ضربِ کلیمی سے کام لیں اور چوبِ کلیمی سے اس سحر جدید کے طلسم کو توڑ دیں۔

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم[2]

وہ شیخ حرم کی بے حسی کا گلہ کرتے ہیں لیکن انہیں اس سے زیادہ قوم کے ان افراد سے گلہ ہے جو فرنگی صنم خانے میں کھو چکے ہیں۔

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ دیوارِ مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

اسی مضمون کو اقبال فارسی میں یوں بیان کرتے ہیں

بہ افرنگی بتاں خود را سپردی
چہ نامردانہ در بت خانہ مردی
خرد بے گانۂ دل سینہ بے نور
کہ از تاکِ نیاگاں مے نخوردی[3]

(تو نے اپنا دل فرنگی بتوں کے حوالے کر ڈالا ہے تو بتخانے میں بزدلانہ موت مر گیا ہے۔ خرد دل سے بے گانہ ہے اور تمہارا سینہ بے نور ہے کیونکہ اپنے بزرگوں کے میخانے کی شراب تم نے نہیں پی)

علامہ کے دور میں مغربی افکار کے زیرِ اثر مسلمانوں میں شدید قسم کے احساس کمتری نے

---

[1] (کلیات ۵۱۲)
[2] بالِ جبریل ۸۸
[3] کلیات ص ۱۰۲۶

جنم لیا جو آج بھی تعلیم یافتہ طبقے کا سرمایہ ناز ہے۔ آج بھی کسی بات کے سند ہونے کے لیے یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کے منہ سے نکلی ہے جو مغرب میں پیدا ہوا تھا۔ مغرب کے مفکرین کے افکار، وہاں کی چھپی ہوئی کتابیں، رسالے، اخبارات، ریڈیو ٹیلی ویژن حتیٰ کہ فلمیں تک سب کچھ استناد ← authority ← کا درجہ رکھتی ہیں۔ مغرب کے ادنیٰ سے ادنیٰ مصنف کی کتاب ہمارے کتب خانوں کی زینت اور اس کے قلم سے نکلی ہوئی مہمل سی مہمل سطر کسی بھی مسئلہ پر حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ اپنے لکھنے والے کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاتا کہ وہ کوئی نئی اور اچھوتی بات بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے علامہ نے جب اپنے خیالات کا اظہار کیا تو ان کی فکر کے ڈانڈے برگساں، دانتے گوئٹے اور ہیگل سے لے کر کارل مارکس تک ہر مغربی فلسفی سے ملانے کی کوشش کی گئی۔ ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بھی انہیں شیلے اور بائرن کا ہم رتبہ قرار دینا ضروری سمجھا گیا۔ علامہ نے بارہا کہا کہ میری فکر کا ماخذ قرآن حکیم کے سوا اور کچھ نہیں لیکن یہ بات لوگوں کے جی کو نہ لگی اسی لیے آج علامہ کے انتقال کے نصف صدی بعد بھی اقبال کے مردِ مومن کو نٹشے کے فوق البشر کا چربہ ثابت کرنے کی کوشش میں سارا زورِ قلم صرف کیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فرنگی تعلیم کے اثرات کا سب سے مضر پہلو یہی ہے کہ وہ مفتوح قوم کے دل سے جذبۂ خود اعتمادی کو بالکل نیست و نابود کر دیتی ہے۔ اسی کیفیت کو اقبال نے شعر کی زبان میں یوں کہا تھا۔

؎ تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر

پھر جہاں مغرب کے تعلیمی نظام نے شدید قسم کی احساس کمتری پیدا کی وہاں علم کے معاملے میں انتہائی سطحی اور غیر حقیقت پسندانہ نظریے دیئے۔ مغرب میں سائنس اور مذہب (محدود معنوں میں) کے تصادم کے نتیجے میں علم کے بارے میں انتہائی غلط تصورات نے جگہ پا لی تھی۔ مسلمان اپنے دورِ عروج میں علوم اور مذہب کو ایک ساتھ

لے کر چلے تھے. یہ دو الگ چیزوں کے نام نہ تھے بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو تھے. دوسری طرف مغرب میں اہل سائنس کو قدم قدم پر عیسائیت سے تصادم کا سامنا رہا جس کی وجہ سے اہل سائنس سرے سے مذہب ہی کے دشمن ہو گئے. اگر وہ علوم اسلامیہ اور مسلمان سائنس دانوں کی تحقیقات سے آگاہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیمات کا بغور مطالعہ کرتے تو وہ ان غلط نتائج پر نہ پہنچتے، علامہ فرماتے ہیں:

"مذہب فلسفہ، طبیعات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں. مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر پرکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی"

ڈاکٹر ولیم جان ڈریپر کی مشہور و معروف کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" (ترجمہ از مولانا ظفر علی خان) اصل میں مذہب اور سائنس کا ہنگامہ آرائی کی مظہر نہیں بلکہ عیسائیت اور سائنس کے تصادم کی تاریخ ہے. اس تصادم کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے علماء و حکماء مسلمانوں کی علمی ترقی سے متاثر ہوئے تو اہل فرنگ کے خیالات میں زبردست انقلاب پیدا ہونے لگا اور رومن کیتھولک مذہب والے اس علمی انقلاب سے متصادم ہوئے. ڈاکٹر ڈریپر نے اسی انقلاب کی تاریخ لکھ دی.

سائنس اور مذہب کے تصادم کا خیال غیر اسلامی ہے قرآن کریم کے ہر صفحہ پر انسان کو مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعے علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے. اور منتہائے نظریہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے. چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے مسلمانوں میں فرقہ معتزلہ اور دیگر فرقوں کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہوا تھا وہ اس قسم کا نہ تھا جو یورپ کے روشن دماغ علماء اور تاریک خیال پادریوں کے

درمیان پیدا ہوا بلکہ وہ تو ایک علمی بحث تھی، جس کا موضوع محض یہ تھا کہ آیا ہمیں الہامی کلام ربانی کو عقل انسانی کے معیار پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔[1]

علامہ نے ایک اور جگہ علم کے ذرائع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سمع، بصر اور قلب کو تین بنیادی ذرائع قرار دیا ہے اور قرآن حکیم کی آیت سے اس کا استخراج کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں نے سمع و بصر کے ذرائع کو ہاتھ سے چھوڑ کر غفلت کا ثبوت دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۶ : ۳۰)

اس آیت میں حصول علم کے ذریعوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ذریعہ تو سمع و بصر ہے اور ذریعہ انسان کا قلب ہے یعنی یہ نہ ہو کہ سمع و بصر کو چھوڑ کر کلی طور پر قلب کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور ایسا بھی نہ ہو کہ قلب سے غافل ہو کر یورپ والوں کی طرح بالکل سمع و بصر کے ہو رہو۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات قلب پر مرتکز کر دیں اور سمع و بصر سے پورا کام نہ لیا۔ بلکہ ساری ایشیائی تہذیب کا خاصہ یہی ہے .....[2]

جہاں سائنس سمع و بصر کے میدان میں کام کرتی ہے وہاں دین قلب کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس طرح ان تینوں کے امتزاج سے علوم و فنون کی دنیائیں ظہور پذیر ہوتی ہیں یہ تینوں صلاحیتیں یعنی سمع و بصر اور نتائج کا استنباط یعنی اس پر سوچ بچار جو قلب کا خاصہ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک جواب دہی کے مکلف بھی ہیں۔ ایک اور جگہ قرآن پاک میں واضح طور پر کہا ہے:۔

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

یعنی سمع بصر اور قلب تینوں کا حساب لیا جائے گا۔ یہ تینوں صلاحیتیں انسان کی گمراہی اور تباہی کا سبب بھی بن سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا حساب لیا جائے گا۔

---

[1] گفتارِ اقبال ص ۲۳
[2] گفتار اقبال ص ۲۴ - ۲۵

علمِ کلام

علامہ علم کو بولہب سے حیدر کرار کی منزل پر پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو اسلام کی خدمت کے لیے صرف کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے اپنی تمام تر علمی صلاحیتوں کو بھی اسی کام میں صرف کیا۔

علامہ یہ چاہتے تھے کہ اسلام اور اس کے اصولوں کا زمانۂ حال کے مسائل کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے۔ تاہم ان کا یہ خیال ان مغرب پرستوں سے بالکل مختلف تھا جو اسلام کی تاویل اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ مغرب مستشرقین کے اعتراضات رفع کیے جائیں یا اسلام کو 'ماڈرن' ثابت کیا جاسکے۔ جہاں ان حضرات کا رویہ معذرت خواہانہ تھا وہاں اقبال اس مسئلہ کو بالکل دوسری روشنی میں دیکھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے اور اسلامی عقائد کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جائے۔ سید سلیمان ندویؒ تاریخ کے پس منظر میں علامہ کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں۔

"قدیم زمانے میں جس طرح فلسفہ و سائنس کے مسائل عقلی دلائل سے ثابت کیے جاتے تھے بعینہٖ اسی طرح ہمارے متکلمین نے اسلامی عقائد مثلاً وجود باری، توحید، نبوت اور حشر و نشر وغیرہ کا اثبات عقلی دلائل سے کیا۔ لیکن ان دلائل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ توحید نبوت اور رسالت کے عملی نتائج اس دنیا میں کیا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالی اور امام رازی وغیرہ نے اس روش کو چھوڑ کر نظری و عملی نتائج سے نبوت اور رسالت کا اثبات کیا۔ ہمارے صوفی شعراء بالخصوص حکیم سنائیؒ اور مولانا رومیؒ نے شاعرانہ و خطابی دلائل سے ان مسائل کے طریقہ اثبات کو زیادہ مؤثر، دلنشیں اور قریب الفہم بنا دیا۔ اس لیے موجودہ دور میں یہ طریقۂ اثبات کافی نہیں ہوسکتا۔ یہ زمانہ ایک نئے تمدن و تہذیب کی ترقی کا زمانہ ہے۔ اور اس زمانہ میں کسی مسئلہ کی صرف نظری حیثیت پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی بلکہ عملی حیثیت سے ان کے نتائج و مظاہر پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس زمانے میں سائنس کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ نہایت آسانی سے ہوا کو پانی اور پانی کو ہوا بنا دیتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیا کی تمام کل سائنس ہی کی بدولت چل رہی ہے ڈاکٹر اقبال کی شاعری نے اسی تمدن، اسی تہذیب اور اسی فضا میں

بال و پر کھولے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اسلامی عقائد کا اثبات زیادہ تر ان کے عملی نتائج سے کیا ہے اور خودی کا جو فلسفہ ان کا مخصوص فلسفہ ہے۔ اس سے انہوں نے ان مسائل کی تشریح و اثبات میں بھی کام لیا ہے۔ اس لیے ان کا طرز بیان قدیم علمائے کلام اور قدیم متکلم صوفی شعراء کے انداز بیان سے زیادہ اس زمانے کے رجحان و مذاق کے مطابق ہے۔"[1]

علامہ نے جہاں خود اسلام کو جدید دور کے علم کلام کی روشنی میں پیش کیا۔ وہاں وہ اس بات کے شدت سے قائل تھے کہ قدیم حکمائے اسلام کی تشریحات کو پیش نظر رکھنا اور عربی زبان و ادب پر عبور حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ انہوں نے ایک جگہ اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ برصغیر سے عربی ادب کا ذوق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اہم خصوصیت کے بغیر اسلام کے میدان میں تحقیق کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ امر دلچسپی کا موجب ہوگا کہ دورِ حاضر میں جن افراد نے اسلام کے معاملے میں ٹھوکر کھائی ہے ان کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ عربی زبان و ادب سے بے بہرہ ہے پھر قدیم مفسرین قرآن اور دوسرے مصنفوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اس دور میں قطعاً مدد نہیں دے سکتے ایک بے بنیاد مفروضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ کے خیالات اس بارے میں بالکل واضح ہیں وہ سید محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانۂ حال کی روشنی میں مطالعہ کیے جانے کا محتاج ہے۔ پرانے مفسرین قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے مگر ان کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی۔ میری رائے میں بہ حیثیت مجموعی زمانۂ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حکماء میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمۃ۔ مفسرین میں معتزلی نقطۂ خیال سے زمخشری، اشعری نقطۂ خیال سے رازی اور زبان و محاورہ کے اعتبار سے بیضاوی۔ نئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر

---

[1] مقالاتِ یوم اقبال، قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۱۴-۱۵

عربی زبان میں اچھی دستگاہ پیدا کر لیں تو اسلام کے Re-interpretation میں بڑی مدد دے سکیں گے۔ میں نے اپنی تصانیف میں ایک حد تک یہی کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشاء اللہ اس پر نثر میں بھی لکھوں گا۔" [1]

بیسویں صدی کی ابتداء میں انسانیت پرستی "Humanitarianism" کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا گیا اور یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ تمام مذاہب اس نصب العین کی راہ میں رکاوٹ ہیں کیونکہ یہ انسانی گروہوں کو مذہب کی بنیاد پر منظم کرتے ہیں اور اس طرح انسانیت پرستی کے مقصد کے حصول کو غیر ممکن بنا دیتے ہیں۔ یہ نیا فلسفہ انیسویں صدی کی عقلیت پرستی Rationalizm کی بنیادوں پر استوار ہوا تھا اور اسے پھیلانے میں یہودی ذہن کارفرما تھا۔ ہندوستان میں اینی بینٹ (Annie Besent) جو ہندوستان میں متحدہ قومیت کو فروغ دینے اور کانگریس کو ذہنی بنیادیں فراہم کرنے میں پیش پیش تھی خود یہودی تحریک سے تعلق رکھتی تھی۔ اور فری میسن تنظیم (Freemasons) کی رکن تھی۔ اسی دور میں یہ خیالات برطانوی حکومت کی پشت پناہی سے تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیلائے جا رہے تھے اور مسلمانوں میں سے بھی خاصے افراد ان خیالات سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگے تھے کہ شائد اسلام بھی نوعِ انسانی کے اتحاد کا دشمن واقع ہوا ہے۔ اگر حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی تو یہ واضح ہو جاتا کہ نام نہاد انسانیت پرستی کے دعوے دار درحقیقت قومیت پرستی اور نسلیت پرستی کے بتوں کی پرستش سے باہر نہیں نکل سکے۔ اسلام ہی دنیا کا واحد مذہب ہے جو نوعِ انسانی کو اخوت کے رشتوں میں پیوستہ کرنے میں عملی طور پر کامیاب و کامران رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اقبال نے جا بجا اس مسئلہ پر اپنے اشعار میں روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام انسانیت کی وحدت کا موجب ہے نہ کہ افتراق و انتشار کا۔

سید الدین جعفری صاحب ہی کے نام خط میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک اسلام نوعِ انسانی کی اقوام کو جغرافی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و

---

[1] رفیع الدین ہاشمی ۱۶۳-۱۶۵

قومیت کی مصنوعی مگر ارتقاء انسانی کے ابتدائی مراحل میں مقید و امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اور مذاہب (یعنی مسیحیت، بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لیے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ ابتدا میں میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی کر دی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے جس کو ہم ایک ناگزیر زشتی سمجھ کر گوارا کرتے ہیں آپ Pan Islam کو ایک پولیٹیکل یا قومی تحریک تصور کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ طریق چند اقوام انسانی کو جمع کرنے اور ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے۔ اس فرض سے ایک مرکز خوشنودی پر مجتمع ہو جانے اور ایک ہی قسم کے خیالات رکھنے اور سوچنے کے باعث یہ اقوام نسلی اور ملکی امتیازات و تعصبات کی لعنت سے آزاد ہو جائیں گی۔ پس اسلام ایک قدم ہے نوعِ انسانی کے اتحاد کی طرف۔ یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ پس جو کچھ میں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں اس سے میری غرض محض خدمتِ بنی نوع ہے اور کچھ نہیں اور میرے نزدیک عملی نقطۂ خیال سے صرف اسلام ہی Humanitarian Ideal کو Achieve کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ باقی ذرائع محض فلسفہ ہیں خوشنما ضرور ہیں لیکن ناقابل عمل۔ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خالص اسلامی حقائق پر لکھنے اور ان کو نمایاں کرنے سے ہندوستان کی اقوام میں باہمی عناد بڑھتا ہے۔ اس بات میں میں آپ سے متفق ہوں کہ مسلمانوں کو محبت کا طریق اختیار کرنا چاہیے۔ نبی کریم کی حدیث ہے کہ مسلمان دنیا کے لیے سراپا شفقت ہے مگر اس اخلاقی انقلاب کو حاصل کرنے کے لیے بھی یہی ضروری ہے کہ اسلام اپنی اصلی روشنی میں پیش کیا جائے۔ میرا ذاتی طریق یہی

ہے کہ میں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں گو یہ احترام مجھے ایسی تنقید سے باز نہیں رکھ سکتا جس کی بنا دیانت پر ہو اور جس میں سوائے خلوص کے اور کچھ نہ ہو۔ غرضیکہ میرا عقیدہ یہ ہے اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس وقت اقوام انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے اور جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتاً للہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے اور اگر دماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوع انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے۔ مسلمانوں کو تو سیاسیات سے پہلے اشاعتِ اسلام کا کام ضروری ہے تاہم دونوں کام ساتھ ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔[1]

علامہ جہاں مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں انقلاب اور انہیں سیاسی اعتبار سے ایک اہم قوت کی حیثیت سے ابھرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے وہاں ان کی خواہش یہ بھی تھی کہ مسلمان علمی اعتبار سے اقوام عالم میں نمایاں مقام حاصل کریں۔ علمی امامت Intellectual Leadership کا بلند منصب جو مسلمانوں کی غفلت شعاری کے نتیجے میں ان سے چھن گیا ہے، اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں علامہ نے جہاں کہیں کوئی جوہر قابل دیکھا اسے علم کے میدان میں سبقت لے جانے کی طرف توجہ دلائی اور یہ کوشش کی کہ اس کی ہر ممکن مدد کریں۔ علامہ کے خطوط سے جو اقبال نامہ کے نام سے دو جلدوں میں چھپ چکے ہیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے طالب علموں کی ذہنی تربیت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

علامہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے علمی ورثہ سے جو یورپ کے کتب خانوں میں جا پہنچا ہے استفادہ کریں اور اس علمی خزانے کے لٹ جانے پر انہوں نے جس دردمندی سے نوحہ کیا ہے اس سے ان کی علمی دلچسپیوں اور بے پناہ جذبے کا حال کھلتا ہے آپ لکھتے ہیں۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا

---

[1] خطوطِ اقبالؒ از رفیع الدین ہاشمی ص ۱۶۵-۱۶۷

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
انہیں یورپ میں گر دیکھیں تو دل ہوتا ہے سی پارا

"غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را"

علم کے میدان میں علامہ علم کو ایک وحدت سمجھتے اور اسی نقطہ کی نظر سے مسائل کا مشاہدہ کرتے تھے۔ انہیں علوم میں تفریق کرنے اور انہیں الگ الگ حیثیتوں میں دیکھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ کو تاریخ اور فلسفہ سے لے کر مابعد الطبیعات اور معاشیات سے لے کر فقہ اور منطق تک ہر میدان سے دلچسپی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ بنیادی طور پر اسلامی علوم کے میدان میں تحقیق کا جذبہ رکھتے تھے لیکن ان کا نقطہ نگاہ آفاقی تھا۔ علوم و فنون کی ہر جہت سے ان کو لگاؤ تھا اور وہ ان میں کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔

اقبالؔ فلسفہ اور تاریخِ اسلام

علامہ اس بات کے شاکی تھے کہ یونانی فلسفے کے زیر اثر مسلم مفکرین نے قرآن حکیم کی صحیح تعلیمات کو نگاہ سے اوجھل کر دیا۔ آپ نے تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے پہلے خطبے میں فرمایا ہے "سقراط نے اپنی تمام تر توجہ انسان پر مرتکز کیے رکھی اس کا خیال تھا کہ انسان کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے انسان ہی کا مطالعہ کافی ہے اس کی نگاہ میں نباتات، حشرات الارض اور ستاروں کی دنیائیں نہ تھیں۔ یہ بات قرآن حکیم کی تعلیمات کے بالکل منافی تھی۔ یہاں تو شہد کی مکھی کو الہام خداوندی عطا کیے جانے سے لے کر ہواؤں کے تغیّر و تبدّل، دن رات کے الٹ پھیر، بادل، کہکشاں اور لامتناہی خلاء میں تیرتے ہوئے سیاروں تک ہر چیز تفکر و تدبّر کے لیے توجہ دلاتا ہے۔[1]

اسی طرح افلاطون نے محسوسات کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جبکہ قرآن حکیم سمع اور بصر دونوں کو بے حد اہمیت دیتا ہے[2] قرآن حکیم نے سائنسی نقطۂ نظر اختیار کرنے اور ذات خداوندی کے بارے میں خشک علمی مباحثوں سے توجہ ہٹانے کی تلقین کی ہے۔ اس سے یہ مفہوم اخذ کرنا غلط ہو گا کہ قرآنِ پاک روحانی معاملات سے صرف نظر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادہ اور روح میں تضاد کا تصور نہیں۔ روح کی نشو و نما کے لیے مادی دنیا کو ترک کر دینا قطعاً ضروری نہیں۔ قرآن حکیم نے کہیں مادے اور روح کے تضاد کا ذکر نہیں کیا۔ اقبال فرماتے ہیں" اس دنیا کو کہیں بھی غیر مقدس یا ناپاک تصور نہیں کیا گیا ہم اس

---

(۱) ڈاکٹر سر محمد اقبال تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (انگریزی)، لاہور، ۱۹۶۲ء ص ۳ [2] ایضاً ص ۴ [3] ڈاکٹر سر محمد اقبال فارس میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء (انگریزی)، لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۱۵۵ [4] تشکیل جدید الہیات (انگریزی) ص ۱۲۸ [5] ایضاً ص ۱۳۱

مادی دنیا کے اندر رہتے ہوئے روحانی ارتقاء کی منازل طے کر سکتے ہیں۔ یہ دنیا پاک زمین کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے انتہائی خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا ہے "تمام روئے زمین کی حیثیت ایک مسجد کی سی ہے" ۳ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے کہیں بھی اس مادی دنیا کو ناپاک قرار نہیں دیا بلکہ اس کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرنے اور تفکّر و تدبر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ قرآن پاک ہمیں سورج، چاند، ستاروں عرض کائنات میں پھیلے ہوئے بے شمار مظاہر کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ یہ کائنات حرکت پذیر ہے۔ اس میں جمود نہیں اور یہ ہر لحظہ نشوونما کے مراحل سے گذر رہی ہے۔ مسلمان فلاسفر نے جب یونانی فلسفے کا مطالعہ کیا تو انہیں اس کی تعلیمات اور قرآن حکیم میں تضاد نظر آیا۔ انہوں نے قرآن حکیم کی روح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور یونانی فلسفے کو قرآن کی آیات پر منطبق کرنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ کوشش ناکام رہی کیونکہ قرآن پاک کی روح یہ ہے کہ وہ ٹھوس مادے کے وجود کو نہ صرف تسلیم کرتی ہے بلکہ اس کے نشوونما کی قائل ہے جبکہ یونانی فلسفہ محض تصورات پر اعتماد رکھتا ہے اور حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے یوں ہماری تہذیب کی اصل روح کئی اہم پہلوؤں میں عصر جدید کی روح سے نزدیک ہو جاتی ہے ۴ اقبال مزید کہتے ہیں کہ اسلام کی تجرباتی روح محض خالی بے روح فلسفے سے گریز اور حقائق پر نظر در حقیقت یونانی فلسفے سے اختلاف اور اس سے طویل علمی کشمکش کا نتیجہ تھا نہ کہ اس سے انطباق کی پیداوار ۵

علامہ اقبال کو مسلم فلسفہ اور اس کے ارتقاء سے جو دلچسپی تھی اس کے بارے میں ان کے خطوط اور کلام میں خاصے شواہد ملتے ہیں اس میں شک نہیں کہ آخری زمانے میں فلسفہ اور مابعد الطبیعات کے بارے میں ان کا پہلا سا جوش و خروش ختم ہو گیا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے تاہم اس میدان میں ان کی دلچسپی بدستور موجود تھی۔ ڈاکٹر ظفر الحسن مرحوم صدر شعبۂ فلسفہ علی گڑھ یونیورسٹی کی کوششوں کی وجہ سے علی گڑھ کے مسلم طلبہ میں فلسفۂ اسلامی کے بارے میں خاصا ذوق و شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہاں کے فلسفہ سوسائٹی کے سیکرٹری فضل کریم صاحب نے جب علامہ کو مسلم فلسفیانہ لٹریچر کی تاریخ

لکھنے اور اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے لکھا تو آپ نے جواب دیا:

"آپ کے احباب کو معلوم ہے کہ گذشتہ تین برس سے میں ایک معذور شخص کی سی زندگی گذار رہا ہوں اور حال ہی میں ڈاکٹروں نے مجھے لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا ہے کیونکہ میری بینائی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا آپ نے اپنے خط میں جس کام کا تذکرہ کیا ہے میرے لیے اس کا بیڑہ اٹھانا ممکن نہیں ہے۔ مسلم فلسفیانہ لٹریچر بہت وسیع ہے اور یورپ کی لائبریریوں اور عالم اسلام میں بکھرا ہوا ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ پرنس کتانی جیسا متمول شخص ہی مسلم افکار کی تاریخ لکھ سکتا ہے۔ مسلم فلسفیانہ لٹریچر کا معتدبہ حصہ مخطوطات کی شکل میں ہے اور اس کا سراغ لگانے کا کام ابھی باقی ہے۔ گذشتہ تین برسوں کے دوران میں مسلم دنیا فکری سطح پر انتہائی غیر فعال رہی ہے۔ اس کے بیشتر اسباب سیاسی ہیں۔ آج ہمیں احیائے نو کی جو علامات دکھائی دے رہی ہیں ان کے پیش نظر امید ہے کہ جس نوع کی تحقیقات آپ کو مطلوب ہیں، اس کے شایان شان علمی صلاحیتوں کا بتدریج ظہور ہوگا۔ ہندوستان میں حالات قدرے مختلف ہیں۔ عربی کا علم بتدریج ختم ہو رہا ہے اور مسلم تعلیمی ادارے اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ سنسکرت میں فلسفیانہ لٹریچر اس قدر منتشر نہیں جتنا عربی میں بکھرا ہوا ہے اور ہندو قوم اپنی دولت کے بل بوتے پر فلسفیانہ مطالعے کی عیاشی کی متحمل ہو سکتی ہے ذاتی طور پر میری خواہش ہے کہ ہمارے نوجوان عالم خود کو مسلم ریاضی، طبیعیات، کیمیا، تاریخ اور فقہ کے مطالعے کے لیے وقف کر دیں۔ علم کی متذکرہ بالا شاخوں کا مطالعہ ہی آج کی اشد ضرورت ہے اور اسلام کا بہترین مفاد بھی اسی میں مضمر ہے۔ محض اسی صورت میں آج کا مسلمان جدید علم کی بنیادوں سے آشنا ہو سکے گا اور ہم انہیں جدید مسائل کی معنویت کو سمجھنے کے قابل بنا سکیں گے۔

تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کے دوستوں کو زیادہ تر مابعد الطبیعیات ہی سے دلچسپی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو مسلم افکار سے متعلق ہندوستان میں کافی لٹریچر موجود ہے کچھ عرصہ پہلے مجھے یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ مسئلہ زماں کے بارے میں تازہ ترین کتاب ۱۹۲۴ء میں ہندوستان میں چھپی تھی۔ یہ کتاب عربی میں تھی۔ اگر آپ مسلم افکار میں دلچسپی رکھتے

ہوں تو آپ یونیورسٹی حکام کو اس بات پر قائل کریں کہ ابھی عربی میں مزید مطالعے اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ کسی سال پہلے میں نے مسلم یونیورسٹی کے سامنے ایک منصوبہ رکھا تھا کہ اسلامی علمی درجے پر تحقیقی کام کے لیے علماء تیار کیے جائیں۔ بدقسمتی سے میری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

میں آپ سے یہ حقیقت چھپانا نہیں چاہتا کہ جدید مابعد الطبیعات کے تیس سالہ مطالعے کے بعد میرا وہ جوش اور ولولہ ختم ہو گیا جو جوانی کے زمانے میں فلسفہ نے میرے اندر پیدا کر دیا تھا۔ تاہم خرابی صحت کی اس حالت میں بھی، میں کسی حد تک ایک نوجوان محقق کے کام آ سکتا ہوں اور ان مسائل کی تفہیم میں اس کی مدد بھی کر سکتا ہوں جنہوں نے ہمارے آباء کے دلوں کے اندر ولولہ پیدا کیا تھا۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ایسا عالم عربی میں اچھی قدرت رکھتا ہو اور مجھ مریض کے پلنگ کے پاس بیٹھنے کے لیے کچھ وقت بھی نکال سکے۔"[1]

علامہ کا خیال تھا کہ عالم اسلام میں سیاسی بے چینی دور ہونے اور آزادی حاصل ہونے کے بعد فلسفیانہ مباحث پر غور و فکر کا دروازہ کھلے گا علامہ دنیائے اسلام میں فلسفہ کے ارتقاء کے بارے میں گہری سوچ رکھتے تھے اور مختلف علمی کاموں سے آگاہی حاصل کرتے رہتے تھے[2]

نوٹ: دوسری گول میز کانفرنس (لندن ۳۲، ۱۹۳۱) سے واپسی پر اقبال چند روز کے لیے اٹلی میں ٹھہرے اس دوران میں پرنس کتانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ آپ نے فرمایا "جب میں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی کیوں ہے تو انہوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔

---

[1] خطوطِ اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۲۹۲-۲۹۵

[2] گفتارِ اقبال ص ۱۵۳

جب پروفیسر میاں محمد شریف صاحب نے (جنہوں نے مسلم فلسفہ کے میدان میں نہایت اہم کارنامے سرانجام دیئے ہیں) علامہ اقبال سے دنیائے اسلام میں فلسفہ کے ارتقاء کے بارے میں خط میں پوچھا تو علامہ نے انہیں جواب میں لکھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ دنیائے اسلام بالخصوص مصر و ایران میں Intellectual activity ---------- ہے اور فلسفہ اب بھی دینیات کے ساتھ ساتھ زیر مطالعہ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے مکاتب میں جو اب تک پرانی روش پر قائم ہیں مغربی فلسفہ پڑھایا جاتا ہے یا نہیں۔ فلسفۂ حال کی بعض کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ مثلاً نیٹشے کی ایک تصنیف کتاب الفجر کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ کسی شخص نے میسوپوٹیمیہ میں اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن اب تک یہ کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔ جہاں تک مجھے علم ہے علماء نے فکرِ اسلامی کو فلسفۂ عہد حاضر کی روشنی میں از سرِ نو ترتیب دینے کی کوئی کوشش نہیں فرمائی۔ لیکن دنیائے اسلام کو جو حوادث پیش آ رہے ہیں ان کی بنا پر یقین ہوتا ہے کہ اس طرف ضرور توجہ ہو گی۔ خلافت کی تنسیخ نے مصر کے بعض مفکرین کو مسئلہ آئین پر قرآن کریم کے مطالعہ کی طرف راغب کیا ہے۔ جب اسلام کی سیاسی بے چینی دور ہو چکے گی تو فلسفیانہ مسائل بھی زیر بحث آئیں گے۔"[1]

علامہ کی فلسفہ سے دلچسپی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ آپ کا محبوب موضوع تھا اور اس میدان میں جہاں آپ کی مغرب کے نظام فلسفہ پر گہری نظر تھی وہاں آپ نے مسلم فلسفہ کا بھی تفصیل سے مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ذہن پر کبھی بھی مغرب سے مرعوبیت کی پرچھائیں نہیں پڑی۔ پھر آپ محض مغربی فلسفہ ہی نہیں بلکہ سائنس کا مطالعہ بھی رکھتے تھے اس طرح آپ کا ذہن علم کی مختلف جہتوں کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ حفیظ ہوشیار پوری صاحب کو فلسفہ اور سائنس کے موضوع پر علامہ کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔

وہ لکھتے ہیں کہ "میں گورنمنٹ کالج کی مجلس فلسفہ کے لیے "بیسویں صدی میں فلسفہ اور سائنس کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ رہا تھا۔ چند کتابیں پڑھنے کے بعد مزید استفادہ کے

---

[1] بنام پروفیسر میاں محمد شریف، اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۳۴ - ۲۳۵)

لیے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔"

میں نے جدید سائنس کے فلسفیانہ اور روحانی رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اس "روحانیت" کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو مغرب کے موجودہ سائنس دانوں خصوصاً سر آرتھر اڈنگسٹن اور سر جیمز جینز کی تحریروں سے منسوب کی جاتی ہے اور کیا موجودہ سائنس واقعی مذہب کی طرف آرہی ہے؟

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہمیں ان حالات سے خوش نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ سائنس انیسویں صدی کی سائنس کے خلاف جس کی بنیاد میکانیت پر تھی، ایک ردعمل ہے چونکہ مادہ کی ماہیت کے متعلق اب سائنس کا نظریہ بدل گیا ہے اس لیے موجودہ انقلاب کو بعض لوگ "روحانیت پرستی" پر محمول کرتے ہیں۔ ممکن ہے مادہ کے متعلق پھر ہمارا نظریہ بدل جائے اور "روحانیت آمیز" خیالات کی یہ عارضی روخس وخاشاک کی طرح بہہ جائے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقات کے انتہائی مراحل پر سائنس کا حیرت واستعجاب سے دوچار ہو کر فلسفہ اور روحانیت کے دامن میں پناہ لینا اس کے اعترافِ عجز وشکست کی دلیل ہے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے حقیقت کو پا لیا ہے۔ جہاں سائنس ختم ہوتی ہے وہاں سے فلسفہ شروع ہوتا ہے اور حیرت واستعجاب جو سائنس کا انجام ہے فلسفہ کا آغاز ہے۔ جو کوئی نئی بات نہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک لطیفہ بھی ارشاد فرمایا جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جب میں نے عرض کیا کہ جیمز جینز قادرِ مطلق کو ایک بہت بڑے ریاضی دان سے تشبیہ دیتا ہے، اور اس کے نزدیک یہ عالمِ امکاں ایک ریاضی کے مسئلے کی مانند ہے جو اس کے ذہنِ لامحدود کی تخلیق ہے تو آپ نے ہنس کر جواب دیا کہ اس طرح آپ بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا شاعرِ مطلق ہے اور یہ دنیا جو اس کی تخلیق ہے ایک ایسی نظم ہے جس کا مطلع اور مقطع ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ کچھ عرصہ بعد اسی مجلس کے لیے میں ایک اور مقالہ تیار کر رہا تھا جس کا موضوع تھا "فلسفہ جدید میں قدر کا تصور" The concept of value in modern philosophy اس مقالے کے بیشتر حصے کی بنیاد میرے پہلے مقالے

پر تھی، لیکن مختلف کتابوں کے مطالعہ کے بعد بھی قدر یعنی، value ، کی ماہیت میرے لیے ایک معمہ تھی، خصوصاً یہ مسئلہ کہ " قدر " کا وجود " خارجی " ہے یا " داخلی " ۔ اس کے متعلق متضاد نظریے میری نظر سے گذرے تھے اور میں کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ شکوک رفع کرنے کے لیے پھر علامہ سے رجوع کیا۔

میں نے اس مسئلے پر دو نظریئے پڑھے تھے۔

(۱) " قدر " ایک خارجی حقیقت کے انکشاف کا نام ہے جس کا منبع، نفس انسانی، کی حدود سے باہر ہے۔

(۲) " قدر " نفس انسانی کی تخلیق ہے اور اس سے باہر اس کا وجود نہیں۔

پروفیسر رادھا کرشن نے جو پہلی بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ ان متضاد نظریوں کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

(۱) " قدر " اس حقیقت کے انکشاف کا نام ہے جس کا منبع روح مطلق ہے۔

(۲) " قدر " نفس غیر مطلق کی استعداد کا انتہائے کمال ہے۔ میں نے علامہ مرحوم سے دریافت کیا کہ اس مسئلے پر آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

آپ نے جواب دیا دونوں نظریے درست ہیں۔

میں نے کہا وہ کس طرح؟

آپ نے فرمایا کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور تصویر ان میں سے کسی ایک کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ " قدر " کا وجود بیک وقت " خارجی " اور " داخلی " ہے۔ اور اس کو محض " خارجی " یا محض " داخلی " تصور کرنے کی بنیاد اس غلطی پر ہے جس میں مغرب اور مشرق دونوں شریک ہیں۔ کوئی خالص " مادی " یا کوئی خالص " روحانی " نقطہ نظر " قدر " کی ماہیت کی تسلی بخش تشریح نہیں کر سکتا۔ فلسفے کی یہ روایت ہے کہ وہ عام طور پر " روح " اور " مادہ " دونوں میں سے ایک کو حقیقت تصور کر کے دوسرے کو " سراب " سمجھ کر ترک کرتا رہا ہے حالانکہ دونوں کے امتزاج کا نام " حقیقت " ہے۔ یہی روایتی غلطی مسئلہ " قدر " پر بھی اثر انداز ہوئی ہے اور اسی لیے دو متضاد نظریے پیدا ہو گئے ہیں۔ " قدر " کا سرچشمہ

خارجی ہے لیکن اس کی تخلیق میں انسانی استعداد کا بہت بڑا حصہ ہے. آپ دیکھیں گے کہ کوئی دو آرٹسٹ بعینہٖ ایک ہی چیز نہیں بنا سکتے. دونوں کے عمل سے اپنی اپنی انفرادیت Individuality نمایاں ہو گی. اس کے برعکس دو سائنس دانوں کے لیے اپنے اپنے مشاہدات و تجربات سے ایک ہی قانونِ فطرت اخذ کرنا ممکن ہے. پھر جدید سائنس کی روشنی میں اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ دنیا ایک اتفاقی ظہور ہے یا اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے. مجھے اس کے متعلق سر جیمز کے نظریوں میں تضاد نظر آتا تھا. اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے علامہ سے کہا کہ جیمز کے نزدیک ایک طرف تو دنیا کسی مقصد کے پیشِ نظر پیدا کی گئی ہے کیونکہ وہ خلاق Creator کا قائل ہے اور جہاں خلاق کا تصور ہو گا وہاں مقصد کا ہونا ضروری ہے. لیکن دوسری طرف وہ اس عالمِ امکاں کی ہیبت ناک وسعتوں میں انسان کو "اسٹرونومی" کی رو سے ایک نہایت ہی غیر اہم اور بے بس چیز تصور کرتا ہے. "غیر محدود قوتِ تخلیق" کا عقیدہ رکھنے کے باوجود اس کا یہ نظریہ نہایت مایوس کن ہے.

اس تضاد کے متعلق آپ نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کی متضاد باتیں تمام موجودہ سائنس دانوں کے ہاں پائی جاتی ہیں. اور کہا کہ اسٹرونومی کا مطالعہ واقعی انسان کو پست ہمت کر دیتا ہے. میں ہمیشہ نوجوانوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔"[1]

علامہ جہاں فلسفہ اور سائنس کی روایات سے انتہا درجے کا شغف رکھتے تھے، وہاں ان کا اسلامی تاریخ کا مطالعہ حیرت انگیز حد تک وسیع تھا. اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا جن میں مختلف تاریخی شخصیات اور واقعات کا تذکرہ ملتا ہے. مسلم تاریخ نے ہمارے ملی ارتقاء میں جو اہم کردار ادا کیا ہے اور جس طرح ہمیں انتہائی نازک اور پرآشوب ادوار میں بھی عزم و ہمت کی قندیلیں عطا کی ہیں، علامہ اس سے پوری طرح آگاہ تھے. پھر انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ مسلمانوں پر جب کبھی کوئی کٹھن وقت آتا ہے اسلام نے ہمیشہ ان کی دستگیری کی ہے اور انہیں شدید طوفان سے بچا کر ساحلِ مراد پر لایا ہے. یہ واقعات تاریخ کی مروہ اور بے جان کتابوں کے گرد آلود اوراق کا حصہ بن چکے ہیں لیکن

---

[1] ملفوظات ۱۲۸ - ۱۳۲

ان کی ورق گردانی قوم کے تنِ مردہ میں نئی روح دوڑانے اور ان کی شوکت رفتہ کی بازیابی میں انتہائی اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ اسلامی تاریخ کے ان جگمگاتے ہوئے صفحات کو لوگوں کے سامنے لایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اگر عزم و ہمت سے کام لیا جائے تو ہم اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ خالدؓ و طارقؒ کی جانبازیاں تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رہیں گی۔ ابن قاسمؒ کی جوانمردی اور قتیبہ بن مسلمؒ کی فتح و نصرت کے باب مسلمانوں کا سینہ گرماتے رہیں گے۔ تاہم افسوس صد افسوس کہ جس دور میں اقبالؒ اورنگ زیبؒ اور ٹیپو سلطانؒ کا تذکرہ کر رہے تھے یہ وہ دور تھا جبکہ غیروں کی سازش اور اپنوں کی بے توجہی کی وجہ سے تاریخ پر گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں میں انگریز اور ہندو مورخین کی متعصبانہ اور غیر منصفانہ تحریریں شاملِ نصاب تھیں اور غیر نصابی مطالعہ کی روایت آج کی طرح اس وقت بھی موجود نہ تھی بلکہ آج سے بھی کہیں کم تھی نتیجہ ظاہر ہے۔ علامہ نے مصر اور فلسطین کا سفر کیا تو انہیں وہاں ملی تمدن و تاریخ کی حفاظت کے لیے مختلف اداروں کو دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ جس نظارے کو دیکھنے کے لیے اقبال کی نگاہیں ترستی تھیں وہ انہیں وہاں میسر آیا پھر سپین میں مسلمانوں کی یادگاروں نے علامہ سے مسجد قرطبہ جیسی بلند پایہ نظم کہلوائی۔ آپ نے سسلی کا نوحہ لکھا اور ان بہادروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جو یورپ کے شہنشاہوں کو اپنا باج گذار بنائے ہوئے تھے۔ آپ نے وہاں سے واپسی پر مسلم تاریخ کے احیاء کے لیے ایک زوردار اپیل کی۔ آپ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"زمانہ قدیم میں بچوں کو ایک دعا پڑھائی جاتی تھی۔ شاید اب بھی وہ رواج قائم ہے، مجھے وہ دعا اب تک یاد ہے، اے اللہ! میرے دل سے غفلت کے پردے کو اٹھا لے میرا آج تک یہی خیال تھا کہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں پر غفلت کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ تمدن و تاریخ اسلام سے ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے کہ کوئی غیر مسلم۔ چند ماہ ہوئے مجھے مصر و فلسطین جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں کے واقعات سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہیں۔ مصر میں قومیت کا جذبہ اور جوشِ عمل موجود ہے۔ وہاں ایک ادارہ

قائم تھا جو ملکی تمدن و روایات کا محافظ تھا۔

فلسطین کی موتمر اسلامی میں میں نے دیکھا کہ وہاں کے نوجوان مقررین کی داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں، اور وہ کوٹ پتلون میں ملبوس نظر آرہے تھے لیکن انہیں علم و فضل اور جوش عمل کے اعتبار سے علمائے کرام پر فوقیت حاصل تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں تاریخ اسلامی کی تاریخ کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ لہٰذا میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ تاریخ اسلامی سے ناواقف اور روایات قومی سے نابلد طبقے کی رہنمائی کے لیے اسلامی تاریخ کے لیکچروں کا خاص بندوبست کرے۔ وہ لیکچر خواہ آسان اردو میں ہوں یا پنجابی میں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو اسلامی تاریخ سے آگاہی حاصل ہو جائے۔ اگر لاہور میں یہ انتظام ہو گیا تو میں امید کرتا ہوں کہ پنجاب کے دوسرے شہر بھی لاہور کی تقلید کریں گے۔

مسٹر بردس.... کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کو اس قوم کی تاریخ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے۔ روح انسانی کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے۔ اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے۔

جب میں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی کیوں ہے تو انہوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔

اسلامی ممالک کی مجموعی آبادی ہندوستان کے مسلمانوں کے قریباً مساوی ہو گی۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس شعبہ کی تدوین و تحقیق اور ترتیب و تنظیم پر متوجہ ہوں۔ انجمن حمایت اسلام کو چاہیے کہ ایسے ادارے کا افتتاح کرے جہاں تاریخ اسلامی کی تعلیم کا بہترین بندوبست ہو۔ لیکن انجمن تنہا اس کام کو انجام نہ دے سکے گی بلکہ آپ لوگوں کی امداد کی ضرورت ہے،، اس کے

بعد ایک قرارداد پیش کی گئی جو اتفاق رائے سے منظور ہو گئی۔

"مسلمانانِ لاہور کا یہ جلسہ ہندوستان کی تمام جدید و قدیم اسلامی درسگاہوں مثلاً مدرسہ عالیہ دیوبند اور سہارنپور، لکھنؤ وغیرہ کو تاریخ اسلامی کی تعلیم و ترویج کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مروجہ نصاب میں ترمیم کی جائے اور تاریخ اسلامی کو مسلمانوں کی تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا جائے۔"[1]

مسلمانانِ برصغیر اقبال کے اس احسان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے ان کے اندر ملی جذبہ پیدا کرنے کے لیے ایک ہمہ جہت اور بھرپور کوشش کی۔ اس کا دائرہ محض ان کے اشعار تک محدود نہ تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں یقیناً جہادِ کبیر سے کام کیا۔ ان کی تقریریں تھیں یا ذاتی گفتگوئیں، خطوط تھے یا مختلف لوگوں سے ملاقاتیں، سیاسی بیداری کا کام تھا یا معاشی استحکام کی ضرورت کا احساس دلانے کا فریضہ، ملی شعور پیدا کرنے کا مسئلہ تھا یا تاریخی واقعات کی بازخوانی کی یاددہانی، ملت اسلامیہ پر برصغیر میں پیش آمدہ مشکلات تھیں یا فلسطین و نزکی کے معاملات، ہر پہلو پر ان کی یکساں نظر تھی۔ اس وقت سب سے اہم ضرورت مغرب کے سیاسی غلبہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے احساسِ کمتری کا ازالہ تھا اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ خود اپنی تاریخ سے آگہی حاصل کی جائے۔ کیونکہ مغرب کا طلسم صرف اپنے ملی شعور اور تاریخی سرمائے سے غفلت کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ آپ نے ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کی جن کے پیشِ نظر یہی ملی مقصد اور جذبہ تھا۔

"موازنہ صلیب و ہلال"، جسے نکہت شاہجہان پوری نے لکھا تھا، مغربی تمدن پر اسلامی تمدن کی فضلیت ثابت کرنے کی ایک اہم کوشش تھی۔ اس میں انہوں نے اسلامی اور مغربی تمدن کا ہمہ پہلو تقابلی مطالعہ کر کے یہ واضح کیا کہ اہل مغرب نے علمی و ثقافتی معاملوں میں اکثر و بیشتر اہل اسلام خصوصاً مسلمانانِ اندلس سے استفادہ کیا۔ علامہ اقبال بھی اسی نظریے کے حامل تھے کہ اہل مغرب نے جو کچھ بھی علمی ترقی کی ہے وہ سب امت مسلمہ کے فرزندوں کی علمی و تحقیقی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ علامہ نے جگہ جگہ اس متاعِ گم گشتہ کی

---

[1] گفتارِ اقبال ۱۵۲ - ۱۵۴

بازیافت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ علامہ اقبال نے اس اہم تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا،

"موازنۂ صلیب و ہلال" تاریخی و سیاسی معلومات کا زبردست خزن ہے۔ میرا خیال ہے کہ قومی احیاء کی خاطر تمام مسلمانوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی رائے سے سرتاسر متفق ہوں"

علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ لکھا تھا کہ

"میں نے یہ کتاب جا بجا سے دیکھی۔ اس کی زبان اور طرز ادا تعریف کے قابل ہے۔ ذخیرہ معلومات بھی بہت زیادہ ہے۔ مجھے وثوق ہے کہ اس کے مطالعہ سے عام مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"[1]

علامہ کا تاریخ سے شغف بے حد بڑھا ہوا تھا۔ جہاں کہیں اس موضوع پر کام ہو رہا ہوتا علامہ اس سے بے حد دلچسپی کا اظہار کرتے۔ ان کے دوست محمد دین فوق صاحب نے جب تاریخ حریت اسلام لکھی تو انہیں اس پر داد تحسین دی۔ لکھتے ہیں "فوق کو اسلامیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ حریت اسلام ان کی بہترین تصنیف ہے۔ دلیری اور بے باکی سے اعلان حق کرنا گذشتہ مسلمانوں کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو تھا مگر افسوس کہ عصر حاضر کے عام مسلمان تو تاریخ اسلامی سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ موٹے موٹے واقعات سے بے خبر ہیں۔ ان حالات میں فوق صاحب کی تصنیف پنجاب کے اسلامی لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی مسلمان خاندان اس بیش بہا کتاب کے مطالعہ سے محروم نہ رہے گا۔ اسلامی سکولوں اور کالجوں کے کتب خانے خاص طور پر اس کے مطالعہ کی طرف توجہ دیں۔ اس زمانہ میں جب کہ جمہوریت کی روح ہندوستان میں نشوونما پا رہی ہے دیگر اہل ملک کے لیے بھی یہ کتاب سبق آموز ہو گی۔"[2]

فوق صاحب نے تعلیمات اسلامی کی اشاعت کا ایک پروگرام پیش کرتے ہوئے

---

[1] اوراق گم گشتہ ص ۷۰

[2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۷۰ - ۲۷۱

ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی تھی کہ خود ان کے عزیزوں میں اس کی اشاعت کا نتیجہ نہایت خاطر خواہ برآمد ہوا۔ آپ لکھتے ہیں۔

"آپ کی تجویز کی خوبی اس کے نتائج سے ظاہر ہے جن کی نسبت آپ خود فرماتے ہیں کہ بہت اچھے ہیں۔ قرآن میں بھی یہی آیا ہے کہ وانذر عشیرتک الاقربین۔

علامہ نے پوری کوشش کی کہ برصغیر کی ملت اسلامیہ میں شعور پیدا ہو۔ اسلامی دنیا کے واقعات و حالات کا پتہ چلے۔ خود علامہ کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کتنے ہی تاریخی واقعات کے بارے میں علامہ کے یہاں تذکرہ ملتا ہے۔ پھر علامہ کا بلاد اسلامیہ کے جغرافیے کے بارے میں بھی گہرا مطالعہ تھا۔ اگر تاریخی اور جغرافیائی معلومات کے لحاظ سے کلام اقبال کا جائزہ لیا جائے تو حیرت ناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ اسلامی اندلس، صقلیہ، کاشغر اور دیگر کتنے ہی نام ہیں جو اقبال کے حوالے سے زندہ جاوید ہوئے۔ مسجد قرطبہ کا تذکرہ کیا تو وہ ہمارے یہاں روزمرہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی میں تاریخ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ قوموں نے جب بھی اپنے اجتماعی حافظے یعنی تاریخ سے اغماض برتا، تاریخ نے خود انہیں بھلا دیا۔

مولوی کرم الٰہی صوفی صاحب نے "ہندوستان کی اسلامی تاریخ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تو علامہ نے حسب ذیل تبصرہ بھیجا جو ایک خط کی صورت میں تھا۔ علامہ لکھتے ہیں۔

"میں نے آپ کی کتاب اسلامی تاریخ، تاریخ عہد افغانیہ شروع سے لے کر آخر تک پڑھی۔ یہ کتاب نہایت برمحل لکھی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلم اس کی بہت قدر کریں گے۔ تاریخی تحقیق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اکثر مقامات اس کتاب کے قابل داد ہیں اور آپ کی قوت استدلال اور درایت تاریخی کو ثابت کرنے کے علاوہ اس بات پر نہایت قوی حجت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں مذاق تاریخ نویسی اب تک زندہ ہے اور ابھی قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی تاریخ کو غیر اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے واقعات کو مورخانہ نگاہ سے دیکھنے والے لوگ اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ عام پڑھنے والے بالخصوص مسلم جن کی قومی روایات کی یہ

لہ (بنام محمد دین فوق ۲۸ دسمبر ۳۷ء۔ اقبال نامہ دوم ص ۱۷۱)

کتاب ایک نہایت روشن اور صحیح تصویر ہے اس کتاب کے مطالعے سے اخلاق فاضلہ کے وہ گراں قدر اصول سیکھ سکتے ہیں جو ان کی قوم کے مابہ الامتیاز رہے ہیں اور جن پر عمل کرنے سے حجاز کے صحرانشین تیس ہی سال کے اندر شتربانی سے جہاں بانی تک پہنچ کر اقوام قدیمہ کی تہذیب کے وارث اور تہذیب جدید کے بانی بن گئے۔ تاریخ کا مقصد اگر اخلاقی ہے اور میرے خیال میں تاریخ کا یہی مقصد ہونا چاہیے تو آپ کی تصنیف اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے اور میں بہ حیثیت ایک مسلم ہونے کے آپ کا شکرگذار ہوں کہ آپ نے یہ کتاب عین ضرورت کے موقع پر لکھ کر اپنی قوم پر احسان کیا۔ قومیت کا احساس جس کو بالفاظ دیگر قومی خودداری کہنا چاہیے قومی زندگی کے لیے ضروری ہے اور جن وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے وہ بھی قومی حیات کے لیے ضرورت میں سے ہیں۔ پس اس اعتبار سے آپ کی کتاب کا مطالعہ ہر مسلم پر واجب ہے اور مجھے یہ یقین ہے کہ ہندوستان میں ہر خاندان اس کتاب کو پڑھنے سے مستفیض ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی محنت اور جانکاہی کا اجر دے اور اس کا انعام آپ کو اس مقدس رسولؐ کی بارگاہ سے ملے جس کے کام سے بنی نوع انسان کی نجات اور جس کے نام سے ہماری قومیت وابستہ ہے۔"[1]

علامہ کو تاریخ اسلامی سے جو دلچسپی تھی اس کا اظہار ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کے نام لکھے۔ انہیں ان کی تصانیف پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"آپ کی تصانیف اردو لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہیں جس سے تمام پڑھنے والوں کے نقطہ نگاہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔"[2]

اسی طرح ایک اور خط میں انہیں لکھا ہے۔

"میں دو سال سے بیمار ہوں۔ بہت کم لکھتا پڑھتا ہوں مگر آپ کا مضمون جو اخبار احسان میں شائع ہوا ہے اسے دیکھ کر بے اختیار دل چاہا کہ آپ کو اس مضمون پر مبارکباد لکھوں۔ نہایت عمدہ مضمون ہے۔ مجھ سے بے شمار لوگوں نے آپ کی تعریف کی ہے۔ اب آپ کے لیے ایک

---

[1] (انوار اقبال ص ۱۹ - ۲۱)

[2] (بنام مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی ۲۳ اپریل ۱۹۳۵ء، انوار اقبال، ۳۱۷ - ۳۱۸)

مضمون لکھنا باقی ہے یعنی مسئلہ جہاد کی تاریخ ہندوستان میں. اس کو صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں....
مولوی چراغ علی مرحوم کی انگریزی کتاب، سرسید کی تصانیف، مرزا غلام احمد قادیان کی تصانیف
اور ان کے علاوہ علماء کے فتوے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اس مضمون کے لکھنے میں مدد دیں گے۔
شاید ٹیپو سلطان کے زمانے سے جہاد کے مسائل کی نئی تفسیریں شروع ہوئی ہیں. آپ کو مجھ سے
بہتر یہ حالات معلوم ہوں گے. چھپنے سے پہلے اگر میں اسے دیکھ سکوں تو شاید اور باتیں بھی عرض
کر سکوں۔"[1]

مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی نے جب رسالہ "اچھوت اقوام اور اسلام" لکھا تو اس کی تعریف
کی اور انہیں لکھا۔

"آپ کا رسالہ "اچھوت اقوام اور اسلام"، نہایت دلچسپ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عام طور
پر نہایت مفید ثابت ہوگا. اسی قسم کا ایک رسالہ اسلامی دستور حیات پر لکھنا چاہیے تاکہ غیر مسلم
اقوام کو معلوم ہو کہ روزمرہ کی زندگی میں اسلام یسر ہے عسر نہیں۔ زمانہ حال میں لوگوں کو عقاید کی
فلسفیانہ بحث کی نسبت دستورِ حیات میں زیادہ دلچسپی ہے. اس وقت یورپ میں بھی یہی بحث ہے۔"[2]

ان خطوط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اسلامی تاریخ اور اسلام کے دستور حیات سے
متعلق تصنیف و تالیف کے کام کو کتنی اہمیت دیتے تھے اور کس طرح اس بارے میں سوچتے
رہتے تھے. مسئلہ جہاد کی تاریخ ہندوستان میں، غالباً اب تک نہیں لکھی گئی یہ موضوع آج بھی تشنہ ہے

---

[1] (بنام مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی ۱۲ نومبر ۱۹۳۵ء، انوار اقبال ۳۱۸)

[2] (بنام مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی ۱۳ دسمبر ۱۹۳۶ء، انوار اقبال ۳۱۸ - ۳۱۹)

اقبالؒ اور عرب و عجم

علامہ اقبال مسلم متفکر میں صدیوں کی آمیزشوں اور مختلف اقوام کے تصورات کی آلودگیوں سے تطہیر کے علمبردار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو نظامِ فکر ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ملا ہے، ہم اس کو اپنائیں اور دیگر فکری آلودگیوں سے اپنا آپ پاک رکھیں۔ کوئی دوسرا نظامِ فکر ہمیں مربوط رکھنے اور ایک محور پر استوار کرنے اور قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ علامہ مسلمانوں کے انحطاط کی بنیادی وجہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ جو حرکت اور توانائی ہمیں عرب کے صحراؤں سے ملی اور جس نے ہمیں تھوڑی سی مدت میں دنیا کے بہت بڑے حصے پر غالب کر دیا تھا وہ بعد میں دیگر اقوام کے میل جول کی وجہ سے ختم ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے عرب طرزِ تمدن پر اسی وجہ سے اصرار کیا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دیگر تمدن جو زندگی کی حرارت سے محروم ہیں مسلمانوں کی زندگی کو متاثر کر کے انہیں اپنے دھرے پر لے آئیں گے اور رفتہ رفتہ وہ بنیادی خواص جن کی وجہ سے مسلمانوں کی عظمت اور ہیبت برقرار رہے جاتے رہیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو عجمی طریقے اپنانے سے خاص طور سے منع کیا تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے حمام میں جانے سے بھی منع کیا تھا اور دھوپ کو 'حمام العرب' قرار دیا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ حمام اس آسائش اور پر آرائش زندگی کا مظہر ہے جو اندرونی حرارت سے محروم ہے۔ جفاکوش زندگی جس میں روزمرہ کی جدوجہد اور گردشِ انسانی کو پسینے میں شرابور کر دے، اس بات کی محتاج نہیں کہ اس کے مسام حمام کی مصنوعی گرمی سے تازہ ہوں۔ حضرت عمرؓ کا دھوپ کو نعم البدل قرار دینا یہی مفہوم رکھتا۔

علامہ اقبال عرب تمدن کی منزل سے عجمی تنزل کی جانب اندوہناک سفر کی داستان

ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت — قوم را رمزِ بقا از دست رفت
آں نہالِ سربلند و استوار — مسلمِ صحرائی اشتر سوار
پائے تا در وادیٔ بطحا گرفت — تربیت از گرمیٔ صحرا گرفت
آں چناں کاہید از بادِ عجم — ہمچو نے گردید از بادِ عجم
آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند — گشت از پامالِ موے دردمند
آنکہ از تکبیر او سنگ آب گشت — از صفیرِ بلبلے بیتاب گشت
آنکہ عزمش کوہ را کاہے شمرد — با توکّل دست و پائے خود سپرد
آنکہ ضربش گردنِ اعدا شکست — قلبِ خویش از ضربہائے یدِ خست
آنکہ گامش نقشِ صد ہنگامہ بست — پائے اندر گوشۂ عزلت شکست
آنکہ فرمانش جہاں را نا گزیر — بر درش اسکندر و دارا فقیر

کوششِ او با قناعت ساز کرد
تا بہ کشکولِ گدائی ناز کرد [1]

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار ہاتھ سے چلا گیا تو قوم کی بقا کا راز بھی رخصت ہو گیا۔ وہ شتر سوار صحرا کا رہنے والا بلند اور بالا جوان جس نے صحرا کی گرمی سے فیض حاصل کیا تھا اور وادی بطحا میں مقیم تھا، عجم کے ہوا نے اسے مرجھا کر کانٹا بنا دیا۔ وہ جو کہ شیر کو بھیڑ دں کی طرح ذبح کرتا تھا اب چیونٹی کے مرنے سے بھی دردمند ہونے لگا۔ جس کی تکبیر کی آواز پہاڑوں کا دل چیر دیتی تھی وہ اب بلبل کے گیت سے مضطرب ہو جاتا تھا۔ جس کا عزم پہاڑوں کو پرِ کاہ سمجھتا تھا اس نے توکل کر کے اپنے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے۔ جس کی ضرب سے دشمنوں کی گردن ٹوٹ جاتی تھی اب وہ سینے کی ضربوں سے دل خستہ ہو رہا تھا۔ جس کے قدموں نے دنیا میں ہزار ہا ہنگامے بپا کیے اب وہی گوشۂ عزلت میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ جس کے احکام کی اطاعت ایک جہان کر رہا تھا اور جس کے در پر اسکندر و دارا

---

[1] کلیاتِ اقبال ۱۲۸ / ۱۲۹)

سوالی بن کر آئے تھے اس نے اب قناعت پر اکتفاء کر کے گدائی کے پیالے پر ناز کرنا شروع کر دیا۔ "اقبال بتاتے ہیں کہ جب انسان نقش حق اختیار کر لیتا ہے تو ساری دنیا اس کے تابع اور تقدیر اس کی تدبیر کے ساتھ ہم رکاب ہو جاتی ہے۔ جس شخص میں قوتِ تخلیق نہ ہو۔ حق تعالےٰ کے نزدیک وہ کافر و زندیق سے کم نہیں۔ جمال حق سے نہ تو وہ بہرہ ور ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی زندگی کا کوئی نتیجہ اسے حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تقدیر کو خود بنائے۔

ہر کہ اورا قوت تخلیق نیست — پیش ما جز کافر و زندیق نیست
از جمال ما نصیب خود نہ برد — از نخیل زندگانی بر نہ خورد
مردِ حق! برندہ چوں شمشیر باش — خود جہانِ خویش را تقدیر باش

متاخرین مسلمانوں میں جوں جوں تن آسانی اور کاہلی کا روگ سرایت کرتا گیا، وہ قسمت اور تقدیر کا غلط مطلب لے کر قوتِ عمل سے محروم ہوتے گئے اور اس کو صبر و توکل اور تسلیم و رضا کے شاندار الفاظ سے بیان کرنے لگے۔ اقبال نے سمجھایا کہ تسلیم و رضا کے یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ ان سے کاہلی اور بے عملی نہیں پیدا ہو سکتی کیونکہ وہ تو قوائے عمل کے لیے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا! یا رسول اللہ "أرأیت ما نعمل فیہ علی امر، قل فرغ منہ او امر نبتدأ؟ فقال علی امر قد فرغ منہ۔ فقال عمر افلا نتوکل و ندع العمل فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ" یا رسول اللہ جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ کام پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے یا ہم نے اسے شروع کیا ہے؟ فرمایا پہلے ہی ختم ہو چکا ہے حضرت عمرؓ نے کہا تو پھر کیا ہمیں توکل نہیں کرنا چاہیے اور ترک عمل نہیں کرنا چاہیے؟ رسول اللہ نے فرمایا کام کیے جاؤ کیونکہ ہر شخص کے لیے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ کتنی بلیغ حکمت ہے اور عمل کی کیسی اچھی ترغیب۔[1]

اقبال نے اختیار کے پہلو پر بوجوہ زیادہ زور دیا ہے کیونکہ جبر کے فلسفے نے مسلمانوں سے عزم و ہمت چھین لی تھی۔ بہر حال علامہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے جو حضور اکرم صلی اللہ

---

[1] مطالعۂ اقبال از گوہر نوشاہی ص ۲۴۱ - ۲۴۲

علیہ وسلم نے ہم تک پہنچائی اور جس کی جانب اقبال نے اس شعر میں اشارہ کیا۔

چناں فرمودۂ سلطانِ بدرؓ است

کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است

سلطان بدر، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ ایماں جبر و قدر کے درمیان واقع ہے یعنی ان دونوں حقیقتوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ انسان بے شمار امور میں مجبور اور بے شمار معاملات میں مختار واقع ہوا ہے غلامی کے اثرات میں سے ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ محکوم قوم میں جبر کا پہلو بے حد نمایاں ہو جاتا ہے۔ محکوم اپنے تمام تر مصائب کی ذمہ داری تقدیر پر ڈال کر سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اسی صورت حال کا شکوہ کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا،

خبر نہیں اس کا نام کیا ہے خدا فروشی کہ خود فروشی

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

علامہ نے اس صورت حال کے ازالے کے لیے عملی قوتوں، عشق، جد و جہد اور مردانہ وار لڑنے کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ جہاں خطباتِ مدارس میں انسان کو خدا کے عمل میں شریک، یا اس کا Co-workers قرار دیتے ہیں اور مسجد قرطبہ میں کہتے ہیں

ح ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

وہاں فارسی کلام میں اس فرسودہ جہان کو جو کہ مردِ مومن کے تقاضوں کے مطابق نہیں درہم برہم کرنے کو کہتے ہیں

ح گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد

گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

بدقسمتی سے صدیوں کی محکومی کے اثرات ادب پر بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی ایک اہم مثال یہ تھی کہ عرب کے جاں پرور معمول اور مردانہ بہادری کی شاعری کی جگہ عجمی لے نے لے لی تھی جو انحطاط پذیر خیالات کی حامل تھی اور جس کا تمام تر رجحان جبریت

کی طرف تھا۔ اس جانب توجہ دلاتے ہوئے ڈاکٹر سید یامین ہاشمی صاحب کے نام ایک خط میں علامہ نے عجمیت کے رنگ سے اجتناب کرنے کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے:

"بحیثیت مجموعی آپ کے اشعار کا رنگ عجمیت میں ڈوبا ہے۔ زمانہ حال میں عجمیت سے اجتناب لازم ہے۔ اس وقت مسلمان کا فرض ہے کہ جو قوت خدا تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے اسے اسلام کی خدمت اور اقوام و ملل اسلامیہ کے احیاء و بیداری میں صرف کرے۔ میری رائے میں عجمیت ایشیاء کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اس وقت اس "باطل" کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ عجمیت کا اثر مذہب لٹریچر اور عام زندگی پر غالب ہے۔ شاید عربوں اور افغانوں کے سوا تمام اقوام اسلامیہ اس زہر سے خطرناک طور پر متاثر ہو چکی ہیں۔

شعرائے عرب سے میری مراد شعرائے زمانۂ جاہلیت اور زمانہ بنوامیہ ہیں۔ عباسیوں کے عہد میں عجمیت عرب کے لٹریچر پر غالب آگئی تھی۔ اس زمانے کی شاعری کا مطالعہ کچھ زیادہ مفید نہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو ایک لٹریری آئیڈیل کی تلاش میں ہوں۔"[1]

علامہ شعر کو زندگی کا آلۂ کار سمجھتے تھے اور اس فن کے ذریعے زندگی میں انحطاط پذیر خیالات کی پرورش سخت مضر جانتے تھے۔ آپ نے مجید ملک صاحب سے ایک ملاقات کے دوران میں ارشاد فرمایا:

"اردو شاعری ہندوستان کے دور انحطاط کی پیداوار ہے۔ اس لیے کمزور، غیر فطری اور حد درجے کی مصنوعی ہے۔ آرٹ اقوامِ عالم کی زندگی کا عکس ہے۔ کسی قوم کے آرٹ کو دیکھ کر اس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھینچا جا سکتا ہے۔ لیکن آرٹ زندگی کا مظہر ہی نہیں زندگی کا آلۂ کار بھی ہے اور سچا آرٹسٹ وہ ہے جو اپنے کمال کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے وقف کر دے.... اردو شعراء بھی اپنی قوم کے لیے فرحت مہیا کرتے ہیں اور پرانے عربی شعراء بھی کیا کرتے تھے کتنا تفاوت ہے۔ عربی شاعری میں اور اردو شاعری میں وہی فرق ہے جو ایک سرفروش، جنگجو قوم اور عشرت زدہ قوم میں ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ میرے نزدیک

---

[1] بنام ڈاکٹر سید یامین ہاشمی ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء انوار اقبال ص ۱۹۲ - ۱۹۳

اس زمانے کی عربی شاعری صحیح قسم کی شاعری تھی۔ عرب کی زندگی کے عیوب عربی شاعری میں عیاں ہیں لیکن ان عیوب کی نوعیت اردو شاعری کے عیوب سے مختلف ہے۔ میرے نزدیک حقیقی آرٹسٹ وہ ہے جو اپنی قوم کا نبض شناس ہو اور آرٹ کو قومی امراض کے دفعیہ کا ذریعہ بنائے۔ شاعر امراالقیس کی طرح اشعر الشعراء ہونے کے باوجود قائد ہم الی النار ہو سکتا ہے اور شاعر ہی اپنے حسن کلام کی وجہ سے اس رتبے تک پہنچ سکتا ہے جس رتبے پر بسید پہنچا کہ خود سرور کونین کو اس سے ملنے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں جسے تم کامیاب شعر کہتے ہو وہ اور چیز ہے اور معیار پر پورا اترنے والا شعر اور چیز ہے۔ وہ شاعری جو آرٹ کے حقیقی معیار پر پوری اترتی ہے پیغمبری کا جزو ہے۔ وہ شاعری جو اس معیار پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن فنی معیار پر پوری اترتی ہے 'کامیاب، شاعری ہے'۔ [1]

یہ بات ظاہر ہے کہ علامہ محض فنی اعتبار سے 'کامیاب' شاعری کے قائل نہ تھے۔ وہ اسے پیغمبری کا جزو سمجھتے تھے اور اسے قوموں کی زندگی میں ایک حیات آخریں عنصر تصور کرتے تھے اگر شاعری قوم اور اس کے افراد کی عملی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے بجائے مایوسی اور افسردگی کا پیغام دے تو اس کا کچھ حاصل نہیں۔ علامہ نے اس خیال کو یوں بیان کیا ہے

ع شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

یہاں صورت حال یہ تھی کہ نہ صرف ملت اسلامیہ کے افراد میں اضمحلال اور بددلی و افسردگی پیدا کی جارہی تھی بلکہ ان کی اجتماعی زندگی کے حیات بخش پہلوؤں کو ایک ایک کر کے مسمار کیا رہا تھا۔ عجمی شاعری جس کی گہری چھاپ اردو ادب پر بھی لگی ہوئی ہے اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ اسلام کی تمام آفاقی قدروں کو انتہائی غیر محسوس لیکن موثر انداز سے شعر کی کاٹ سے دونیم کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

یہ شاعر اسلام کے مختلف اصولوں اور احکام کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ بظاہر

---

[1] رانوارِ اقبال ۳۵ - ۱۳۶

ان پر گرفت نہیں کی جا سکتی لیکن نہایت غیر محسوس انداز سے اسلام کے تمام اصولوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ سراج الدین پال صاحب کے نام ایک طویل خط پر آپ اس اہم پہلو سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اقبال سے پہلے شاید ہی کسی کی نظر اس اہم پہلو کی طرف گئی ہو۔ علامہ نے اس پہلو سے ہماری حیاتِ ملی کا جائزہ لے کر ملتِ اسلامیہ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس سے علامہ کی دینی بصیرت اور سوجھ بوجھ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ علامہ لکھتے ہیں۔

"حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاط ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت Subtle طریق تمسخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا تاہم دفعتہً آنے پر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا، یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تمسخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا جاتا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس اشعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً

غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پو است

غافل کہ شہیدِ عشق فاضل نزاز اواست
در روزِ قیامت ایں باؤ کے ماند
ایں کشتۂ دشمن است واں کشتۂ دوست

ترجمہ: غازی شہادت کے لیے کوشش کر رہا ہے اور اس بات سے غافل ہے کہ شہید عشق اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ قیامت کے دن اس کے مقام تک کیسے پہنچ سکتا ہے کیونکہ یہ دشمن کے ہاتھوں کا مارا ہوا ہے اور وہ دوست کے ہاتھوں کا شہید ہے)

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف۔ مگر انصاف سے دیکھیے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس امر کا احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔

اس نقطہ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اگر آپ حافظ پر لکھیں تو اس نقطہ خیال کو ملحوظ رکھیں۔ جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب و غریب باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس واسطے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعے میں آپ کا دماغ ایک خاص راستے پر پڑ جائے۔ انشاء اللہ اسرارِ خودی، کے دوسرے حصے میں بتاؤں گا کہ شعر کا نصب العین کیا ہونا چاہیے۔

ایک اور مضمون بھی لکھ رہا ہوں جو "وکیل" میں شائع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسی جماعت پیدا کر دے جو بقول آپ کے اسلام کے نادان دوستوں کی پیدا کی ہوئی آمیزشوں کے خلاف جہاد کرے۔"[1]

علامہ اقبال کے اشعار اور خطوط میں جگہ جگہ عجمی تصورات و خیالات سے بچنے کی تلقین اور عرب فضا میں سانس لینے کا پیغام ملتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عجمی تصورات کا خمیر اسلام کے ضمیر سے نہیں بنا جبکہ عرب مزاج میں اسلام اور اس کے مقاصد کی تمام تر حرارت اور توانائی پائی جاتی ہے۔ عجمی خیالات کسی قوم کو حیاتِ نو بخشنے اور اسے دنیا میں ایک غالب قوم کی

---

[1] (بنام سراج الدین پال، ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء، ص ۳۴-۳۷ اقبال نامہ اوّل)

حیثیت سے سرفراز کرنے میں معاون نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ خیالات چاہے کتنے خوبصورت نظر آئیں اور چاہے ان کی رنعت کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہو، یہ اسلام کی حدود سے باہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شیخ احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں یوں کہتے ہیں۔

؎ بامریدے گفت اے جان پدر — از خیالاتِ عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت — از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گذشت

(اپنے مرید سے کہا کہ اے جان پدر، عجمی خیالات سے بچنا چاہیے کیونکہ عجم کی فکر اگرچہ آسمان سے بھی اونچی چلی گئی ہے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے دائرے سے باہر ہے۔)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

؎ وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا! — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے [1]

عجم کا انداز سراسر شکست کا سا ہے۔ وہ زندگی کے معرکے میں مردانہ وار لڑنے کی بجائے شرابِ الست میں سرمست رہنے کا درس دیتا ہے۔ یہ بات کہ قسمت کا لکھا ہی ایسا تھا، زندگی کی جنگ میں شیروں کی طرح لڑنے اور زمانے کو اپنے مطابق ڈھالنے کی صند واقع ہوئی ہے۔ اس کے اثرات سے تصوف بھی نہ بچ سکا۔ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست
صوفی کی شریعت میں فقط مستیٔ احوال — ملّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

چونکہ تصوف کی عام روش ان لوگوں کے مناسبِ حال تھی جو کشمکشِ زندگی میں مردانہ وار

---

[1] (بالِ جبریل ۱۶۸)

لڑنے کی صلاحیت سے محروم تھے، اس لیے یہ عجم میں بہت مقبول ہوئی۔ اسلام جب سیاسی قوت اور معاشرے کی مضبوط اور اعلیٰ قدر کی حیثیت سے گر کر محض عقیدہ کی سطح پر آگیا تو اس نوع کے تصورات جن میں امن شانتی اور تقدیر کا انفعا پہلو نمایاں تھا، معاشرے میں قبولِ عام حاصل کرنے لگے۔ ان خیالات نے جو عجم کی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے اور جو زندگی کی حرارت سے محروم تھے، مسلم معاشرے کو تنزل اور غلامی کے ایک ایسے گڑھے میں لا پھینکا جس سے ہم کئی صدیوں تک نہ نکل سکے۔ اقبال نے اپنی خداداد بصیرت کی وجہ سے ان عجمی تصورات کی حقیقت اور ان کے حیات کش پہلو کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ان خیالات کی بھرپور مخالفت کی۔ انہوں نے ہمیں قرآن حکیم کے حیات بخش اور قوت عطا کرنے والے پیغام کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ ملی زندگی میں استحکام پیدا کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اس لذت کوشی کے پیغام کو جو عراقی اور حافظ اور دیگر فارسی شعراء میں پایا جاتا ہے نظر انداز کر کے صرف قرآن سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ فارسی شعراء کی روش ان نظریات کے بالکل ضد واقع ہوئی ہے جو قرآن حکیم کے پیغام پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے کہا۔

صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست — از شرابِ نغمۂ اقوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بہ قرآن محفلش
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(پشمینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست ہے اور تصوف کی شراب میں مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کا کلام گرمی پیدا کرتا ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر تم مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہو تو قرآن حکیم کے بغیر ایسا ممکن نہیں)

اقبال چاہتے تھے کہ عجم کے فکری سوتوں میں جو زہر پوشیدہ ہے اور جو برصغیر کے ادبی سرمایے کو آلودہ کر رہا ہے، اس سے مسلم قوم کو بچایا جائے اور انہیں عرب کی کھلی اور پاکیزہ فضا میں سانس لینے کی نعمت سے روشناس کروایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔

فکرِ صالح در ادب می بایدت — رجعتے سوئے عرب می بایدت
از چمن زار عجم گل چیدۂ — نو بہارِ ہند و ایراں دیدۂ

اندکے از گرمیٔ صحرا بخور　　بادۂ دیرینہ از خرما بخور
تا شوی درخوردِ پیکار حیات　　جسم وجانت سوز دازنارِ حیات

(ادب میں صالح خیالات ہونے چاہییں۔ تمہیں عرب کی فضا میں واپس آجانا چاہیے۔ اگرچہ تم نے عجم کے چمن زار سے پھول چنے ہیں اور ہند و ایران کی نوبہار دیکھی ہے لیکن صحرا کی گرمی بھی کھانا چاہیے۔ کھجوروں کی شراب کہنہ (عرب کے تصورات) سے مستفیذ ہونا چاہیے تاکہ زندگی کی جنگاہ میں لڑنے کے قابل ہوسکو۔ اور جسم وجاں زندگی کی آگ میں جل سکیں (عرب فضا میں جنگاہ کی حرارت موجود ہے۔ عرب شاعری ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تن آسان شخص کی کیفیات کی آئینہ دار نہیں بلکہ یہ حرکت وحرارت کا پیغام دیتی ہے۔ یوں تو بے شمار مثالیں دی جاسکتیں ہیں لیکن چند اشعار پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ یہ جواہر پارے جو عرب شعراء کے کلام سے لیے گئے ہیں، اس زندگی کے آئینہ دار ہیں جو صحرا کی جلتی ہوئی دھوپ میں پلی اور بڑھی ہے۔

عرب شاعر ایک جگہ قیام اور سکون کی زندگی کا قائل نہیں وہ ہر لحظہ خرام چاہتا ہے اس کا خیال ہے کہ پانی ایک جگہ ٹھہرا رہے تو اس میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے اس کے برعکس متحرک پانی میں بو پیدا نہیں ہوتی اور وہ تازہ رہتا ہے اس کا رنگ بو اور ذائقہ بدل جاتا ہے۔ (البطی اوفات ۱۰۱۰ھ ۱۶۰۱ء لکھتا ہے

لقد حضت من طول المقام ومن یقم　　طویلا یہن بعد ما کان کرما
وطول مقام الماءِ فی مستقرّۃ　　یغیّرہ لونًا وریحًا ومطعما [1]

(میں زیادہ دیر ایک جگہ رہنے کی وجہ سے رسوا ہوا اور جو زیادہ دیر ایک جگہ رہتا ہے بالآخر نفرت کا شکار ہوجاتا ہے جب کہ پہلے پہل اس کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ پانی اگر ایک جگہ زیادہ دیر ٹھہرا رہے تو اس کا رنگ بو اور ذائقہ بدل جاتا ہے)

عرب شعر میں زندگی کے حقائق سے فرار نہیں۔ شاعر موت کو ابدی حقیقت سمجھتا ہے اور مردانہ وار اس کا سامنا کرتا ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے اشعار ہیں۔

فی ایّ یومی من الموت افر　　أیوم لم یقدر ام یوم قدر

---

[1] رواۂ دیوتہ ۱۰۷　[2] رواۂ دیوتہ ص ۱۸۳

یوم لم یقدّر لا ارھبہ ومن المقدور لا ینجی الحذر

(میں ان دو دنوں میں سے کس دن موت سے فرار حاصل کروں. کیا اس دن جب موت مقدور نہیں یا جس دن موت مقدر ہے، جس دن موت تقدیر میں نہیں میں ہرگز نہیں ڈرتا اور جس دن مقدر ہے اس دن خوف موت سے نجات نہیں دلا سکتا۔[1])

موت کو خاطر میں نہ لانے والی کیفیت اور شجاعت کے اعلیٰ صفات کی نمائندگی ان عرب اشعار میں بھی ہے۔

ابن المعتاظ (وفات ۲۹۶ھ - ۹۰۸ء) لکھتا ہے۔

انا جیش اذا غدوت وحیدا ودحید فی الحفل الجرار

(میں جب اکیلا جنگ کے لیے نکلتا ہوں تو میری حیثیت ایک فوج کی سی ہے اور میں بڑے بڑے لشکروں میں فردِ وحید کی حیثیت رکھتا ہوں)

پھر زندگی کی وسعتوں سے بھی بڑھ کر عزائم رکھنے والے انسانوں کی جستجو متنبّی کے اس شعر میں جھلکتی ہے۔

واذا کانت النفوس کبارا تعبت فی مرادھا الاجسام

(جب عزائم بہت بڑے تھے تو جسم ان کی بجا آوری میں تھک گئے۔)

الھمذانی کہتا ہے۔

ان شئت تعرف فی لادب منزلتی وانّنی قد عدانی الفضل والنعم

فالطرف والقوس والادھاق تشھدلی والسیف والنرد والشطرنج والقلم[2]

(اگر تم میری منزلت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو اگرچہ میں فضیلت اور بلند مرتبہ سے محروم ہو چکا ہوں۔ تو گھوڑا، کمان، کمند، تلوار، نرد، شطرنج اور قلم میرے گواہ ہوں گے۔)

گھوڑوں اور نیزوں کی تعریف اور ان کا تذکرہ عرب شاعری کا خاصہ ہے۔ پھر یہ صحرا کی زندگی کی عاشق ہے۔ عرب شاعر ہمیشہ اپنی بادیہ نشینی پر فخر کرتے رہے اور وہاں کے وحشی جانوروں

---

[1] (داؤد پوتہ ۱۰۳)

[2] (داؤد پوتہ ۱۸۳)

پرندوں. نباتات، درختوں، ہواؤں اور پانیوں کے گیت گاتے رہے. قطامی کہتا ہے

ومن تکن الحضارۃ اعجبتہ فای رجالٍ بادید ترانا

ومن ربط الجاشں فان نینا قنا سلبًا وافراسًا حسانا

(اگر کسی کو شہری زندگی پسند آتی ہے (تو آتی رہے)، تو یہ بتا کہ تو نے ہمیں بادیہ نشین انسان کی حیثیت سے کیسا پایا. اگر کوئی (اپنے گھروں میں) گدھے باندھتا ہو (تو باندھتا رہے) ہمارے پاس تو جان لیوا نیزے اور خوبصورت گھوڑے ہیں) اقبال بھی اسی صحرانوردی کے قائل تھے اور ان کی شاعری میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں کہتے ہیں.

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا

جس سمت میں چاہے صفتِ سیل رواں چل

وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

امیر معاویہؓ کی بیوی صحرا سے تعلق رکھتی تھی جب وہ شام گئی تو اکثر اپنے صحرا کو یاد کرتی تھی ایک روز امیر معاویہؓ نے اسے یہ شعر کہتے سنا:

لبیت تخفق الا رواح فیر احب الی من قصر منیف[1]

(وہ خیمہ جس میں ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوں مجھے ایک بلند محل سے زیادہ پیارا ہے)

'میرے چچا کا بیٹا پہاڑ کی پگڈنڈی کے کنارے پر چل رہا ہے. کیا میں پیچھے سے جاکر اسے دھکا دوں تاکہ وہ اس سنگین وادی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے اور اس کے لیے کوئی صبح طلوع نہ ہو. اس کے سلوک کو مدنظر رکھتے ہوئے تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے. لیکن یہ کمینگی اور مردانگی سے بعید بات ہو گی.

حماسہ میں عرب شاعر یوں کہتا ہے. یہ ٹکڑا خالص عرب شاعری کا نمونہ ہے. شاید ہی کوئی شاعری اس انداز کی براہ راست، تیکھی اور مردانگی کے جذبات سے بھرپور خیالات

---

[1] (بلوغ الارب ۶۵۳)

کی آئینہ دار ہو۔ عرب حقیقت پسند انہ بات کرنے کے عادی ہیں۔ جہاں تک رنگوں کی شوخی کا تعلق ہے وہ انہیں نہیں بھاتی۔ عرب شاعر متنبّی کو اس سلسلے میں استثناء قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم وہ محض زبان کے اعتبار سے عرب شاعر ہے اس کی روح سراسر عجمی ہے "

Stray Reflections ——————

پھر عرب شاعری میں شجاعت و جوانمردی ایک نمایاں صفت بن کر ابھرتی ہے۔ یہاں کوچۂ رقیب میں سر کے بل چل کر جانے کی روایت نہیں اور نہ ہی ہمیں شاعر ایک مقہور و مظلوم فریاد کناں کیفیت میں میں غرق نظر آتا ہے۔ عرب شاعری اس جواں لہو کی پکار ہے، جو میدان جنگ میں جانے کے تصور سے زیادہ کسی اور چیز کو محبوب نہیں سمجھتی اور جہاں چنگ و رباب کی بجائے شمشیر و سناں کی جھنکار سنائی جاتی ہے۔ چند اہم شعراء کے نمایاں نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

عمرو بن کلثوم التغلبی

اس کا سارا معلقہ انتخاب ہے، روح شجاعت و حماسہ کا اس سے بڑھ کر اظہار ممکن نہیں۔ بقول نکلسن فردوسی کا سارا شاہنامہ اس کے مقابلہ میں دریا برد کر دینے کے قابل ہے۔ اور بقول شبلی اس کو آج پندرہ سو سال بعد پڑھتے وقت بھی لوگوں میں لہو جوش مارنے لگتا ہے عمرو کہتا ہے :۔

إِذَا بَلَغَ الفِطَامَ لَنَا صَبِيٌّ تَخِرُّ لَهُ الجَبَابِرُ سَاجِدِينَا

جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھڑائے جانے کی عمر کو پہنچتا ہے تو بڑے بڑے جبار اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

حُصَین بن حُمام المری :

و لما رأیت الودلیس بنافعی عمدت الی الامر الذی کان احزما

جب میں نے دیکھا کہ دوستی سے کچھ کام نہ چلے گا تو میں نے اس طریقہ کار کا قصد کیا جو زیادہ موزوں اور محتاط تھا (جنگ)

فلست بمبتاع الحیاۃ بذلۃ ولا مرتق من خشیۃ الموت سلما

اس لیے کہ میں ذلت کے ساتھ زندگی کو خریدنے والا نہیں ہوں اور موت کے ڈر سے کسی سیڑھی پر چڑھ جانے والا ہوں۔

طرفہ بن العبد البکری (صاحب معلقہ) :

اذا القوم قالوا من فتی خلت اننی عنیت فلم اکسل ولم اتبلد

جب قوم یہ کہتی ہے کہ کون ہے تم میں جوان؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ہی مراد لیا گیا ہے۔ پھر میں نہ سستی دکھاتا ہوں نہ بزدلی۔

انا الرجل الضنوب الذی تعرفونہ خشاش کرأس الحیۃ المتوقد

میں وہ ہلکا پھلکا (جوان ہوں جسے تم سب پہچانتے ہوں۔ تیزی سے حرکت کرنے والا جیسے کسی چوکنے سانپ کا پھن ہو۔ (عرب میں دبلا ہونا پسند کیا جاتا تھا۔ موٹا آدمی سست ہوتا ہے۔ اور میدان جنگ کے کام کا نہیں ہوتا۔)

زُھَیر بن ابی سُلمٰی :

ومن ھاب اسباب المنایا ینلنہ وان یرق اسباب السماء بسلّم

اور جو شخص موت کے اسباب و دواعی سے ڈرے گا تو موت اس کو ضرور آلے گی چاہے وہ سیڑھی لگا کر آسمانوں ہی میں کیوں نہ جا پہنچے۔

ومن لم یذد عن حوضہ بسلاحہ یھدم ومن لا یظلم الناس یُظلَم

جو شخص اپنے حوض (مراد قیمتی سامان کہ ریگستانی عرب میں پانی ہی سب سے قیمتی ہوتا تھا) کا اپنے ہتھیاروں سے دفاع نہ کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا اور جو خود (پیش قدمی کرکے) لوگوں پر ظلم نہ کرے گا۔ اس پر ظلم کیا جائے گا۔

سَمَوءَل بن عادیا :

وانا لقوم مانری القتل سبۃ　　اذا مارا تہ عامر وسلول

ہم ایک ایسی قوم ہیں جو قتل کیے جانے کو عار نہیں سمجھتے. جبکہ عامر اور سلول (حریف قبائل) ایسا سمجھتے ہیں.

یقرب حب الموت اجالنا لنا　　وتکرھہ اجالھم و تطول

موت سے ہماری محبت ہماری اجل کو قریب کر دیتی ہے جبکہ ان (حریف قبائل) کی موتیں ان کو ناپسند کرتی ہیں. اس لیے ان کی عمریں طویل ہوتی ہیں. (عرب میں طویل العمری باعث عار سمجھی جاتی تھی)

وما مات منا سید حتف انفہ　　ولا طل منا حیث کان قتیل

ہمارا کوئی سردار فطری موت نہیں مرا (سب میدان جنگ میں قتل ہوئے) اور نہ ہمارا کوئی مقتول بغیر قصاص لیے چھوڑا گیا.

تسیل علی حد الظبات نفوسنا　　ولیست علی غیر الظبات تسیل

ہماری جانیں تلواروں کی دھاروں پر بہتی رہی ہیں، تلواروں کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں بہتی ہیں.

ودّاک بن شُمَیْل المازنی :

مقادیم وصّالون فی الروع خطوھم　　بکل رقیق الشفرتین یمان

یہ لوگ (میرے اہل قبیلہ) بہت آگے بڑھنے والے، سخت جنگ میں قدم ملا کر چلنے والے اور ہر یمنی دو تیز دھاروں والی تلواروں کو ساتھ لے کر چلنے والے ہیں (یمن اور ہندوستان کی تلواریں عرب میں عمدہ مانی جاتی تھیں)

اذا استنجدوا لم یسئلوا من دعاھم　　لأیۃ حرب أم بأیِ مکان

جب ان سے مدد طلب کی جاتی ہے تو یہ نہیں پوچھتے کہ بلانے والا کون ہے، کس جنگ میں بلایا گیا ہے اور کہاں جانا ہے (بس فوراً چل پڑتے ہیں)

زفر بن الحارث :

سقیناھم کأسا سقونا بمثلھا ولکنھم کانوا علی الموت اصبدا

ہم نے ان کو جو پیالہ پلایا تھا، ویسا ہی پیالہ انہوں نے ہم کو پلایا، لیکن وہ لوگ موت کے مقابلہ میں زیادہ ثابت قدم ہے (عرب شاعر اپنے دشمن کی تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا۔ یہاں وہ ان کی بہادری اور ثابت قدمی کا اعتراف کرتا ہے)

سعد بن ناشب :

اذا ھمّ القی بین عینیہ عزمہ ونکب عن ذکر العواقب جانبا

جب وہ (ممدوح) کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو اپنے اس عزم کو نظروں سے سامنے رکھ لیتا ہے اور انجام سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔

بنو قیس بن ثعلبہ کا ایک شعر :

انی لمن معشر أفنی اوائلھم قول الکماۃ : الا این المحامونا

میں اس گروہ (قبیلہ) سے ہوں جس کے اکابر (پہلے لوگوں) کو تیر اندازوں کے اس قول نے فنا کر کے رکھ دیا کہ کہاں ہیں (اپنے حسب نسب کی) حفاظت کرنے والے (یعنی میرے آباء اپنے حسب نسب کی حفاظت میں مارے گئے)

لو کان فی الألف منا واحد فدعوا من فارس خالھم ایاہ یعنونا

اگر ایک ہزار میں بھی ہم میں سے ایک آدمی ہو اور پکارا جائے کہ ہے تم میں کوئی سوار؟ تو وہ یہی سمجھے گا کہ پکارنے والوں کی مراد اسی سے ہے۔

عربی زبان :

اقبال عربی زبان کے متبحر عالم تھے۔ مولوی سید میر حسین کی شاگردی میں انہوں نے اس زبان کی نزاکتوں اور اس کے شعر و ادب سے جو فیض اٹھایا تھا وہ ان کے اشعار میں بھی جھلکتا ہے۔ علامہ خود کہتے ہیں۔

ع نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

علامہ اپنے ملنے والوں کو بھی عربی ادب کی جانب متوجہ کرتے تھے اور اس کی تحصیل کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ انہیں شکوہ تھا کہ عربی زبان وادب کا ذوق اٹھتا جا رہا ہے۔ اور وہ اس کے احیاء کی جانب متوجہ کرنا چاہتے تھے انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی سکیم میں بھی عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے ایک پروگرام مرتب کر کے دیا تھا۔ یہ سکیم جو علی گڑھ کے نظام تعلیم کو تبدیل کرنے اور اسے ایک مرکز علم و تحقیق بنانے کی جانب انتہائی اہم قدم تھا۔ افسوس کہ عمل میں نہ لائی گئی۔ اسے کتاب کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان وادب سے لاعلمی کی وجہ سے مختلف اسلامی ممالک میں بالعموم اور برصغیر میں بالخصوص اسلام اور اسلامی اقدار سے اغماض اور علم کے اس سرمایہ سے جو ہمارے اسلاف نے چھوڑا ہے بے تعلقی پیدا ہو گئی ہے۔ آج پڑھے لکھے افراد میں انگریزی اور فرانسیسی جاننے والوں اور ان کے ادب پر نظر رکھنے والے افراد کی مسلمان اہل تحقیق میں کمی نہیں لیکن ایسے افراد جو عربی ادب پر عبور رکھتے ہوں اور اسلاف کے علمی ورثہ سے بخوبی آگاہ ہوں خال خال ملتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس نظام تعلیم کے باعث ہوا جس کے بارے میں اقبال نے بڑے تلخ لیکن بڑے سچے لہجے میں کہا۔

ع اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

کلیسا کے اس نظام تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی زبانیں یعنی عربی اور فارسی آہستہ آہستہ نظر انداز ہوتی چلی گئیں۔ اور ان کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ یہ بات بظاہر عجیب نظر آتی ہے لیکن حقیقت ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ان دو اہم زبانوں سے تغافل کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔ عربی اور فارسی جاننے والے اب خال خال ہی نظر آتے ہیں عربی زبان کا اب عرب دنیا سے تعلقات کی وجہ سے کسی حد تک احیاء ہو رہا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ ملت اسلامیہ کے لیے یہ انتہائی خوش بختی کی بات ہے کہ عربی زبان کے ارتقاء اور اس کے ادب کی خدمات عربوں سے کہیں زیادہ عجمیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ اس

کے عظیم القدر محدث، فقیہوں، لغت نگاروں اور فلسفیوں کی بہت بڑی تعداد غیر عرب تھی۔ انہوں نے عربی زبان کو لاتعداد علوم کے جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیا۔ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد قرآن کی زبان کو اپنی زبان بنا لیا۔ ان کی تحریروں کا بہت بڑا حصہ عربی، ی میں لکھا گیا۔ جزائر انڈونیشیا سے لے کر مغربی افریقہ کے ساحل تک عربی زبان کی عالمگیریت پھیلی۔ یورپ میں مسجد قرطبہ میں عربی سوادِ تحریر اور مالٹا کی قبروں کے عربی کتبے ہوں یا چین کی مساجد کے خوبصورت عربی خط میں نقوش سب اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ عربی زبان نے ان تمام قوموں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا جنہوں نے قرآن کی ابدی تعلیم کو اپنا لیا۔

عربی زبان کی عالمگیری کے سلسلے میں ایک لذیذ حکایت کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا۔ نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں۔

"قیام انگلستان کی باتیں ہونے لگیں، رفقائے سفر کی اور اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا۔ ارشاد ہوا" لندن سے واپسی پر ہمارا جہاز عدن پہنچا تو مولوی شفیع داؤدی عرشۂ جہاز پر کھڑے گرد و پیش کے مناظر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب بھی تھی جو اتفاقاً سمندر میں گر گئی۔ مولوی صاحب پریشان ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں کہ دفعتہً ان کی نگاہیں ان صومالی لڑکوں پر پڑی جو چھوٹی چھوٹی کشتیاں لیے ادھر ادھر گھوم رہے تھے تاکہ مسافر چاہیں تو انہیں اپنی غوطہ خوری کے کرتب دکھائیں۔ مولوی صاحب نے جو انہیں دیکھا تو سمجھے کہ مشکل حل ہو گئی۔ چلائے اور کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکوں سے کہنے لگے یا شیخ یا شیخ ذالك الكتاب! بے چارے عربی تو جانتے نہیں تھے۔ یا شیخ اور ذالك الكتاب سے کام نکل گیا۔ لڑکے ان کے اشاروں سے سمجھ گئے کہ مطلب اس کتاب سے ہے جو سطح سمندر پر تیر رہی ہے اور قریب تھا کہ موجوں میں غائب ہو جائے۔ اس پر ایک نے کشتی سے پانی میں چھلانگ لگائی اور کتاب لے کر عرشۂ جہاز پر چڑھ آیا۔ مولوی صاحب نے اطمینان کا سانس لیا کہ کتاب مل گئی واقعہ دلچسپ تھا ہم سب کو ہنسی آ گئی۔"

حضرت علامہ بھی شگفتہ خاطر تھے۔ انہوں نے حقے کے دو ایک کش لیے اور کہنے لگے۔

"زبان بھی اتحاد کا کتنا بڑا ذریعہ ہے۔ افسوس ہے یورپ کے استیلاء نے اس رشتے کا بھی

ح۱ بہار میں تحریک خلافت کے پُرجوش رہنما اور سابق ہندوستان میں مرکزی اسمبلی کے رکن۔

خاتمہ کر دیا کتنے مسلمان ہیں جو عربی جانتے اور اپنا ما فی الضمیر اس میں ادا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ عربی ہماری بین الاقوامی زبان ہے۔ ہمارے دینی، ثقافتی اور ادبی رابطے کا ایک عظیم سرچشمہ"[1]

علامہ اقبال عربی زبان کی دلکشی (Charm) کے بے حد قائل تھے ان کا کہنا تھا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خود ان کے شعر کا آہنگ بنیادی طور پر حجازی لے سے متاثر تھا۔ وہ جو امردی جو ہمیں اقبال کے یہاں ملتی ہے عربی زبان و ادب کا ایک خاصہ ہے جس سے دنیا کی دیگر زبانوں کا ادب بڑی حد تک تہی دامن ہے

جہاں آپ عربی زبان کو اس کی دلکشی، اس کے مردانہ اور جرأت مندانہ آہنگ کی وجہ سے پسند کرتے تھے وہاں اس کے ساتھ محبت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ قرآن کی زبان ہے۔ اسے جانے بغیر قرآن حکیم کے حیات بخش اور حیات پرور پیغام کی اصل روح کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ برصغیر میں قرآن پاک اور اس کے مطالب کو سمجھنے میں جہاں کہیں مختلف افراد کو ٹھوکر لگی ہے اس کی اصل وجہ عربی زبان و ادب کا صحیح ذوق نہ ہونا تھا۔ جب تک محاورۂ عرب اور جاہلی دور کے ادب پر گہری نظر نہ ہو قرآن حکیم کے اسلوب کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ ہمارے یہاں قناعت و توکل کے مطالب اس سے بالکل مختلف لیے جاتے ہیں جو اصل عرب محاورے میں ہیں۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ بڑی دردمندی سے سراج الدین پال صاحب کو لکھتے ہیں۔ (۱۹۴ ص "ہندی مسلمان ... تا بے نقاب کہیں"

"اسلام کی اصل روح کو پہنچنا اور ہندی اور یونانی تخیلات سے اسی صورت میں بچنا ممکن ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک کا گہرا مطالعہ کیا جائے" علامہ مثنوی مولانا روم کی اہمیت کے بھی قائل تھے کیونکہ یہ منطق و فلسفہ کی راہ سے نہیں بلکہ خود قرآن کی راہ سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ حکیم محمد حسین عرشی صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ اسلام اور اس کے حقائق کے لذت آشنا ہیں۔ مثنوی رومی کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے؛ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے

---

[1] (اقبال کے حضور - ص - ۵۱)

مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔ افسوس ہے ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے ؎

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

بہر حال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیے۔ مجھ سے بھی کبھی کبھی ملتے رہے۔ اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں، بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتے۔ یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے۔ جن کو جاننے والے مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔"

اسے اقبال کا اعجاز کہیے کہ وہ نسل جو شیکسپیئر اور ملٹن ہی کو اپنا قبلہ مقصود قرار دے چکی تھی، آج واپس قرآن کی طرف پلٹنے کے لیے مشتاق ہے اقبال نے قرآن حکیم کے اصولوں پر اپنی شاعری کی عمارت تعمیر کی اور اس حُسنِ اسلوب کی ایک جھلک اردو شعر و ادب میں دکھلا دی جس نے عرب کے صحرا نشینوں قیصر و کسریٰ کا وارث بنا دیا تھا۔ وہ نسل جو عجم کے خیالات کی گرویدہ تھی اور افرنگ کے سحر میں مبتلا تھی پھر عرب کے سوزِ دروں سے مالا مال ہو گئی۔ ۔۔۔۔۔ خاتمہ باب۔

۹۱ اسے یہاں ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت و توکّل کے وہ معنی لیے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔ کل میں ایک صوفی مفسر قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ لکھتے ہیں "خلق الارض والسمٰوات فی ستۃ ایام" میں ایام سے مراد تنزلات ہیں۔ یعنی فی ستۃ تنزلات ہیں۔ کم بخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان میں "یوم" کا یہ مفہوم قطعی نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ تخلیق با تنزلات کا مفہوم ہی عربوں کے کے مذاق اور فطرت کے مخالف ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے

لہ (بنام حکیم محمد حسین عرشی ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء اقبال نامہ اوّل ص ۲۷ - ۲۸)

قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے ہیں. کاش کہ مولانا نظامی کی دعا اس زمانے میں مقبول ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں.[1]

---

[1] (بنام سراج الدین پال ۱۹ جولائی ۱۹۱۶ء اقبال نامہ اوّل ۴۱)

علامہ کی زندگی کا ایک پہلو لائق صد توجہ ہے کہ انہوں نے علم کے معاملے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ یہی نہیں کہ ان کو جو کچھ علم تھا وہ دوسروں تک پہنچاتے رہے بلکہ دیگر اصحاب کو مختلف علمی کاموں کی طرف توجہ بھی دلاتے رہے۔ کچھ حضرات کا یہ رویہ ہوتا ہے کہ جس موضوع پر خود کام کرنا چاہتے ہوں چاہے وہ خود نہ کر سکیں لیکن اس بات کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس کام کو ہاتھ نہ لگائے۔ اقبال کا رویہ اس کے بالکل برعکس تھا وہ خود تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنا چاہتے تھے لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ کوئی اور صاحب لکھنا چاہتے ہیں تو ان کے خط کے جواب میں یوں لکھا:

"مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں۔ میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں، مگر افسوس کسی نے توجہ نہ کی۔ آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔

افسوس ہے کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی اور نیز مسلمانوں کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی حفاظت کے لیے ایک سوسائٹی بنائیں؟ ہاں تذکرۂ کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعر العجم آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ محض حروف تہجی کی ترتیب سے شعراء کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا۔ کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بارآور ثابت ہوگی۔ اگر کبھی خود کشمیر میں یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کا کورس ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔ امید ہے جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ میرے

پاس کوئی مسالہ تذکرہ شعراء کے لیے نہیں ہے ورنہ آپ کی خدمت میں ارسال کرتا"۔[1]

علامہ علمی تحقیقات سے جو گہری دلچسپی رکھتے تھے اس کا اندازہ ان کے ان مکتوبات سے لگایا جاسکتا ہے۔ پھر حوصلہ افزائی کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔ ظاہر ہے کہ مکتوب الیہ علامہ کی نسبت علمی طور پر کہیں فروتر ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود کسی طور اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ جابجا حوصلہ افزائی اور مبارکباد کے فقرات، دعائیں، آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت فرمائے، نظر آتے ہیں۔ سید نفیر الدین ہاشمی نے، دکن میں اردو، بھیجی تو اس کے جواب میں رقم طراز ہیں۔

"دکن میں اردو، نہایت مفید کتاب ہے۔ خصوصاً اس کا پہلا حصہ جو میں نے نہایت غور سے پڑھا ہے۔ اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لیے جس قدر مسالہ ممکن ہو جمع کرنا ضروری ہے۔ غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہو گئی تو مورخ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے"۔[2]

جب ان کی دوسری تصنیف 'یورپ میں دکھنی مخطوطات' انہیں ملی تو اس پر انہوں نے دوبارہ مبارکباد بھیجی اور مصنف کی خوب حوصلہ افزائی کی اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ وہ خود اپنے کلام میں مسلم علماء کے مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

؎ مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
انہیں یورپ میں گر دیکھیں تو دل ہوتا ہے پیارہ

لکھتے ہیں "مخدومِ من، یورپ میں دکھنی مخطوطات، کا نسخہ جو آپ نے بکمالِ عنایت مجھے مرحمت فرمایا ہے اس کے لیے نہایت شکر گذار ہوں۔ یہ کتاب اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ میں نہایت مفید ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی مفید تالیفات کا سلسلہ جاری رکھ سکنے میں کامیاب ہوں گے۔ ابھی بہت سے مواد کا جمع ہونا اور بہت سی کتابوں کے صحیح ایڈیشنوں کا چھپنا باقی ہے کہ اردو کے ارتقاء کی ایک صحیح تاریخ مدون ہو سکے۔ آپ کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے اور میں آپ کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

---

[1] بنام ظہور الدین مہجور اقبال نامہ اوّل ۵۸ - ۵۹،

[2] بنام سید نفیر الدین ہاشمی، مئی ۱۹۲۵ء اقبال نامہ اول ص ۶۰)

علمی تحقیق علامہ کے علمی ذوق کا حال ان کے خطوط سے کھلتا ہے جس میں وہ کتب کے لیے بار بار پوچھتے ہیں۔ مختلف موضوعات سے علامہ کی دلچسپی کا پتہ بھی انہی خطوط سے چلتا ہے۔ علامہ مولوی صالح محمد صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"حضرت خواجہ نظام الدین صاحب سے یہ بھی معلوم کیجیے کہ آیا ان کے بزرگوں کے کتب خانے میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا وہ رسالہ موجود ہے، جس میں انہوں نے آسمانوں اور سیاروں کی سیر کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اس کی مدت سے تلاش ہے اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ آج تک شائع بھی کسی نے نہیں کیا۔ اگر وہ رسالہ ان کے پاس نہیں تو ممکن ہے اسی مضمون کا کسی اور بزرگ کا رسالہ ہو۔" [1]

مولوی صاحب نے اپنی پوری کوشش کی کہ مطلوبہ رسالہ مل جائے۔ ان کی اس تلاش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آپ نے نسخہ مطلوبہ کی تلاش میں جو زحمت گوارا کی۔ اس کے لیے جناب خواجہ صاحب کا اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ ادھر کے نادر الوجود قلمی نسخوں کی ایک فہرست شائع کر دیں تو عہد حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں پر ایک احسان عظیم ہو گا اور نیز ایک بڑی علمی خدمت ہو گی۔ افسوس مسلمانوں کا علمی سرمایہ ہندوستان میں بالکل ضائع ہو گیا۔ اور آج یورپ والے یہ طعنہ دینے کے لائق ہوئے کہ ہندوستانی مسلمان علمی دولت سے بالکل تہی دست تھے۔ سر السما کا ذکر میں نے آج تک نہیں سنا۔ اس کتاب کی تلاش بھی جاری رکھیے۔ میں نہایت ممنون ہو گا اگر سر السما ہی مل جائے۔ شاید بہاولپور سے ملے۔" [2]

سر السما ہی کے سلسلے ایک اور مکتوب ملاحظہ ہو۔ اس سے علامہ کے علمی تجسس اور شغف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے نام ہی ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] (بنام مولوی صالح محمد، تاریخ ندارد، اقبال نامہ دوئم ص ۳۷۳ - ۳۷۴)

[2] (بنام مولوی صالح محمد ۱۹ جون ۳۰ء، اقبال نامہ دوئم ص ۳۷۴ - ۳۷۵)

"حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں میری طرف سے خاص طور پر شکریہ ادا کیجیے۔ میں ان کا نہایت شکر گذار ہوں کہ انہوں نے سر السماء کے متعلق اس قدر دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ معلوم نہیں کتاب مذکورہ قلمی ہے یا طبع شدہ۔ اگر قلمی ہے تو معلوم نہیں حجم کس قدر ہے اور کس زبان میں ہے۔ بہر حال اگر خواجہ صاحب کسی آدمی کو بھیج دیں تو بہت مہربانی ہو گی۔ اس طرح کتاب جلد مل جائے گی اور میں اس سے اپنی کتاب کو ختم کرنے سے پہلے مستفیض ہو سکوں گا۔ میں نے شاید آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میرا مقصود سر السماء کے مطالعہ سے علمی تحقیقات نہیں ہے۔ علمی سے میری مراد وہ تحقیق ہے جس کا دارومدار علم ریاضی پر ہو اور جس کے مشاہدات کے لیے دوربینوں کی ضرورت ہو۔ میرا مقصود اس تحقیق سے ہے جس کی بنیاد مکاشفاتِ قلبی پر ہو۔ چونکہ آپ کے والد ماجد سر السماء کو دیکھ چکے ہیں، اس واسطے مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے گوہر مقصود ہاتھ آئے گا۔۔۔۔۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ کتاب سر السماء کے حصول میں عجلت فرمائیے۔"[1]

کتاب کے سلسلے میں علامہ کی بے چینی اور عجلت اس بے تاب فطرت کا پتہ دیتی ہے جو مبداءِ فیض سے علامہ کو عطا ہوئی تھی۔ یہی شرابِ علم کی لذت تھی جو اقبال کو مغرب کے میخانوں میں لیے پھری۔ اور اسی کے لیے وہ زندگی کے ہر لمحے میں بے چین رہے۔ سر السماء کی طلب کا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا کہاں تھا۔ یہ کتاب اسرار میں داخل تھی اور وہ بھی اسرارِ سماء چنانچہ اس کے حصول میں دیر لگنا ظاہر تھا۔ ایک بار اور علامہ نے لکھا۔

"کتاب سر السماء کے حصول میں خواجہ صاحب جو سعی بلیغ فرما رہے ہیں اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔

(۱) میں نے بھی آج مولوی شمس الدین صاحب کی خدمت میں خط لکھا ہے۔ وہ خود علمی ذوق کے آدمی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت خواجہ صاحب نے ان کو لکھا ہے۔ یقین ہے کہ پوری کوشش کریں گے۔ اگر کتاب مفید مطلب نکل آئی تو اپنی کتاب کے دیباچے میں اس کا ذکر کرنا ہو گا اور اس سلسلہ میں علامہ عبدالعزیز مصنف کتابِ مذکور کا ذکر بھی ضروری ہو گا۔

---

[1] بنام مولوی صالح محمد، ۲۵ جولائی ۳۰ء، اقبال نامہ دوم ص ۳۷۶ - ۳۷۷

علاوہ اس کے خواجہ صاحب موصوف کا بھی جن کی وساطت سے کتاب حاصل ہوئی۔
ان امور کے متعلق آپ کو کتاب دیکھنے کے بعد تکلیف دوں گا۔

(۱) ہندوستان کے علمی ذخیرے کی فہرست جس کا ذکر علامہ پہلے خط میں کر چکے تھے۔

(۲) فہرست کتب خود تیار کیجیے۔ لیکن اگر آپ لاہور آئیں تو زمانہ حال کی تیار شدہ فہرستیں ضرور ملاحظہ کریں۔ ان کی ترتیب کا طریق اور ہے اور بہت زیادہ مفید۔ آپ نے القدیم کی فہرست دیکھی ہو گی۔ اس نمونہ کی ہونی چاہیے لیکن صرف نایاب کتب ہی کا ذکر ہو تو بہتر ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے میں علی گڑھ یونیورسٹی کو لکھوں گا کہ آپ کی مدد کرے۔[1]

یہ کتاب جن صاحب کے پاس تھی وہ اس کو عاریتاً دینا پسند نہ کرتے تھے لیکن علامہ نے اس کا بھی حل ڈھونڈھ نکالا۔ وہ مولوی صاحب کو لکھتے ہیں۔

"میں اس کتاب کے لیے خود نواب صاحب بہاولپور کی خدمت میں لکھتا۔ مگر اس معمولی بات کے لیے ان کو زحمت دینا پسند نہ کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مولوی احمد سعید صاحب کتاب عاریتہً نہ دیں گے۔ یہ بخل ایک مدت سے مسلمانوں کے لاحق حال ہے خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے۔ ان حالات میں شاید یہ بہتر ہو گا کہ خواجہ صاحب بہاولپور سے کسی ایسے آدمی کو مقرر فرما دیں جو اس کتاب کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو اور مولوی صاحب احمد سعید سے صرف کتاب کے دیکھنے کی اجازت مانگی جائے اور مقررکردہ بزرگ مولوی احمد سعید صاحب کی موجودگی میں کتاب مذکور کا وہ حصہ دیکھیں جس کا تعلق سیاراتِ سماوی اور متعلقہ امور سے ہے اگر وہ کتاب علم ہیئت کی ہے تو اس کی ضرورت نہیں (یعنی میرے مقاصد کے لیے) اور اگر اس کے مضامین مکاشفاتی ہیں تو جستہ جستہ نوٹ سیارات کے متعلق اس کتاب سے لے لیے جائیں اور مجھ کو وہ نوٹ ارسال کر دیئے جائیں۔ اس طریق سے مولوی احمد سعید کتاب عاریتہً دینے کی زحمت سے بچ جائیں اور میرا کام ہو جائے گا۔"[2]

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بالآخر کتاب علامہ کو مل گئی یا نہیں اور آیا یہ طریق کار جس کا اوپر کے

---

[1] (بنام مولوی صالح محمد، ۴ اگست ۳۰ء، اقبال نامہ حصہ دوئم ص ۳۷۸ - ۳۷۹)

[2] (بنام مولوی صالح محمد ۹ اگست ۳۰ء اقبال نامہ حصہ دوئم ص ۳۸۰ - ۳۸۱)

خط میں ذکر آچکا ہے عملی طور پر پیش آیا یا نہیں۔ علامہ نے اس اثناء میں ایک اور ذریعہ ڈھونڈھ نکالا تھا۔ علامہ سر السماء کے اسرار کو معلوم کرنے پر تلے ہوئے تھے زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب کھود نکالی ہوگی۔ اس موضوع پر آخری خط جو ہمیں ملتا ہے اس سے اس جستجو کے آخری مرحلے کا پتہ چلتا ہے۔

"حضرت خواجہ کی خدمت میں میری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کیجیے کہ سر السماء کے لیے انہوں نے بہاولپور خط لکھنے کی زحمت گوارا کی۔ میں نے بھی وہاں ایک دوست سے خط و کتابت کی تھی۔ معلوم ہوا کہ شمس الدین صاحب کا کتب خانہ محفوظ ہے اور ان کے بیٹے ریاست کی ملازمت میں ممکن ہے وہ کتاب (سر السماء) اس کتب خانے میں محفوظ ہو۔ اگر یہ کتاب مل گئی اور میرے مطلب کو موافق ہوئی تو امید ہے بہت فائدہ ہوگا۔"[1]

اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کو یہ کتاب جاوید نامے کے سلسلے میں چاہیے تھی۔ کیونکہ ایک اور خط سے پتہ چلتا ہے کہ جاوید نامہ ختم ہوگئی اور کاتب کے حوالے ہونے والی ہے۔[2]

اس سلسلے میں علامہ نے یقیناً درجن بھر سے زاید خط لکھے ہوں گے کیونکہ چھ خطوط جو دستیاب ہو سکے ہیں ان میں اس کتاب کا ذکر ہے اہل تحقیق ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ وہ ایک کتاب کے لیے کیا اس طرح بے چین ہونے اور اتنے خطوط لکھنے اور اتنی مایوسیوں کے باوجود حوصلہ نہ ہارنے کا جگر رکھتے ہیں۔

علمی کام

مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک خط میں آپ ان سے حافظ ابن قیم کی تصنیفات منگواتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"الطریق الحکمیہ فی سیاستہ الشرعیہ (حافظ ابن قیم) اور اعلام الموقعین مرحمت فرمائیے۔[3] یہ بھی فرمائیے کہ مولوی عبدالقادر[4] صاحب قصور سے تشریف لائے یا نہیں۔[5]

---

[1] (بنام مولوی صالح محمد تاریخ ندارد، اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۸۲ - ۳۸۳)

[2] (بنام مولوی صالح محمد، ۲۲ اپریل ۳۱ء، اقبال نامہ دوم ص ۳۸۷)

[3] یہ دونوں کتب حافظ ابن قیم کی تصنیفات ہیں۔ ان کا موضوع فقہی مسائل ہیں۔ علامہ نے مدارس میں لیکچر دینے کے لیے ان کتب سے استفادہ کیا تھا۔) باقی اگلے صفحے پر

اسی طرح مدراس کے لیکچروں کی تیاری کے سلسلے میں میر صاحب سے ایک اور کتاب منگواتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"میں نے سنا ہے امام ابن تیمیہ کی کتاب التقدیر[1] کا اردو ترجمہ ہو کر چھپ گیا ہے۔ اگر یہ کتاب مل سکے تو اس کا ایک نسخہ بہم پہنچائیے۔"

انہیں ایک اور رسالہ کے لیے بھی لکھتے ہیں

"رسالہ معارف بابت ماہ اگست ۲۹ء اگر آپ کے پاس ہو تو بھجوائیے۔ اس میں ایک مضمون سنت پر ہے اسے دیکھنا مطلوب ہے"[2]

علامہ کا علمی ذوق اسدرجہ بلند تھا کہ ان کی نظر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ہر نوع کے مواد پر رہتی تھی۔ قلمی مخطوطات ہوں یا چھپی ہوئی کتب انہیں اس بات کی خواہش رہتی ہے کہ ان کے ذوق اور دلچسپی کی چیزیں انہیں فراہم ہوتی رہیں۔ وہ اس امر کے لیے بیرونِ ملک میں لکھنے اور ہندوستان کے ہر گوشے میں بھی ان کی نظر رہی۔ یہی نہیں جو کام ابھی زیر تکمیل ہوئے ان کے بارے میں بھی انہیں معلومات رہا کرتیں۔ محمد دین فوق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

"ذخیرۃ الملوک کے دیکھنے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ کوئی شخص کشمیر میں اس کا ترجمہ اردو زبان میں کر رہا ہے"[3]

"ذخیرۃ الملوک امیر کبیر سید علی ہمدانی کی مشہور تصنیف ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے انہیں شاہ ہمدانؒ کے نام سے پکارا ہے۔

[2] مولوی عبدالقادر صاحب قصوری تحریک آزادی کے نامور رہنماؤں میں سے تھے علامہ اقبال سے ان کے گہرے مراسم تھے۔

[3] (بحوالہ انوارِ اقبال۔ ص ۸۹) ایضاً ص ۹۳

[1] کتاب التقدیر کا اصل نام "شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل" ہے اس کا اردو ترجمہ کتاب التقدیر کے نام سے چھپا تھا۔ یہ حافظ ابن قیمؒ کی تصنیف ہے۔ ابن تیمیہ کی نہیں)

[2] بحوالہ انوار اقبال ص ۹۰

علامہ نے یہ خط نظام الدین ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر پولیس جموں کے اس اشتہار پر تحریر کیا تھا جس میں ۱۴ قلمی نسخوں (بشمول ذخیرۃ الملوک) کے طبع کرانے کا اعلان کیا گیا تھا۔[۱]

علامہ کے خطوط میں مختلف افراد سے مختلف مسائل اور کتب کے بارے میں استفسارات پائے جاتے ہیں۔ کبھی کسی کو خاص مسئلے کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ کبھی خود اپنے لیے معلومات فراہم کرنے کے لیے خط لکھا جا رہا ہے تو کبھی مخطوطات کی جستجو جاری ہے۔ یہ دریافت کیے جانے والے امور علامہ کے سینے میں علم کے بارے میں نہ ختم ہونے والی پیاس کے مظہر ہیں۔ پھر ملت اسلامیہ کے بارے میں دردمندی اور فکر، اسلامی رسوم کے خیالات کے بارے میں جستجو غرض ہر مسئلہ کے بارے میں اقبال کا دل دردمند ان خطوط میں جھلک رہا ہے۔ علامہ کے ان استفسارات کو پڑھنے کے بعد علامہ کے اس شعر کا مزا دوچند ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعی ان کی دلی کیفیات کا غماز ہے۔ آپ فرماتے ہیں

ع اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کے نام مختلف خطوط میں فرماتے ہیں۔

"اگر برڈن کی لائبریری ہسٹری اوف پرشیا کالج لائبریری میں ہو تو لیتے آیئے اس جلد کی ضرورت ہے جس میں عراقی کا تذکرہ ہے غالباً دوسری جلد ہے"[۲]

"آپ نے یونیورسٹی لائبریری سے Medieval سائنس پر ایک کتاب نکلوا کر مجھے ارسال کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ میں اس کا منتظر ہوں"[۳]

"آپ کے پاس راغب اصفہانی کی مفردات ہو تو چند روز کے لیے بھیج دیجیے یا خود لے کر آئیے۔ لفظ "سلطان" اور "شان" جو سورۃ الرحمٰن میں واقع ہوئے ہیں ان کے معانی دیکھنا مطلوب ہیں"[۴]

---

[۱] انوار اقبال ص ۷۵

[۲] بنام ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی ۵ اگست ۱۹۲۶ء (اقبال نامہ دوئم، ۲۳۱)

[۳] ایضاً ص ۳۳۵ [۴] ایضاً ص ۲۳۱

،آپ نے کتاب Art and the unconscious بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے حافظہ سے یہ بات اتر گئی۔ مہربانی کر کے بلد بھجوا دیجئے ایضاً ۳۳۴ ص

،آپ خصوص الحکم کا قلمی نسخہ جو آپ کے پاس ہے ایک دن کے لیے مرحمت فرمائیے ایضاً

کاش یاجوج وماجوج پر

خطوط بنام سلیمان ندوی

آپ کوئی مضمون لکھتے، یہ امر تحقیق کا محتاج ہے

(۱۰۸ اول)

دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلاء کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لاتے ہیں، یہ ہدیہ یا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں، اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں۔ کیا یہ مال مسلمان کے لیے حلال ہے؟ (۱۱۰ اوّل)

،کیا حکمائے صوفیہ اسلام میں سے کسی نے زمان و مکاں کی حقیقت پر بھی بحث کی ہے، (اوّل ۱۱۵)

،مردان خدا خدا بنا شند لیکن ز خدا جدا بنا شند کس کا شعر ہے؟ ایک امر کے لیے اس کی تحقیق ضروری ہے (اول ۱۲۱)

،مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے یا قلمی؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریۃً ملے گا؟

علی ہذا القیاس مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کی، طبقات، قاضی محب الا کے جوہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی؟ (اوّل ۱۲۲)

،ابن عربی کے بحث زماں کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہو گی۔ آپ کے ملخص کی روشنی میں کتاب میں خود پڑھوں گا (اوّل ۱۲۴)

،رسالہ ذخیرۃ الدینیہ جاوا سے نکلنا شروع ہوا ہے آپ کی خدمت میں بھی پہنچا ہو گا، ایڈیٹر دانشمند اور افکار معلوم ہوتا ہے اور مضامین اچھے لکھتا ہے، ہر مہینہ احادیث نبوی کے متعلق کچھ نہ کچھ اس میں ضرور ہوتا ہے۔ گذشتہ ماہ کے پرچہ میں وہ لکھتے ہیں "خلیلی فی ہذہ الامتہ اولیس

القرنی " موضوع ہے اور امام مالک کے نزدیک اویس کا کوئی تاریخی وجود ہی نہیں آپ حضرت اویس اور ان تمام صوفی روایات کے متعلق جو ان سے منسوب ہیں کیا خیال رکھتے ہیں ؛ اگر حضرت امام مالک کی تحقیق زیرِ نظر ہو تو ازراہِ عنایت حوالے سے آگاہ فرمایئے۔ (اوّل ۱۲۵)

"کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی ؟ اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے۔ مفتی عالم جان جن کا حال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تحریک کی اصل غایت کیا تھی ؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود ایک مذہبی انقلاب بھی تھا ؟ (اوّل ۱۲۹)

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے۔ لاتسبوا الدھر الخ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی۔ (اوّل ۱۵۶)

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند کر کے مجھے ارسال فرمائیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا۔ صرف خلاصہ چاہتا ہوں۔ جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا۔ (اول ۱۵۸)

(۱) "حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے ؛ حوالے مطلوب ہیں۔

(۲) حضرت صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمایئے۔

(۳) متکلمین کے نقطہ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کون سی کتاب میں ملے گی ؛ امام رازی کی مباحث شرقیہ میں آج کل دیکھ رہا ہوں۔

(۴) ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون کون سے ہیں اور ملا محمود جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفہ بھی ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوئے ؟ ان کے اسماء سے مطلع فرمایئے اگر ممکن ہو تو ان کی بڑی بڑی تصنیفات سے بھی" (اوّل ۱۶۴ - ۱۶۵)

"ہندی فلسفی ساکن پھلواری مصنف تسویلات فلسفہ کا نام کیا ہے؟ اور کتاب مذکور طبع ہوئی یا نہ۔ اگر نہیں طبع ہوئی تو قلمی نسخہ اس کا کہاں سے دستیاب ہوگا..... نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان جو رامپور میں ہے کس زبان میں ہے قلمی یا مطبوعہ، نور الاسلام کا زمانہ کون سا ہے۔

ملا محب اللہ بہاری" کی کتاب جوہر الفرد کہاں سے ملے گی؟ (اول ۱۶۷)

کیا مسلمان ریاضی دانوں میں کوئی اس بات کا بھی قائل ہوا کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں؟ یا نہیں۔ شاید نصیر الدین طوسی نے ایسے امکان کا کہیں ذکر کیا ہے مگر حوالہ یاد نہیں۔

آپ کے بدایوں میں ایک بزرگ ہیں جنہوں نے کچھ مدت ہوئی ایک رسالہ علم ہیئت پر شائع کیا تھا۔ غالباً کسی یونانی رسالے کا عربی ترجمہ تھا۔ مہربانی کر کے ان سے دریافت فرما کر مجھے مطلع فرمائیے۔

آپ نے ملکیتِ زمین کے متعلق امام محمدؒ کی کسی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ مہربانی کر کے مطلع فرمائیے کہ کتاب مذکور کہاں سے دستیاب ہوگی نام بھی کتاب کا پڑھا نہیں گیا۔

کیا آپ کسی ایسے بزرگ کا نام تجویز فرما سکتے ہیں۔ جس کی نظر فقہ اسلام اور اصول فقہ و تفسیر پر وسیع ہو بعد جو شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور ان کی کتابوں پر پوری بصیرت رکھتا ہو۔ اگر کوئی ایسے بزرگ مل جائیں تو میں ان کو اپنی کتابوں کے سلسلے میں کچھ مدت کے لیے اپنے پاس رکھ لوں گا اور اس مدد کا جو مجھے ان سے ملے گی مناسب معاوضہ دوں گا۔

یہ تمام تحقیق طلب امور جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے، علامہ کی علم سے انتہائی گہری وابستگی اور نہ ختم ہونے والی تشنگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پھر علامہ کی دلچسپی کی وسعت بھی قابل غور ہے۔ علم ہیئت ہو یا ریاضی کے مسائل، ملکیت زمین کے مسائل ہوں یا فقہ، حقیقتِ زمان، تاریخ، ابن عربی، ادبیات، احیائے اسلام کی تحریکات، اقبال کی دلچسپی کے موضوعات کا تنوع قابل دید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری میں ایک دائرۃ المعارف (Encyclopaedia) کی

(بنام سید محفوظ علی بدایونی ۲۱ دسمبر ۱۹۳۳ء اقبال نامہ اول ص ۲۴۷)

(بنام مولوی احمد رضا صاحب بجنوری ۲۳ ستمبر ۳۶ء اقبال نامہ حصہ دوم، ص ۲۴۱-۲۴۲)

سی وسعت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ نہیں کہ علامہ ان تمام مسائل سے سطحی سا ربط رکھتے ہوں، آپ نے جس موضوع کے بارے میں معلومات اکٹھا کیں اسے انتہائی گہرائی سے دیکھا اور پرکھا۔ قرآن حکیم کی روشنی میں ان کے بارے میں اپنی رائے قائم کی۔ پھر ان کے پاس جاوا (انڈونیشیا) سے لے کر سپین تک ہر جگہ کے لوگوں کے خطوط، کتابیں، رسالے آتے تھے۔ آپ سے ملنے والوں میں بھی یہی تنوع تھا۔ آسٹریا کے علامہ اسد ہوں یا دمشق کے ڈاکٹر احسان حقی، ہند کے نابغۂ روزگار مولانا انور شاہ کاشمیری ہوں یا شیخ الازہر حیدر آباد دکن سے مولانا مودودی ہوں یا کشمیر سے منشی سراج الدین سب سے یکساں تعلقات۔ پھر اس میں مذہب کی قید بھی نہ تھی سوامی تیرتھ جی سے لے کر نکلسن اور آرنلڈ تک سب سے ایک گونہ ربط۔ ان تمام علمی تعلقات، یورپ میں تعلیمی مصروفیات اور کتابوں سے والہانہ عشق نے انہیں علم سے بے نیاز نہیں کیا بلکہ علامہ کی تشنگی کو دوچند کر دیا۔ تحقیق طلب امور کی... مکمل فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہو گی۔ یہ ممکن ہے تھکا دینے والی ہو لیکن اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ کے طالب علم میں آخر وقت تک کوئی کمی نہیں آئی۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک انہیں اس بات کی خواہش تھی کہ کوئی بزرگ اصولِ فقہ و تفسیر پر گہری نظر رکھنے والے مل جائیں تو ان کے علمی کاموں میں ان کی معاونت کریں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کا نام بھی تجویز ہوا۔ خود مولانا مودودی کو دکن سے پنجاب بلانے میں بھی ممکن ہے یہی مصلحت شامل ہو کیونکہ علامہ نے سال کا کچھ حصہ دارالاسلام میں بسر کرنے کے بارے میں فرمایا تھا۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔

جہاں علامہ علمی تحقیق کے بارے میں اعلیٰ درجے کا ذوق رکھتے تھے۔ وہاں آپ کے اس بارے میں واضح نظریات بھی تھے۔ علم کے موضوع پر اتنے نادر نکات ایک جگہ شاید ہی کہیں ملیں۔

علمی تحقیق کے بارے میں علامہ کے نظریات کا تذکرہ کرتے ہوئے سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب "اقبال کے حضور میں" یوں لکھا ہے۔

علامہ نے فرمایا" دراصل اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ نئے تجربات کے ساتھ ساتھ پرانے تجربات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ نظری علوم میں تو ایسا کم ہوتا ہے لیکن ان علوم

کے عملی اطلاق میں ، یا جب ان کی بنا پر کسی فن کی تشکیل ہوتی ہے تو یہ غلطی اکثر سرزد ہو جاتی ہے مثلاً طب میں کہ اہل یورپ نے اگرچہ یہ فن مسلمانوں سے سیکھا۔ اس کی علمی اور فنی اساسات کے لیے وہ مسلمانوں کے مرہون منت ہیں لیکن اپنی علمی ترقیات، اجتہادات اور اکتشافات کے زعم میں وہ اپنے پیشروؤں کے سرمایہ معلومات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ انداز بڑا غلط ہے" (ص ۳۹۲)

علامہ کے علاج کے سلسلے میں حکیم قرشی صاحب نذیر نیازی صاحب کے ہمراہ آئے ہوئے تھے اس لیے طب کے موضوع پر تحقیقات زیر بحث رہیں۔

ارشاد ہوا، "دواسازی اور غذا کے بارے میں تو اس انداز نے حد درجہ تعصب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگر اس کا نام علم ہے تو یہ علم نہیں ہے۔ انہیں مسلمانوں سے سبق لینا چاہیے۔ انہوں نے قدما کی خدمات کو بھی اس رنگ میں نہیں دیکھا جیسے اہل یورپ مسلمان اطباء کی خدمات کو دیکھتے ہیں اور خواہ مخواہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے ان کی حیثیت صرف متبعین کی تھی۔ وہ ایک طرح سے صرف بقراط اور جالینوس وغیرہم کی معلومات کے بھروسے زندہ تھے اور ان کے اپنے کوئی اجتہادات ہیں نہ اکتشافات"

آپ نے حکیم صاحب کو مغرب کی تاجرانہ تنگ نظری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ وہ اس میدان میں مغرب کا پول کھولیں اور ساتھ کے ساتھ ہمارے اپنے حکماء نے جو تحقیقات کی ہیں ان کا جائزہ بھی لیں۔

ارشاد ہوا" اہل یورپ کے یہ خیالات غلط ہیں، سراسر غلط۔ یہ تعصب ہے، تنگ نظری ہے، سیاست ہے، تجارت ہے۔ حکیم صاحب یہ آپ کا کام ہے۔ آپ حضرات کوشش کریں، آپ کا فن زندہ رہے۔ یہ غلط فہمیاں دور ہوں۔ حکیم صاحب حالات بدل رہے ہیں۔ حالات کے ساتھ زندگی، بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھیے۔ علوم وفنون کی ترقی سے فائدہ اٹھائیے"

ارشاد ہوا" مگر یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لیے مطالعے کی ضرورت ہوگی۔ تحقیق و تخصیص کی۔ علوم جدیدہ سے واقفیت کی۔ علم نے ترقی کر لی ہے اور علم ترقی کرتا رہے گا۔ علوم میں ترقی ہوتی ہے تو علم کی دنیا بدل جاتی ہے۔ طب کی دنیا بھی بدلتی رہی اور بدلتی رہے گی، مگر ایک بات ہے کہ علم ترقی تو کرتا ہے مگر بزواً جزواً۔ اس میں کئی ناہمواریاں رہ جاتی ہیں۔ لہذا

اس طرح جو نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں تمام و کمال قابلِ قبول ہوں۔ ضروری نہیں کہ ان کی بنا پر پچھلے سارے نتائج کو نظر انداز کر دیا جائے یہ نقطہ سمجھنے کا ہے۔ آپ کی طب کے بہت سے نتائج آج بھی ویسے ہی صحیح ہیں جیسے آج سے صدیوں پہلے تھے ان کا تعلق دواؤں سے ہے، تشخیص و تدبیر سے، غذاؤں سے، کوشش کیجیے یہ نتائج محفوظ رہیں"

فرمایا "ابھی تو ہم اپنی طبی تصنیفات سے بھی شاید پوری طرح باخبر نہیں، جدید علوم کی رعایت سے ان کے نقد و تفحص کا کام بھی باقی ہے" (ص ۳۹۳)

فرمایا "قوم میں دم نہیں۔ دل و دماغ زوبہ انحطاط ہیں۔ یہ صورتِ حالات بڑی افسوسناک ہے۔ اس صورتِ حالات کو بدلنا چاہیے"

حضرت علامہ تھک گئے تھے۔ دیر تک خاموشی رہی۔ حضرت علامہ نے حقے کے ایک دو کش لیے فرمایا:

"حکیم صاحب قوم میں دم نہیں، دل و دماغ زوبہ انحطاط ہیں۔ قوائے عمل شل ہو رہے ہیں یہ سارا نتیجہ ضعفِ ایمان کا ہے۔ ایمان بڑی چیز ہے۔ جب تک ایمان قائم تھا مسلمانوں میں عزم بھی تھا، ہمت اور حوصلہ بھی۔ وہ اللہ کا سہارا ڈھونڈتے تو تدبیر سے بھی کام لیتے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایمان زندگی ہے، طاقت ہے قدرت ہے جب تک مسلمان زندہ رہے اس نکتے کو خوب سمجھے۔ عام اور خاص، عالم اور جاہل سب ہی یہ نکتہ علم کی سمجھ میں تو آتا ہے لیکن وہ اس کی تعبیر میں خود اپنے لیے مشکلات پیدا کر لیتا ہے"! اسی کو علامہ نے ایک اور یوں بیان کیا ہے۔

حکومت بادشاہی علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ کیا ہیں سب فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

علامہ مسلمانوں کی صدیوں پر محیط علمی ترقی کا بالعموم اور طب کے میدان میں ترقی کا بالخصوص تذکرہ کیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں جب وہ حکیم قرشی صاحب کے زیرِ علاج تھے، بیماری کی وجہ سے طب اسلامی کے موضوع پر بھی اظہارِ خیال رہتا تھا۔ تذیر نیازی صاحب حکیم قرشی صاحب کے ہمراہ علامہ کے پاس حاضر تھے اس نشست کا

تذکرہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

"تھوڑی دیر میں حضرت علامہ نے خمیرے کی ایک خوراک کھائی۔ اس کے ذائقے، رنگ اور بو کی تعریف کرنے لگے۔"

فرمایا "دواؤں کی یہ ترکیب بھی مسلمانوں کے ذوقِ تفنن کا نتیجہ ہے۔ بڑے محنت طلب تجربات کا کہ ان کی تاثیر اور فائدہ مندی میں باوجود امتدادِ زمانہ فرق نہیں آیا۔"

پھر بافسوس فرمایا "عالم اسلام میں تجربہ و تحقیق کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ نہ استعجابِ علم ہے، نہ علم کے لیے کوئی سعی و کاوش۔ یورپ کی حالت اس سے کس قدر مختلف ہے۔ وہاں تحقیق ہے تجربہ ہے علم سے دلی شغف، شب و روز محنت، شب و روز انہماک، حالانکہ ایک زمانے میں[1] وہاں تجربہ و تحقیق تو درکنار علم کا نام لینا بھی گناہ میں داخل تھا۔" (ص ۳۷۲)

فرمایا "یہ کسے معلوم نہیں کہ گلیلیو نے جب حرکتِ ارضی پر زور دیا تو پادری خوب ہنسے انہوں نے کہا حرکت ارض تو مشاہدے میں نہیں آتی، ہم کیسے مان لیں کہ زمین حرکت کرتی ہے" مگر پھر جب مشاہدے کی نوبت آئی تو دوربین کے استعمال سے انکار کر دیا تاکہ انہیں وہ کچھ نظر نہ آئے جو اس طرح نظر آسکتا تھا۔"

پھر کچھ رک کر فرمایا "طب کی ترقی بھی اسی لیے رک گئی کہ مسلمانوں نے علم و حکمت سے کنارہ کشی کر لی۔ تجربے اور مشاہدے سے منہ موڑ لیا۔ تحقیق و تفتیش کا سلسلہ ختم ہوا۔ جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے اس پر قناعت کر لی۔ دوسروں کی رائے اور سمجھ پر بھروسہ کرنے لگے۔ طب کی ترقی کب سے رک چکی ہے طب کو پھر سے فروغ ہوگا تو کیسے؟ ہم کچھ بھی نہیں کر رہے۔"

قریشی صاحب نے کہا "اس میں حالات کو بھی دخل ہے۔ ہم لوگ چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔ مشکلات ہیں قوم میں دم نہیں۔ حکومت بھی طب کے خلاف ہے۔"

---

[1] دیکھیے سارٹن مقدمہ تاریخ سائنس حصہ اول (اردو ترجمہ از سید نذیر نیازی) سارٹن کہتا ہے کلیسا کی رائے تھی کہ علم کا حصول ایک شر انگیز مشغلہ ہے ..... ڈر تھا یورپ میں کہیں علم و حکمت کی ہستی ہی نہ مٹ جائے۔

فرمایا" یہ صحیح ہے۔ مشکلات بھی ہیں اور قوم میں بھی دم نہیں۔ حکومت سے بھی کوئی امداد نہیں ملے گی۔ اہل یورپ بڑے شاطر ہیں۔ دوا فروشی کو بھی دوسری مصنوعات کی طرح تجارت کا ذریعہ بنا رکھا ہے، بہت بڑا ذریعہ۔ ہندوستان، ایشیا، اور افریقہ کی کتنی دولت ہے جو دواؤں کی درآمد سے یورپ پہنچتی ہے۔ حکومت طب کی سرپرستی کیوں کرنے لگی۔ اس کی نظر دولت پر ہے۔ ہماری ضرورت ہماری تہذیب و ترقی پر نہیں"

فرمایا:" لیکن میں کہہ رہا تھا علمی تجسس: مسلمانوں میں علمی تجسس کا فقدان ہے۔ عالم اسلام کا ذہنی انحطاط حد درجہ اندوہ ناک ہے۔ مسلمانوں میں علمی روح باقی ہے۔ نہ علم و حکمت سے کوئی دلی شغف تھوڑی بہت بیداری جو نئی تعلیم اور مغرب کے زیر اثر پیدا ہوئی اس کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ علم و حکمت کے بارے میں ان کے ذہن نے کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ وہ علم و حکمت کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں نہ اس کے ماضی، عہد بعہد ارتقاء، انقلابات اور تغیرات کو، نہ اس میں قوموں کے حصے اور ان کے نقطہ نظر کو۔ اگر کچھ ہے تو تقلید یا پھر یورپ سے چند ایک مستعار لیے ہوئے خیالات کا اعادہ" (ص ۳۷۳)

فرمایا" حالانکہ مسلمانوں کو علم و حکمت میں سب سے پیش پیش ہونا چاہیے۔ ان کا علمی ورثہ بڑا عظیم اور قابل فخر ہے۔ علم و حکمت کی کون سی شاخ ہے جس پر ان کی ذہانت، اجتہاد اور نبوغ کا نقش ثبت نہیں۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں "علمی روح" پیدا کی اور علوم و فنون کو ان کے اصل راستے پر ڈال دیا۔ علم کا وجود، جسے آج کل سائنس کہتے ہیں، انہی کا مرہون منت ہے"

فرمایا" ہم کیوں نہیں سمجھتے یہ اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں جن پر علم کی ترقی اور نشوونما کا دارومدار ہے۔ یہ شرائط کیا تھیں؟ مشاہدہ و معائنہ، فکر و نظر، محسوس و مرئی کا احترام تجربہ، تحقیق، تفتیش، حقائق کا اثبات، ان کا مطالعہ اور ان کی مسلسل تاویل و تعبیر! یہ شرائط پوری نہ ہوتیں تو علم کا راستہ دیر تک رکا رہتا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ خطبہ اول)

فرمایا" مسلمانوں کے زوال علم کی ذمہ داری محض سیاسی معاشی حالات پر عائد نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کا علمی زوال تو ان کے دورِ محکومیت سے بھی کہیں زیادہ متقدم ہے۔ لہٰذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسے زوال ہوا تو کیسے اور کیوں؟"

فرمایا "جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اہل جاپان کے یہاں کوئی علمی روایت نہیں تھی۔ وہ ایک طرح سے علم و حکمت میں کورے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس میدان میں اس طرح آگے بڑھے کہ اہل یورپ کے مدِمقابل بن گئے۔ اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دنیا معرضِ زوال میں تھی۔ علم و حکمت کا اکتساب کیا تھا۔ مگر یہ دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اس شان سے آگے بڑھے کہ علم و حکمت کی کائنات ہی بدل دی۔ علم کو صحیح معنوں میں علم کا درجہ عطا کیا۔ مسلمان آج پھر ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ مسلمانوں میں دم کیوں نہیں؟" (ص ۲۷۴)

علامہ کے ان افکار کو غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ علامہ کے دل میں قوم کے بارے میں کس درجہ دردمندی تھی۔ وہ قوم کے علمی انحطاط سے کس درجہ آزردہ تھے۔ یہ علمی زوال جو ان کے سیاسی زوال کا پیش خیمہ بنا اور پھر ان کو اس قعرِ مذلت میں گرا دیا جہاں سے وہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے باوجود نہیں نکل سکتے۔ آج پوری اسلامی دنیا میں علوم و فنون کے میدان میں جس درجہ انحطاط ہے اور جس طرح مسلمانوں کی نسلیں علم و فضل سے محروم ہیں وہ انتہائی افسوسناک صورت حال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خواندگی کا تناسب بھی بڑھ رہا ہے اور یونیورسٹیوں اور مراکزِ تحقیق میں بھی اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود علم کے میدان میں آج بھی مغرب کے مقلدِ محض ہونے کی صورت حال سے نجات نہیں مل سکی۔ مسلمان ممالک کے ذرائع ابلاغ عامہ پر نظر ڈالیے۔ ان کے یہاں سائنس اور دیگر علوم میں تحقیقات کی طرف توجہ کیجیے، صدیوں کا زنگ آج بھی موجود ہے۔ علامہ کے الفاظ آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جتنے صحیح تھے، آج بھی اتنے ہی درست ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ نے جو تشخیص کی ہے اور جس طرح مسلمانوں کو اپنے علمی ورثے کی طرف متوجہ کیا ہے اس پر دھیان دیا جائے اور صحیح علاج کی کوشش کی جائے۔ ہمارا نظامِ تعلیم جو قطعی اس کا اہل نہیں کہ تحقیق و مطالعہ کے میدان میں پیش رفت کے کام آ سکے۔ آج بھی ہماری گردنوں پر بوجھ کی طرح مسلط ہے اور

اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ طلبہ میں مطالعہ کا ذوق ختم کرنے میں اس نظام کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیمی نظام کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ وہ ملی زندگی کی اہم ترین ضرورت یعنی علمی تحقیق کی طرف پیش رفت اور ترقی کی منزل کی طرف رہنمائی کر سکے۔

اقبالؒ اور علمائے کرام

علامہ اقبال کے اپنے ہم عصر علماء سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ وہ عربی اور علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے تھے لیکن پھر بھی انہیں ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ وہ مروجہ دینی علوم سے باقاعدہ طور پر مستفید نہ ہو سکے۔ آپ کے والد نے ایک زمانے میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ تا ہم بعد میں مولوی سید میر حسنؒ اس ارادے سے انہیں باز رکھا۔ اس کے باوجود علامہ کا علمی ذوق جس قدر عمیق تھا اور آپ کو دینی سرمایہ سے جو گہری دلچسپی تھی۔ اس کی وجہ سے آپ روایتی معنوں میں عالم نہ ہونے کے باوجود علم و فضل کے پیکر تھے۔ علامہ شبلی نعمانی سید سلیمان ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ، مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا غلام مرشد مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر علمائے کرام سے ان کے گہرے روابط تھے۔ علامہ نے اپنے آخری دنوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو پنجاب میں طلب کر کے دارالاسلام پٹھان کوٹ میں جانے کے لیے کہا اور ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ خود بھی سال کا کچھ حصہ وہاں بسر کیا کریں گے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ اس طرح علامہ شبلی نعمانی سے لے کر مولانا مودودی تک تمام علماء سے آپ کا ربط و تعلق رہا۔

لہ "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے موقع پر ایک اجلاس میں اقبال کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں "ترجمان حقیقت" کا خطاب دیا گیا۔ یہی نہیں اس موقع پر علامہ اقبال کو علامہ شبلی نعمانی جیسے بلند پایہ محقق اور مصنف نے پھولوں کا ہار پہنایا اور اس کے بعد ان الفاظ سے مجمع کو خطاب کیا یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں اور اسکو محض تفریح تصور نہ کرنا چاہیے۔ ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کی نہیں ہوئی محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیئے لیکن آج سوا کتابوں کے اوراق کے کسی زمانے پر نہ چڑھ سکے لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے جو عزت قوم کیطرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کیلیے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں اس عزت کے مستحق ہیں" (اوراق ۱۸۴-۱۸۳)

علامہ کی علمی برتری کا اعتراف اونچی سطح پر ہوا وہ ان کی عمر کے پیش نظر حیرت انگیز تھا۔ آپ کو صرف ۳۴ برس کی عمر میں 'ترجمان حقیقت' کا خطاب دیا گیا۔ اور اس خطاب کی رسم میں علامہ شبلی نعمانی نے خود علامہ کو ہار پہنائے۔ یہ محض اظہارِ حقیقت تھا لیکن اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علامہ کس طرح بہت جلد ہی پوری قوم کی جانب سے اس عزت کے مستحق ٹھہرے جو ان کا حصہ تھی۔ [1]

آپ علمائے کرام کو جس عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ انہیں اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس کا قائم مقام سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر علماء کی اکثریت کسی مسئلہ پر خاص رائے دے دے تو وہ اپنی ذاتی رائے کو اس کے مقابلے میں قطعاً اہم نہ سمجھیں گے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ اس سے جہاں علامہ کی عظمت کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی نظر میں علماء کی حیثیت ایک طرح کے قانون ساز ادارے کی تھی جو واجبِ اطاعت حاکم کی عدم موجودگی میں وہی فرائض انجام دیں گے۔ جو ایک اسلامی حکومت کو دینا چاہیں آپ نیاز الدین خان صاحب کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"چونکہ واجب الطاعۃ امام اس وقت موجود نہیں۔ اس واسطے جمہور مشاہیر علماء ہند کا فتویٰ ضروری ہوگا۔ صرف ایک عالم کا فتویٰ اس بارے میں کافی نہیں، خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ علماء کی غالب جماعت کا اس پر اتفاق ہونا چاہیے..... ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر علماء کا فتویٰ میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سرِ تسلیم خم ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں، قرآن کے احکام اس بارے میں صاف و واضح ہیں لیکن افسوس ہے کہ بعض مشہور علماء فتویٰ دیتے ہوئے خائف ہیں بعض کی خدمت میں میں نے خطوط لکھے ہیں مگر امید نہیں کہ جواب ملے۔ باقی رہا میرا ان لوگوں سے ہم خیال ہونا، ہم خیالی صرف اسی حد تک ہے جس حد تک قرآن کا حکم ہو اور بس"

---

[1] (نیاز الدین خان ص ۳۵ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

علماء سے تعلقات

علامہ انور شاہ صاحب کشمیری
بیسویں صدی کے ممتاز علماء اور

نامور محققین اسلام میں جو مقام رکھتے ہیں وہ ہر صاحب علم و فضل پر روشن ہے۔ ان کے معاصرین کہتے ہیں کہ شاہ صاحب فقہ و حدیث کے خاص طور پر امام زمان اور حفاظ حدیث کی سلسلۂ الذہب کی آخری کڑی تھے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں "ہر چند مرحوم ہر فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن حدیث اور فقہ میں بلاشبہ تمام دنیائے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہ تھا۔" [1]

آپ نہ صرف دینی علوم میں نہایت اہم مقام رکھتے تھے بلکہ علوم عقلیہ اور فنون عصریہ کے بھی ماہر تھے قاری محمد طیب صاحب لکھتے ہیں "مطالعہ کے سلسلے میں فنون عصریہ، فلسفہ جدیدہ، ہیئت جدیدہ حتیٰ کہ فن رمل و جفر کی کتابوں کو بھی مطالعہ سے نہ چھوڑا۔ آپ حضرت محی الدین ابن عربیؒ کی تصنیفات سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور بقول مولانا محمد منظور نعمانی "شاہ صاحب خود وقت کے شیخ اکبر تھے" [2]

۱۹۳۵ء میں انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے تو علامہ کو اس بات کی خبر ہوئی۔ علامہ علماء کی صحبت کو اپنے لیے باعث صد سعادت سمجھتے تھے اس موقع پر فائدہ اٹھا کر انہوں نے علامہ سید انور شاہ صاحب اور دیگر علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ لکھتے ہیں اور یہ خط اقبال کے علماء کا احترام اور تواضع کا ثبوت ہے۔

"مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا! اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مجھے ماسٹر عبداللہ صاحب سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرما دیں گے۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمن صاحب قبلہ عثمانی حضرت مولوی شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرف قبولیت بخشیں گے آپ (ارمغان حجاز با شرح، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۲ء ص ۸۷۲)

---

[1] حیاتِ انور مقالہ مولانا نعمانی [2] ایضاً

کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔[1]

علامہ انور شاہ صاحب کاشمیری کے قیام لاہور کے دوران ان کی مصروفیات اور علامہ اقبالؒ کے ان سے تعلق کے بارے میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ چونکہ علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے تھے اس لیے ان کا بیان خاصا وقیع ہے اور اس سے علامہ کے علماء سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علامہ کو علماء کا حریف یا ناقد ثابت کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اور اقبالؒ کے یہاں ملاّ کا تذکرہ آیا ہے اسے علماء پر منطبق کرنا علامہ کی زندگی اور افکار کے مجموعی تاثر کے پیش نظر صریحاً غلط ہے علامہ اس ان پڑھ ملاّ کے خلاف تھے جس نے زندگی کی دوڑ میں آگے نکلنے کی بجائے نہ صرف یہ کہ خود انفعالیت اختیار کی بلکہ دین کے خرکی (Dynamic) تصور کو بھی اپنے بے عملی کے رنگ میں رنگنا چاہا۔ اس کے برعکس وہ علماء جو درحقیقت اسلاف کی روشن یادگار تھے۔ علامہ کو بے حد عزیز تھے اور آپ ان سے اخلاص کا تعلق رکھتے تھے۔ وہ جس طرح علامہ انور شاہ صاحب کو مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا کے الفاظ سے خطاب کرتے اور عریضے کو شرف قبولیت بخشنے کی التجا کرتے ہیں وہ جہاں اقبال کی نیازمندی اور علم کی قدردانی کا واضح ثبوت ہے وہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ نے اس نوع کا خط کسی بڑے سے بڑے خان بہادر، گورنر، جج یا کسی بھی مسٹر کو تحریر نہیں کیا۔ ان کے تمام خطوط کے مجموعوں میں اس درجہ نیازمندی کا اظہار شاید ہی کہیں اور ہوا ہو۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صاحب اپنی تصنیف "بادشاہی مسجد۔ تاریخ فن تعمیر" متعلق علامہ، (طبع کتاب خانہ نورس، لاہور، ۱۹۷۲) میں فرماتے ہیں۔ ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جمعیت العلماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے ماتحت کیا جائے۔ اس کے روح رواں اور ہر دلعزیز مولوی عبدالقادر قصوری وکیل تھے۔ یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈلا ہال میں منعقد ہوا۔ جو موجودہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے عقب میں واقع ہے۔۔۔۔ اس جلسہ میں اوّل مرتبہ میں نے خود علامہ اقبال

---

[1] (بنام سید انور شاہ صاحب ۱۲/ مارچ ۳۵ء، اقبال نامہ حصہ دوم، ص ۲۵۷۔)

اور علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا تعارف کرایا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت لاہور میں یہ سب سے بڑا جلسہ جمعیۃ العلماء کا دراصل انگریز کی حکومت کے خلاف ہوا تھا اور بے شمار علماء اسلام قید خانوں میں قید کر دیئے گئے تھے کیونکہ انہوں نے ایک طرح اس جنگ عظیم میں انگریزوں کے رویہ خلاف اسلام اور بالخصوص ترکوں کے حق میں شدید احتجاج کیا تھا اور بے شمار اس وجہ سے بھی قید کر دیئے گئے تھے کیونکہ انہوں نے انگریز کے خلاف فتویٰ دیا تھا کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہیے۔ ادھر گورنمنٹ نے یہ فتویٰ علماء اسلام ضبط کر لیا تھا جو علمائے اسلام نے مسلمانوں کی بھرتی کے خلاف دیا تھا۔ یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہم کسی خاص عالمِ دینِ اسلام کا تقرر بحیثیت خطیب بادشاہی مسجد کرنا چاہتے تھے۔ اور انجمن اسلامیہ کے سامنے یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اتفاق سے علامہ اقبال مرحوم کے ذہن میں ایک تجویز یہ آئی کہ اس منصب خطابت اور امامت کے لیے ایک ایسا باوقار اور اعلیٰ عالم دین کو لایا جائے جو صحیح خطبہ دے اور لوگ اس سے باقاعدہ مستفید ہوں۔ اسی اثنا میں مارچ ۱۹۲۵ء میں لاہور میں انجمن خدام الدین کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا۔ اس ضمن کے روح رواں مولوی احمد علیؒ تھے جس میں خصوصیت سے علماء دیوبند نے شرکت کی تھی جس میں قبلہ سید انور شاہؒ صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمدؒ عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰنؒ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت کی تھی، اس میں مرحوم مولانا سید عطاء اللہؒ شاہ بخاری اور مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی مدعو تھے اور علامہ اقبال کے سامنے اس وقت محض یہ مدِنظر تھا کہ کسی طرح علامہ سید انور شاہ صاحب کو ان سے استفادہ کرنے کے لیے مستقل طور پر یہاں لایا جائے۔ چنانچہ اتفاق سے ۱۹۲۶ء میں مدرسۃ العلوم اسلامیہ دیوبند کے اندرونی حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی جن کی وجہ سے حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ، مدرسہ دیوبند چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

چند مخیر مسلمانانِ گجرات کاٹھیاوار نے خاص طور پر سید انور شاہ صاحب کی شخصیت اور علمیت سے استفادہ کرنے کے خیال سے ایک نیا مدرسہ بمقام ڈابھیل (ریاست بڑودہ) میں قائم

کرنے کی تجویز کی اور آپ کو وہاں ڈابھیل میں اس مطلب کے لیے قیام کی دعوت دی۔ مگر ادھر علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ کسی طرح لاہور میں انجمن اسلامیہ اور انجمن حمایت اسلام دونوں مل کر ان کو یہاں آنے کی دعوت دیں اور اس طرح اہل لاہور آپ کی اعلیٰ علمیت سے مستفید ہوں چنانچہ اس سے قبل ایک مرتبہ علامہ سید انور شاہ صاحب لاہور میں اتفاق سے تشریف لے آئے اور راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں (اندرون موچی دروازہ ورنگ محل لاہور) پیر عبدالغفار شاہ (۲ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ) کے یہاں مہمان تھے اور ان کی دعوت پر اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں وعظ کیا۔ اس وقت ادھر آپ کی موجودگی میں لاہور میں علامہ اقبال نے ہر دو متذکرہ بالا انجمنوں سے معاملہ فہمی بھی کر لی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علوم دین اسلام کے سربراہ بھی ہوں گے کیونکہ علامہ اقبال کے سامنے ایک امر یہ بھی ذہن میں تھا کہ جس طرح یہ بادشاہی مسجد عظیم ہے اسی طرح یہاں ایک اعلیٰ بلند پایہ خطیب بھی ہونا چاہیے جس کا سلسلہ خطابت عالم اسلام میں بھی مقبول ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت کسی قدر حضرت قبلہ سید انور شاہ صاحب کے اپنے بعض نظریات یہاں آنے میں حائل ہوئے کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے پہلے موجودہ انتظامات میں ان کی شخصیت کی وجہ سے کسی کی حق تلفی ہو۔[1]

مولانا غلام مرشد صاحب کا تعلق بادشاہی مسجد سے لگ بھگ چالیس سال رہا۔ (۱۹۲۷ء سے ۱۹۶۵ء تک) علامہ کے مولانا غلام مرشد صاحب سے تعلق کے بارے میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صاحب یوں رقم طراز ہیں۔

"ادھر انجمن اسلامیہ لاہور کے سامنے کسی اچھے خطیب برائے بادشاہی مسجد کا مسئلہ تھا۔ اس وقت لاہور میں مولوی غلام مرشد صاحب خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ آپ حافظ قرآن بھی ہیں علامہ اقبال کو برائے انتخاب خطیب بادشاہی مسجد انجمن اسلامیہ نے پورا اختیار دے دیا تھا چنانچہ علامہ نے مولانا غلام مرشد سے فرمایا کہ آپ جو اس طرح درس قرآن دے رہے ہیں، بہت مفید ہے مگر ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ لوگ آپ سے مسائل حاضرہ میں ہر جمعہ کے روز بھی

---

[1] (ص ۳۷ - ۳۸)

مستفید ہوں تو اس طرح آپ کو بادشاہی مسجد کے خطیب کے لیے رضامند کر لیا، (ص ۴۰)۔

علامہ نے خطبات مدراس کے سلسلے میں جن لوگوں سے مشورہ کیا ان میں مولانا غلام مرشد بھی تھے چنانچہ ڈاکٹر چغتائی رقم طراز ہیں۔

"لاہور کی تاریخ میں ۱۹۲۷ء کا زمانہ بہت ہی ہنگاموں کا تھا کیونکہ اسی سال لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب ہوئے اور لاہور کی طرف سے علامہ اقبال امیدوار تھے ادھر علماء میں ایک طرح مولانا غلام مرشد صاحب ہی زیادہ مشہور تھے۔ اور عوام آپ سے ہی زیادہ رجوع کرتے تھے۔ ان دنوں علامہ اقبالؒ ایک خاص کتاب لکھنے میں مصروف تھے جو دراصل مدراس کے لیکچروں کی صورت میں لکھی گئی یہ لیکچر ۲۹ - ۱۹۲۸ء میں مدراس، بنگلور، میسور، حیدر آباد دکن اور علی گڑھ میں دیئے گئے تھے۔ اس کتاب کی تیاری میں علامہ اقبال نے اکثر علماء سے بھی بعض مسائل پر بالمشافہ گفتگو کی اور آزادانہ طور پر مشورہ بھی کیا میں خود اکثر علماء لاہور کو علامہ کی خدمت میں برائے مشورہ اور استصواب لے گیا تھا جن میں لاہور کے علماء میں سے قبلہ مولانا اصغر علی روحی۔ مولانا حشمت علی، مولانا سید طلحہ، مولانا غلام مرشد صاحب، خواجہ احمد الدین امرتسری شامل ہیں۔ اگرچہ یہ بحث طویل ہے مگر میں نے بطور یادداشت ان علماء کے نام یہاں پیش کر دیئے ہیں" (ص ۳۹)

علامہ اقبال نے ۱۹۱۳ء میں شاہی مسجد میں جنگ طرابلس کے موقع پر نظم پڑھی تھی۔

آپ کو ہمیشہ یہ دلچسپی رہی کہ اس مسجد میں ایک اعلیٰ بین الاقوامی شہرت و قابلیت کا خطیب ہونا چاہیے۔ آپ ہمیشہ اس مسئلہ میں دلچسپی لیتے رہے۔ آپ ہی کے انتخاب کے نتیجے میں مولانا غلام مرشد یہاں جمعہ کی خطابت کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں خطبہ عید الفطر کے موقع پر شاہی مسجد میں عام مسلمانوں سے خطاب کیا، مولانا غلام مرشد صاحب بھی خطیب ہونے کی وجہ سے وہاں موجود تھے اس خطبے میں آپ نے مسلمانوں کو خطاب فرمایا کہ اقتصادی طور مسلمانان پنجاب تقریباً سوا ارب روپیہ کے مقروض ہیں جس پر ہر سال چودہ کروڑ روپیہ سود ادا کرتے ہیں، اس مسئلہ پر آپ نے قائداعظم محمد علی جناح کو بھی اپنے خطوط میں توجہ دلائی تھی۔ علامہ کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا غلام مرشد صاحب آکر آپ کے یہاں جایا کرتے تھے۔ میں ان دنوں ۱۹۳۶ء کے اواخر سے لے کر ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک لاہور سے باہر پیرس میں زیر تعلیم رہا۔ جب

یہاں ۱۹/ اپریل کی صبح کو لاہور آیا تو اگلے روز ۲۰/ اپریل کی شام غروب آفتاب کے قریب آپ کے ہاں حاضر ہوا۔ اس وقت اتفاق سے بعض دیگر احباب کے ہمراہ وہاں مولانا غلام مرشد صاحب بھی موجود تھے۔ ۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو علامہ کا انتقال ہوا۔ لاہور میں المناک منظر جنازہ علامہ اقبالؒ دیکھنے کے قابل تھا۔ بعض احباب اور اصحاب، اختیار کے مشورے سے یہ طے پایا تھا کہ آپ کا جنازہ بادشاہی مسجد میں ہوگا۔ اور ایک وفد نے گورنمنٹ سے مل کر یہ طے کیا کہ آپ کو بادشاہی مسجد کے باہر دفن کیا جائے گا۔ اس وفد میں مولانا غلام مرشد بھی شامل تھے جن کی مساعی جمیلہ سے یہ مقام مرقد طے ہوا تھا، علامہ کا جنازہ شاہی مسجد کے اندر صحن میں دائیں طرف مولانا غلام مرشد صاحب نے ہی پڑھایا اور آخر آپ کو اسی مسجد کے باہر دفن کیا گیا

(ص - ۴۱ ، ۴۲ ایضاً)

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی

ہر چند اکبر الہ آبادی کی شہرت ایک شاعر کی حیثیت سے ہے لیکن درحقیقت وہ علوم اسلامیہ اور ملت اسلامیہ کی ضروریات سے جس بڑی حد تک آگاہ تھے اس کی وجہ سے علامہ انہیں ایک بڑے عالم اور اپنے مرشد کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

علامہ اقبال اکبر الہ آبادی صاحب سے جو گہرا تعلق رکھتے تھے اس کا اندازہ ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو علامہ اقبال نے اکبر کے نام لکھے ہیں وہ انہیں مولانا اکبر الہ آبادی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور انہیں اپنے مرشد کی حیثیت دیتے ہیں آپ ان کے نام لکھتے ہیں۔

"میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔"[1]

علامہ نے کسی اور شخص کے لیے اس طرح کے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی نیازمندی اسی پر ختم نہیں ہوتی آپ ان کے ملفوظات کو تحریر کرنے کے لیے جس درجہ شوق کا اظہار کرتے ہیں اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپ نے لکھا ہے۔

---

[1] (بنام اکبر الہ آبادی ۶/ اکتوبر ۱۹۱۱ء، اقبال نامہ دوئم ص ۴۴ - ۴۵)

"آپ کی زبان سے جو لفظ نکلتے ہیں وہ نہایت پر معنی اور مفید ہوتے ہیں. ان کو جمع کر لینا چاہیے تاکہ آئندہ نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں. بڑی ضرورت ہے کہ ایک منشی کاغذ اور قلم دوات لے کر آپ کے پاس ہر وقت بیٹھے اور جو بات آپ فرمائیں اسے نوٹ کرلے. اگر میں اکبر الہ آباد میں قیام کر سکتا تو آپ کے لیے وہ کام کرتا جیسا باسویل (Boswel) نے ڈاکٹر جانسن (Dr. Johnson) کے لیے کیا تھا.

آپ نے اکبر کے اتباع میں ظریفانہ کلام بھی لکھا اور اسے اپنی نیازمندی کا ادنی ثبوت قرار دیا. بات یہ ہے کہ اکبر نے مغرب پر تنقید کر کے جس قومی خود اعتمادی کی بنیادیں رکھی تھیں علامہ نے اس پر تعمیر کھڑی کر دی اس دور میں جب مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز مستند سمجھی جاتی تھی اور بقول اکبر:

بات وہ ہے جو وائسرائے نے کی
ہے خبر وہ جو پائنیر میں چھپے

آپ نے مغرب کی تقلید کے جنون کا علاج کرنے اور اس بھوت کو اتارنے میں بہت بڑا اہم کردار ادا کیا. آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم میں مغرب کی ذہنی غلامی کے اثرات ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے ہیں. ضرورت اس بات کی ہے کہ اکبر کے نظریات کو عام کیا جائے اور اکبر اور اقبال کی ذہنی ہم آہنگی کو مزید اجاگر کیا جائے.

علامہ نے اکبر الہ آبادی کے انتقال پر ان کے لڑکے سید عشرت حسین کو جو خط لکھا اس سے علامہ کے خیالات و جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے. علامہ لکھتے ہیں.

"ابھی زمیندار سے آپ کے والد بزرگوار اور میرے مرشد معنوی کے انتقال پر ملال کی خبر معلوم ہوئی. انا اللہ وانا الیہ راجعون، اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا. کہ ان سے آخری ملاقات نہ ہو سکی. میں اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو ان کی زیارت کے لیے الہ آباد کا سفر کریں. انہوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا بھی تھا کہ امسال ضرور ملنا."[1]

---

[1] (سید عشرت حسین الہ آبادی، حیاتِ اکبر ص ۱۲۹)

بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں۔ میری بدنصیبی ہے کہ میں ان کے آخری دیدار سے محروم رہا۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت تقریباً ہر حیثیت سے بینظیر تھی۔

اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہا ہے جب جا کے ایک اکبر اسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لیے کچھ عرصے اور جاری رہتا۔

خدا تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میں نے ابھی ابھی ایک تار بھی آپ کو دیا ہے[1]

علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی

علامہ اقبالؒ کے خطوط بنام سید سلیمان ندویؒ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے سید صاحب سے علمی تعلقات کا سلسلہ ۱۹۱۴ء سے قائم تھا اور یہ علمی تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ سید صاحب نے علامہ کی وفات پر جو لکھا اس سے ان کے دلی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہرچند ان کی شخصی ملاقات ۱۹۲۷ء سے پہلے نہیں ہوئی لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے افکار و خیالات میں ایک گونہ طبعی مناسبت تھی۔ سید صاحب نے معارف میں علامہ سے ملاقات کا حال یوں لکھا ہے۔

"ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش دستی فرمائی۔ قیام گاہ میں آئے، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانہ میں مدعو کیا جس کو وہ دارالفقر اور میں دارالاقبال کہوں گا۔۔۔ ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے۔ انہوں نے

---

[1] تار کا متن یہ تھا Heartfelt sympatny
India loses a great personality, Iqbal.

[2] انوار اقبال ۱۹۷۷ء

تو "شمع اور شاعر" لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود "شاعر کو شمع" دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا۔ ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے۔ ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں۔ ان کی "زمزمہ پردازیوں" کا نیا مجموعہ "زبورِ عجم" کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ فلسفہ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفہ کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا 'پردہ' رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے۔"[1]

خود اقبال کو سید صاحب سے جو عقیدت و محبت تھی اس کا اظہار خطوط میں جا بجا ملتا ہے سید صاحب بیمار ہو گئے تھے صحت یاب ہوئے تو علامہ نے لکھا "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو صحت عطا فرمائی۔ آپ کا وجود ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ازبس ضروری ہے اور مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے تاکہ وہ دیر تک آپ کے علوم سے مستفیض ہوتے رہیں۔"[2]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "اس تقدیم کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟ دارالمصنفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔"[3]

علامہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی فلسفیانہ تاریخ پر باقاعدہ کام کیا جائے۔ اسی سلسلے میں ایک بار مزید سید صاحب کی خدمت میں لکھا ہے "میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے یہ کام صرف آپ

---

[1] (شذرات معارف مئے ۱۹۲۷ء)

[2] (بنام سید سلیمان ندوی ۲ راگست، اقبال نامہ اوّل ص ۱۹۷)

[3] (بنام سید سلیمان ندوی ۴ ستمبر ۱۹۳۳ء، اقبال نامہ اوّل ص ۱۶۶)

ہی کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں۔" [1]

علامہ سید ندوی سے علامہ اقبال کے تعلقات جس محبت اور خلوص پر مبنی تھے اس کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو علامہ نے انہیں تحریر کیے۔ علامہ کے پیشِ نظر اسلام کے احیاء اور پنجاب کے مسلمانوں کے دل میں جو علمی ولولہ و شوق پیدا کرنے کا مقصد تھا اس کے پیشِ نظر وہ چاہتے تھے کہ علامہ پنجاب میں آجائیں۔ اورنٹیل کالج میں ہیڈ پرشین ٹیچر کی جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے سید صاحب کو لکھا کہ وہ اگر جگہ پسند کریں تو ان کے لیے سعی کی جائے کیونکہ ان کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے بے حد مفید ہوگا۔ جب ان کا جواب موصول ہوا کہ وہ ملازمت کا سلسلہ پسند نہیں کریں گے تو ان کو خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کریں گے لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضرور تھا۔ کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا اور وہ یہ کہ میں چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علماء و فضلاء سے اس سے پیشتر فائدہ پہنچا ہے۔ اب وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو جائیں مگر مسلمان امراء میں مذاق علمی مفقود ہو چکا ہے میری کوشش بار آور نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دار المصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے۔" [2]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں وہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔ اسرار خودی کا دوسرا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ عنقریب آپ کی خدمت میں مرسل ہوگی۔ رسالہ "صوفی" میں میں نے کوئی نظم شائع نہیں کی۔ کوئی پرانی مطبوعہ نظم انہوں نے شائع کر دی ہوگی۔ ورنہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں "صوفی" کو "معارف" پر ترجیح دوں۔ "معارف" ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی

---

[1] (بنام سید سلیمان ندوی ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء اقبال نامہ اوّل ص ۱۸۰)

[2] (بنام سید سلیمان ندوی ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء اقبال نامہ اوّل ص ۷۶ - ۷۷)

ہوتی ہے

"معارف" اقبال کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ وہ اس کے مضامین پر باقاعدہ نظر رکھتے اور اپنی رائے سے بھی سید صاحب کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ روس کے مسلمانوں کے متعلق معارف میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ چونکہ اقبال کو ان مسلمانوں سے بہت کچھ توقعات وابستہ تھیں اس لیے وہ ان کے حالات کی اشاعت کے سلسلے میں فکرمند رہتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"روس کے مسلمانوں کے متعلق جو مضمون معارف میں شائع ہوا ہے اسے ایک علیحدہ رسالے کی صورت میں شائع ہونا چاہیے"[1]

اسی طرح مفتی عالم جان کے بارے میں ایک مضمون معارف میں لکھا گیا تھا علامہ نے ان کے بارے میں مزید جاننے کے لیے خط لکھا تھا۔

علامہ لکھتے ہیں "میں آپ کو خط لکھنے والا تھا کہ مفتی عالم جان کے حالات معارف میں شائع کیے جائیں، مسلم اسٹینڈرڈ لندن نے ان کے کچھ حالات شائع کیے تھے، آج کے معارف میں میری آرزو سے بڑھ کر مضمون لکھا گیا۔ جزاک اللہ، معارف کا ایڈیٹر صاحبِ کشف نہ ہوگا تو اور کون ہوگا۔ حال کے روسی علماء کے بعض تصانیف اسلام کے متعلق اگر دستیاب ہو جائیں تو ان کا ترجمہ ہندوستان میں شائع ہونا چاہیے"[2]

سید صاحب سے جس درجہ گہرے تعلقات تھے اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سید صاحب اپنے ذاتی مصائب کا ذکر بھی علامہ سے کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتے تھے ان کے ایک خط کے جواب میں علامہ لکھتے ہیں "والا نامہ مل گیا ہے۔ حالات معلوم ہونے پر طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اطمینان قلب عطا فرمائے۔ آپ کا یہ فقرہ کہ "میرے ساتھ خدا کا معاملہ عجیب ہے" گویا تمام ملت مرحومہ کے احساسات کا ترجمان ہے۔ جو قوم ایک مشن لے کر پیدا ہوئی ہے اس کی روحانی تربیت کے لیے ابتلاء کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔۔۔۔ آپ امت محمدیہ کے خاص افراد میں ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد

---

[1] (بنام سید سلیمان ندوی۔ اقبال نامہ اوّل ص ۸۴)

[2] (بنام سید سلیمان ندوی ۲۹ مئے ۱۹۲۲ء اقبال نامہ اوّل ۱۱۸)

کو ہی امرِ الٰہی ودیعت کیا گیا ہے۔ فرقۂ یاسیہ کو چھوڑ کر فرقۂ رجائیہ میں آجائیے۔ جس حقیقت کو آپ زیرِ پردہ دیکھ چکے ہیں اس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے انشاء اللہ

ع زمانہ باز بیفروخت آتشِ نمرود کہ بے نقاب شود جوہرِ مسلمانی

شخصی اعتبار سے مجھے آپ کے ساتھ حد درجہ ہمدردی ہے یقین جانیئے کہ آپ کے الفاظ نے میرے دل پر سوز و گداز کی کیفیت طاری کر دی اور میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو الام و مصائب میں استقامت عطا فرمائے۔[1]

اس خط میں جو گہری کیفیات پوشیدہ ہیں اس سے اقبال کے سید صاحب سے دلی تعلقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر احسان حقی صاحب جن کا پورا نام ناصر الدین احسان سامی ہے، عالم عرب کی انتہائی نمایاں اور معروف شخصیتوں میں سے ہیں آپ کا قیام علی گڑھ میں بھی رہا ہے اور آپ جہاں فرانسیسی یورپ کی دیگر زبانوں پر عبور رکھتے ہیں وہاں بہت اچھی اردو جانتے ہیں۔ آپ نے عالم اسلام کی مشہور شخصیت امیر شکیب ارسلان کی عربی کتاب کا ترجمہ 'اسبابِ زوال امت' کے نام سے کیا ہے۔ یہی نہیں ہندوؤں کے مجموعہ قوانین منوسمرتی کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ 'پاکستان ما فیہا و حاضرھا' کے عنوان سے پاکستان پر ایک جامع کتاب لکھی۔ پاکستان اور دو قومی نظریے کو اس خوبصورتی اور جامعیت سے کسی اور عربی کتاب میں بیان نہیں کیا گیا۔ آپ نے مسئلہ کشمیر پر بھی عربی میں کتاب 'ماساۃ کشمیر' 'المیہ کشمیر' کے عنوان سے لکھی ہے۔ آپ نے لوران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ بعد میں خاصا طویل عرصہ پیرس میں قیام رہا۔ جہاں انہوں نے امیر شکیب ارسلان کے تعاون سے اسلامک سنٹر کے بنانے میں اہم حصہ لیا۔ امیر اس تنظیم کے صدر تھے اور آپ سیکرٹری تھے۔

برصغیر میں ۳۳-۱۹۳۲ء کے قیام کے دوران آپ علی گڑھ میں عربی پڑھاتے رہے اس کے علاوہ آپ کا علامہ اقبالؒ سے خاصا نیاز مندانہ تعلق تھا۔ آپ نے ادارہ معارف اسلامیہ کے ۱۹۳۳ء کے سیشن منعقدہ لاہور میں بھی حصہ لیا تھا۔ علامہؒ نے آپ کو ادارہ معارف اسلامیہ کی

---

[1] (بنام سید سلیمان ندویؒ ۲ر دسمبر ۱۹۱۸ء، اقبال نامہ اول ۹۷-۹۸)

جانب سے بحیثیت صدر ادارہ ایک تعارفی سرٹیفکیٹ بھی عطا کیا تھا۔ اس سے علامہؒ کی نظروں میں آپ کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ ہوتا ہے آپ لکھتے ہیں۔

"مجھے اپنے نہایت عزیز دوست اور ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے نمایاں رکن پروفیسر حقی کا تعارف کروا کر بے حد مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ میں اہم علماء کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ وہ پروفیسر صاحب کو جس نوع کی مدد کے وہ خواہاں ہوں، ان تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ مجھے یقین ہے کہ تمام ادبی انجمنیں اپنے درمیان پروفیسر صاحب جیسے وقیع اور نامور عالم کو موجود پا کر بے حد فخر کریں گی"

صدر ادارہ معارف اسلامیہ لاہور

"ڈاکٹر سر محمد اقبال" دار لنفائس

(باکستان مافیھا و حاضرھا۔ الدکتور احسان حقی، بیروت ۱۹۷۳ء، ص ۱۸)

علامہ نے جس طرح ڈاکٹر احسان حقی صاحب کی عزت افزائی فرمائی اور انہیں گراں قدر سرٹیفکیٹ عطا کیا وہ آپ کے علماء سے تعلق اور دلی ربط کی آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر صاحب جو ان دنوں دمشق میں مقیم ہیں، علامہؒ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا آج بھی والہانہ انداز سے ذکر کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عالم عرب میں ڈاکٹر صاحب کی طرح پاکستان کا صحیح درد رکھنے والے کم ہی افراد مل سکیں گے۔

اقبال اور علماء ازہر

اقبال کا علمائے ازہر سے گہرا ربط تھا۔ وہ جب گول میز کانفرنس سے واپسی پر دسمبر ۳۱ء میں مصر اور فلسطین کے سفر کے لیے ٹھہرے تو اس دوران ان کا ذاتی رابطہ بھی قائم ہو گیا۔ اور انہیں ان علماء کے دینی و علمی شغف کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مولانا غلام رسول مہر نے جو مصر کے سفر کے دوران علامہ کے ہمراہ تھے جامعہ ازہر میں علامہؒ کے جانے کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"پھر جامع ازہر پہنچے۔ یہاں جامعہ کی انتظامیہ کے نگران محمد خالد حسنین بے چارے ہمارے منتظر تھے۔ جامعہ ازہر کی عمارت باہر سے معمولی نظر آتی تھی لیکن قریب جا کر اس کی وسعت کا اندازہ ہوتا تھا۔ مسجد کے مختلف علاقوں میں طلبہ ہر وقت جمع رہتے تھے اور اساتذہ سے درس لیتے تھے۔ ہم کو انہوں نے منطق تفسیر اور حدیث کے درس سنائے۔ بعد ازاں نگران کے ساتھ جامعہ عزیز

دیکھنے کیلیے روانہ ہوئے۔ جامعہ عربیہ ازہر کو نئے خطوط پر لانے کا نتیجہ تھی۔ اس میں طلبہ کو دور جدید کی ضروریات کیلیے زمانہ حاضرہ کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں طبیعات، کیمیا اور دیگر علوم جدیدہ کا معائنہ کیا یہاں کے ایک پروفیسر نے حضرت علامہ کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ جامعہ عربیہ سے نکلے تو معلوم ہوا کہ شیخ مصطفےٰ المراغی، شیخ ازہر اپنے دفتر کے باہر حضرت علامہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے ملاقات کے دوران حضرت علامہ نے چند الفاظ میں الازہر کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ آپ نے فرمایا، "راستہ وہی ہے لیکن قافلہ بدل گیا ہے اور اگر آپ موجودہ قافلے کے حالات و ضروریات کا خیال نہ فرمائیں گے تو پیش نظر مقصد میں ہرگز کامیابی نہ ہو سکے۔" [1]

علامہ کے اس سفر مصر کے دوران علمائے ازہر سے اس ملاقات کے علاوہ بی بی اور جگہ ملاقاتیں رہیں علامہ نے ہندوستان کے حالات اور مسلمانوں کی دینی و سیاسی ضروریات کا تذکرہ کیا۔ چار سال کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ علماء ازہر کے ایک وفد کا ہندوستان آنے کا پروگرام بن گیا۔ ہوا یوں کہ ۱۹۳۶ء میں اچھوتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ قرارداد پاس کی گئی کہ انہیں چاہیے کہ وہ ہندو دھرم چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیں تو اس پر جمعیت تبلیغ اسلام نے اپنی کوشش تیز تر کر دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اچھوت دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں لیکن ہندوستان میں اچھوتوں کے اس فیصلے پر لے دے ہونے لگی اور گاندھی سمیت کانگریس کے دیگر زعماء نے ان کوششوں کا سخت نوٹس لیا تو یہ بات مصر کے اخبارات تک بھی پہنچی اس پر جامع ازہر نے طے کیا کہ وہ علماء کا ایک وفد ہندوستان بھیجے جو وہاں جا کر حالات کا جائزہ لے اور دیکھے کہ وہ کہاں تک تبلیغ اسلام کے کام میں معاونت کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ الازہر جناب مصطفےٰ المراغی مرحوم نے حضرت علامہ سے بھی دریافت کیا کہ آیا ان کی رائے میں وفد کا بھیجنا مناسب ہوگا اور کیا وفد کو ترجمان بھی مل جائیں گے (سید نذیر نیازی - مکتوبات اقبال ص ۳۵۹) چنانچہ حضرت علامہ نے فوری طور پر انجمن حمایت اسلام لاہور کے نائب صدر خلیفہ فضل حسین کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا کہ انجمن ترجمانوں کا انتظام کرے۔

---

[1] سیاحت اقبال، ۱۶۷ - ۱۶۸)

علامہ لکھتے ہیں۔

"شیخ مراغی جامعہ ازہر قاہرہ کا خط میرے نام آیا ہے جو آج کے اخبار احسان میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ جامعہ ازہر کا ارادہ ہے کہ شہروں میں تبلیغ اسلام کے لیے ایک وفد ہندوستان روانہ کرے اور اس وفد کے متعلق انہوں نے مجھ سے ضروری مشورہ طلب کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے وفد کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہو گی جو ان کی تقریروں کا اردو ترجمہ کر سکیں اور ہندوستانی ٹور میں ان کے ساتھ رہیں۔ میرے خیال میں انجمن حمایت اسلام کو چاہیے کہ وہ مصری وفد کے لیے ایسے مترجمین بہم پہنچائے اور ان کے اخراجات ادا کرے۔ دورہ غالباً تین ماہ کا ہو گا اور جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں ان مترجمین کا خرچ کچھ زیادہ نہ ہو گا یہ معاملہ آپ کونسل کے آئندہ اجلاس میں پیش کر کے جہاں تک ممکن ہو جلد کونسل سے اخراجات کی منظوری حاصل کریں یا اگر کوئی اور طریق ہو جس سے کونسل کی منظوری جلد ہو سکے تو اس طریق کو اختیار کریں تاکہ میں شیخ الجامعہ کے خط کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد دے سکوں، اس کے ساتھ ہی علامہ نے شیخ الازہر کو ایک خط میں مصری وفد کے بارے میں مختلف سفارشات بھجوائیں تاکہ انہیں یہاں آ کر دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بدقسمتی سے اصل خط نہیں مل سکا۔ تاہم روزنامہ البلاغ کی ۲۵ جولائی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں اس خط کے مندرجات اس شکل میں چھپے۔

اقبال کی الازہر کے مشن کے سفارشات :

مشن کو ہندوستان میں جس واحد مسئلہ سے سابقہ پڑے گا وہ یہ ہے کہ اچھوتوں کی اکثریت جو بی ہندوستان میں رہتی ہے اور چھ مختلف زبانیں بولتی ہے ان زبانوں میں کسی زبان میں بھی مذہبی خیالات کو مناسب طور پر ادا کرنا مشکل ہے۔ اس طرح مصر کے فاضل علماء کی تقریروں کو مقامی زبان میں مناسب انداز سے ترجمہ کرنا بذات خود ایک بہت بڑا مرحلہ ہو گا ہندوستان کی اسلامی تنظیمیں اس مسئلہ کو ابھی تک حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ (تاہم اس تحریر کے چند سال بعد اسلامی خیالات کو جنوبی ہند کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کا کام شروع

ہوگیا۔ اب ان زبانوں میں اسلامی علوم پر کتب کا اچھا بڑا ذخیرہ موجود ہے اس سے قبل یہ زبانیں اس سے بڑی حد تک محروم تھیں) تاہم میرا یہ خیال ہے کہ مصری وفد کے ہندوستان آنے سے مفید نتائج نکلیں گے اور یہاں کی اسلامی تحریک کو اس سے تقویت ملے گی۔

اقبال نے ہندوستان آنے والے مصری وفد کے سامنے یہ تجاویز رکھیں۔

(۱) جو لوگ وفد میں شامل ہوں وہ روشن خیال اور وجیہ ہوں اور اسلام کو جدید فکر اور تجربے کی روشنی میں بیان کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں وہ اس بات پر زور دیں کہ اسلام افریقہ کے وحشی انسانوں کو تہذیب یافتہ اقوام کی سطح پر لانے میں کامیاب رہا ہے اور انہیں مساوات کا عملی درس دیا ہے۔

(۲) یہ ضروری ہے کہ وفد کے ارکان مصر کے علماء کی اعلیٰ ترین روایات کے حامل ہوں۔

(۳) مشن کے ساتھ ایک سیکرٹری ہو جو پوری مسلم دنیا میں اس مشن کی کارکردگی کی نشر و اشاعت کی اہلیت رکھتا ہو۔

(۴) یہ ضروری ہوگا کہ مشن واپسی پر ان نوجوان اچھوتوں کو جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں اپنے ہمراہ واپس مصر لے جائے اور انہیں الازہر میں تعلیم دے تاکہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان بن سکیں۔

اس کے بعد علامہ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ مسلمانوں کا امیر طبقہ اسلامی مسائل سے قطعاً دلچسپی نہیں رکھتا۔[1]

یہ وفد ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو بمبئے پہنچا اور وہاں سے دہلی اور پشاور ہوتا ہوا لاہور آیا۔ وفد کے معتمد شیخ حبیب احمد آفندی اور نائب معتمد شیخ صلاح الدین التجار انگریزی سے خوب واقف تھے۔ وفد نے مختلف مسائل پر معلومات جمع کریں۔ یہ لوگ جس شہر میں بھی گئے علماء اور دیگر مقامی سربرآوردہ حضرات سے ملاقاتیں کیں اور مسلمانوں کے مختلف اداروں کا معائنہ کیا۔ لاہور میں وفد نے علامہ اقبال سے بھی ملاقات کی ۲۷ جنوری کو لاہور کے سپنسر ہوٹل میں وفد کے اعزاز میں ایک دعوت طعام دی گئی۔

علامہ کو تعلیمی ترقی اور تعلیمی مسائل سے جو دلچسپی تھی اس کے پیش نظر انہوں نے یہ

---

[1] بی اے ڈار ۸۳ - ۸۵)

مناسب سمجھا کہ اس وفد کو کسی مسلم ریاست کی جانب سے دورے کی دعوت دی جائے تاکہ اس سے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے میں مدد ملے۔ علامہ کی نگہہ انتخاب ریاست بہاولپور پر پڑی۔ بہاولپور سے اقبال کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں یہی وجہ تھی کہ علامہ نے وہاں کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین قریشی کو خط لکھا کہ وہ مصری علماء کے وفد کو بہاولپور آنے کی دعوت دیں۔ آپ نے لکھا۔

علماء مصر (جامعہ ازہر) کا جو وفد مصر سے آیا تھا کل صبح پشاور سے لاہور پہنچا۔ ان کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا مشاہدہ اور معائنہ ہے۔ میرے خیال میں ریاست بہاولپور بلکہ اعلیٰحضرت کو چاہیے کہ ان کو بہاولپور میں مدعو کریں تاکہ وہ ریاست کے کالج کا معائنہ کر سکیں۔ مصر کے شیوخ نہایت فاضل ہیں اور دانشمند مجھے یقین ہے کہ اعلیحضرت اور مسلمانانِ بہاولپور ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ (ہاشمی ۲۶۶)

نوٹ :-

مولانا سید سلیمان ندوی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ برصغیر کے وہ عظیم عالم اور مفکر تھے کہ خود علامہ اقبال نے ان سے بارہا استفادہ کیا اور انہیں علوم اسلامی کی جوئے شیر کے فرہاد کے نام سے یاد کیا۔ ۱۹۳۳ء میں کابل کی حکومت نے برصغیر سے ایک تعلیمی وفد بلایا تھا جس میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے علاوہ سید صاحب بھی مدعو تھے۔ اس سفر کی سرگذشت سید سلیمان ندوی صاحب نے سیرِ افغانستان کے نام سے لکھی ہے جس سے علامہ اور سید صاحب کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تحریر جو ایک یادگار اور تبرک کی حیثیت سے شامل کی جا رہی ہے، سید صاحب کے قلم سے اس وقت نکلی جبکہ اقبال کے چلے جانے کا غم بالکل تازہ تھا۔ یہ الفاظ جہاں ایک نثری نوحہ ہیں وہاں اقبال کی عظمت کو ایک ایسے عالم کا خراج عقیدت بھی ہے جس کا ثانی اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ مضمون معارف اعظم گڈھ کی مئے ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں چھپا تھا اور وہاں سے براہ راست نقل کیا گیا ہے۔

ماتمِ اقبال :-

وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ آخرموت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر

اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی۔ ایسا عارف فلسفی عاشقِ رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے۔

خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما! اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر۔

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا، وہ توحیدِ خالص کا پرستار اور دینِ کامل کا علمبردار اور تجدیدِ ملت کا طلبگار تھا، اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوستہ تھا اور اس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں۔ اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی ؏

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غمخواروں کی کمی نہیں اور نہ امّت کے دوستداروں کی قلت، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے مسلمان غمخوار پیدا کیے، ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم۔ دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا اور رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچا عشق نئے زمانے کی جھوٹی آب و تاب اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں۔ آفتاب اسلام کی ضیا باری کے مقابلہ میں ان کے سامنے جدید تہذیب و تمدن اور زمانہ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی،

خدا ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔

اقبال کی قومی شاعری بیسوی صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی، بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے اڑتیس برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھر دی اور نئے سفر کے قطع منزل کے لیے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کر دی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا۔

ع اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی۔ وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ رہے گا۔ ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، نظریئے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا۔ اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی۔ قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندۂ جاوید!

اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشناؤں میں سے تھا۔ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔

وفدِ کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا، افسوس ہے کہ اس میں یکے بعد دیگرے دو چل دیئے۔ سر راس مسعود اور اقبال۔ اب صرف ایک رہ گیا ہے اور معلوم نہیں کہ وہ بھی کتنے دن کے لیے ہے۔ آہ!

ع حریفاں بادہ ہا خوردند در فتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغِ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کیے تھے چنانچہ انہوں نے پیشگوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پر ہو جائے گی۔ افسوس

کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہو گئی اور اب اس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

اقبال! ہندوستان کا فخر اقبال! اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال! فضل و کمال کا پیکر اقبال!

حکمت و معرفت کا دانا اقبال! کاروانِ ملت کا رہنما اقبال!

رخصت رخصت!

الوداع الوداع!

سلام اللہ علیک ورحمتہ الیٰ یوم الشتات۔

اقبالؒ اور معاشیات

مسلمان محققین نے معاشیات کے میدان میں کام کرنے سے جو بے توجہی برتی اس کے نتیجے میں عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ اسلام معاشی مسائل کا کوئی واضح حل پیش نہیں کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن وحدیث، فقہ اور دیگر اسلامی کتب میں معاشی مسائل پر بہ کثرت حوالے موجود ہیں۔ لیکن معاشیات کے بہ حیثیت ایک علم کے ترقی پا جانے کے بعد سے جدید انداز سے بہت ہی کم کام ہوا۔ علامہ نے جہاں اس نئے علم کی طرف خود توجہ دی اور علم الاقتصاد[1] لکھی وہاں دیگر علماء اور محققین کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ معاشیات کے اسلامی پہلوؤں پر بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں (اس کا ایک اندازہ محمد اکرم خان صاحب کی مرتب کردہ کتابیات اسلامی معاشیات مطبوعہ اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور سے لگایا جا سکتا ہے۔) اسلامی معاشیات سے بے خبری کا نتیجہ تھا کہ جب کارل مارکس نے اشتراکیت کو پیش کیا تو جہاں کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی وہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو کارل مارکس کے فلسفۂ معیشت کا سراغ قرآن حکیم سے لگانے کی فکر میں مشغول ہو گئے۔ حتیٰ کہ اقبال کے بارے میں بھی اس طرح کی غلط فہمی پھیلائی جانے لگی کہ وہ اشتراکیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اقبال نے مغرب اور سرمایہ داری پر جہاں جہاں تند و تیز تنقید کی ہے اس کا مفہوم یہ لیا جانے لگا تھا کہ اقبال بھی اشتراکیت کے حامی ہیں۔ اخبار "زمیندار" کی اشاعت مورخہ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء میں شمس الدین حسن کا ایک مضمون پروفیسر

---

[1] علامہ نے یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں تحریر کی اس وقت تک اس میدان میں کسی مسلمان معیشت دان نے کام نہیں کیا تھا اس کے بعد لکھی جانے والی کتاب ابا سن برنی کی علم المعیشت تھی جو انجمن ترقی اردو کی جانب سے ۱۹۱۶ء میں چھپی اس طرح علامہ کو اردو زبان میں معاشیات پر سب سے پہلا مصنف قرار جا سکتا ہے۔

غلام حسین کے متعلق شائع ہوا جس میں اشتراکیت کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے صاحب مضمون نے علامہ اقبال کی ان نظموں کا حوالہ دیا جن میں سرمایہ و محبت کے متعلق اظہار خیالات ہوا تھا۔ اس حوالے سے شمس الدین حسن کا مقصد اشتراکیت کا جواز ثابت کرنا تھا۔ اس نے یہ تحریر کیا تھا۔

"اگر بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کیوں قانون کی زد سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاسیات کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی خضر راہ اور پیامِ مشرق کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں....."

علامہ اقبال نے اس کی فوراً تردید کی ضرورت سمجھی اور ایڈیٹر زمیندار کو ایک خط میں لکھا۔

"میں نے ابھی ایک اور دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بولشویک خیالات منسوب کیے ہیں چونکہ بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔

میں مسلمان ہوں میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانونِ میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقید ہے "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا" پ ۴ - ۲ میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار

نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔[1]

ڈاکٹر سید ریاض الحسن نے جو ان دنوں کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے سربراہ ہیں زمانہ طالب علمی میں ایم اے کا مقالہ اسلام کے معاشی نظام پر لکھا بعد میں انہیں خیال آیا کہ علامہ اقبال کے مشورے اور رہنمائی کے بعد مقالے کو مزید بہتر بنایا جائے چنانچہ انہوں نے اپنا مقالہ حضرت علامہ کی خدمت میں روانہ کیا اور ان سے رہنمائی کے طالب ہوئے۔ علامہ نے جواب میں انہیں مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کا مضمون پڑھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔ البتہ میں آپ کو یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آپ مسولینی کے نظریات کا بغور مطالعہ کریں۔ اسلامی معاشیات کی روح یہ ہے کہ سرمائے کی بڑی تعداد میں اضافے کو ناممکن بنا دیا جائے مسولینی اور ہٹلر کا انداز فکر بھی یہی تھا۔ بالشوزم نے سرمایہ داری کا کلیتاً خاتمہ کر کے انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے قرآن کہتا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ (البقرۃ - ۱۴۳)

(اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک امتِ وسط بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہوں)

اسلام کی شرائع کا موضوع یورپ نے حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ اور یہ موضوع ایسا اہم ہے کہ غالباً یورپی علماء اس کی طرف متوجہ ہوں گے بلاشبہ جرمن عالموں نے پہلے ہی اس پر کام کرنا شروع کر دیا ہے اسلام کی عمرانیات[2] نامی ایک کتاب کا مطالعہ بھی آپ کے لیے باعث افادیت ہوگا۔ میں مصنف کا نام بھول گیا۔"

---

[1] (گفتار اقبال" ۶-۸)

(بنام ڈاکٹر سید ریاض الحسن، ۲۹ مئے ۱۹۳۳ء، ہاشمی ۲۲۷-۲۲۹)

[2] Sociology of Islam نامی جس کتاب کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے یہ Prof. R. Levy کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ شائع

یہ عجیب بات ہے کہ اتنے واضح خیالات کے باوجود اقبال کو اشتراکی خیالات کا حامل ظاہر کرنے کی جسارت کی جاتی ہے۔ علامہ پر اس سے بڑا بہتان نہیں تراشا جاسکتا کہ انہیں بالشویک یا کمیونسٹ قرار دیا جائے اور ان کی شاعری میں جہاں سرمایہ داری کی مخالفت کی گئی ہے اس سے یہ نتائج برآمد کیے جائیں کہ وہ اشتراکی تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو افراط و تفریط کا شکار سمجھتے ہوئے اسلام کے معاشی افکار کو عملی طور پر نافذ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیمات میں اس دور کے تمام معاشی مسائل کا حل مضمر ہے۔ اس سے بڑھ کر علمی بددیانتی کیا ہو گی کہ علامہ کی اس واضح تحریر کے باوجود جو تفصیل سے نقل کی گئی ہے، کچھ لوگ علامہ کے خیالات کو مسخ کر کے پیش کرنے کی جسارت کریں۔

علامہ معاشیات کی اسلامی قدروں کے بارے میں تحقیق کی جانب نوجوانوں کو توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے مسلم انڈیا سوسائٹی کے نام سے ایک جماعت کی حمایت کی تھی اس سے جب لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ شاید کوئی سیاسی جماعت ہو اور مسلم لیگ کی حریف تو اس وقت انہیں وضاحت کرنا پڑی کہ ایسا نہیں۔ بلکہ اس نئی تنظیم کا مقصد اسلام کے اقتصادی پہلوؤں کی جانب توجہ کرنا ہو گا وہ لکھتے ہیں۔

"مسلم انڈیا سوسائٹی جس کے متعلق میں نے درانی صاحب اور دوسرے دوستوں کو مشورہ دیا تھا میرے خیال میں سیاسی جماعت نہیں ہونا چاہیے۔ درانی صاحب کو میرا مشورہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے اقتصادی پہلوؤں کے متعلق جوش و ذہنی انہماک پیدا کرنے کے متعلق تھا تاکہ ہماری نوخیز نسلیں اخلاقی سرگرمیوں سے بیش از پیش بہرہ مند ہوں اگر اس قسم کی سوسائٹی کا قیام معرضِ وجود میں آئے تو میری عمیق ترین ہمدردی اس کے ساتھ ہو گی۔" (گفتار ۲۰۸)

علامہ اقبال نے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کے اقتصادی پہلوؤں سے دلچسپی پیدا کی، وہ جہاں کہیں جوہر قابل دیکھتے اس کی رہنمائی کرتے۔ ۱۹۳۳ء میں علامہ کو افغانستان کا سفر

ہوئی تھی بعد میں یہی کتاب نظر ثانی اور ترامیم کے بعد Social structure of Islam کے نام سے شائع ہوئی۔

درپیش تھا اور دیگر مشغولیات بھی تھیں اس کے باوجود انہوں نے ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب کے خط کا جواب لکھتے ہوئے انہیں اسلام کے اقتصادی اصولوں کی بنیاد سے آگاہ کیا اور چند کتب کے حوالے بھی دیئے

1 نامی جس کتاب کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے یہ
کی تصنیف ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ شائع
ہوئی تھی بعد میں یہی کتاب نظر ثانی اور ترمیم کے بعد
کے نام سے شائع ہوئی ۔

خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں بھی اقبال نے انتہائی وضاحت کے ساتھ کارل مارکس کی مادی تعبیر کو سراسر غلط قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں "سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک معضوب ہے۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے۔ جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے"[1]

اس خط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وفات سے ڈیڑھ برس پہلے علامہ کے خیالات سوشلزم کے متعلق کیا تھے۔ وہ تاریخ انسانی کی مادی تعبیر کو جو کارل مارکس نے کی تھی سراسر غلط سمجھتے ہیں۔ اور اس کی مخالفت میں اس قدر شدید ہیں کہ لکھتے ہیں "میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا"۔

اسی طرح آل احمد سرور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر

---

[1] (بنام خواجہ غلام السیدین ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء اقبال نامہ اوّل ص ۳۱۸)

نقطہ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے اگر آپ پورے غور اور توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ آپ انہیں نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں۔ اس صورت میں غالباً آپ کے شکوک تمام کے تمام رفع ہو جائیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کا View مجھ سے مختلف ہو یا آپ خود دین اسلام کے حقائق کو ہی ناقص تصور کریں۔ اس دوسری صورت میں دوستانہ بحث ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا ہو۔[1]

علامہ جہاں علمی اعتبار سے اسلامی معاشیات کی تجدید نو کی طرف توجہ دلا رہے تھے وہاں انہوں نے معاشرے کے عملی مسائل اور مسلمانوں کی معاشی حالت کی طرف سے اغماض نہیں برتا۔ وہ مسلم معاشرے کی معاشی ابتری سے اچھی طرح آگاہ تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ معاشیات کے میدان میں خوشحالی کے لیے بھی یہ ضروری سمجھتے تھے کہ جہاں اچھے اہل حرفہ اور اہل صنعت کی ضرورت ہے وہاں اس امر کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے پکے مسلمان بنیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کی معاشی ابتری دور کرنے پر خاص طور پر توجہ دلائی۔ علامہ کے خیالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں تفصیلی طور پر جانا جائے وہ فرماتے ہیں۔

"اب میں چند خیالات اپنی قوم کے غربا کی عام حالت کی اصلاح کے متعلق ظاہر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں عام طبقہ کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہو گا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابل رحم ہے شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا، لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جا نکلو ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی

---

[1] (بنام آل احمد سرور ۱۲، مارچ ۱۹۳۷ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۱۴)

کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشیں بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا دم توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اڑ کر نہیں گیا لیکن عزت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ ہمارے نوجوان علم برادران اصلاح تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قوا کے رو افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی اور اعلیٰ کو کھائے جا رہا ہے علاوہ اس افلاس زدہ طبقے کے ایک اور طبقہ ان نکمے اور نکھٹو افراد کا ہے جو اپنے جیسی ناکارہ اولاد پیدا کر کے سستی دکاہلی اور بد اعمالی و سیہ کرداری کی زندگی خود بھی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا دیتے ہیں کیا ہم نے تمدنی عقدہ کے ان پہلوؤں پر بھی کبھی نظر ڈالی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص کی کلاہِ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے طرّے لگایا کریں بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں، سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے، یہ ہے کہ کیوں کر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے۔ اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات عادات اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا ہے اور اگر گورنمنٹ کے طرزِ عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد تک ہے؟ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑہ اٹھائے اسے چاہیے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے، اس لیے کہ اقتصادی

قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ شرح مال گذاری کا آئے دن کا اضافہ، مسکرات، ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد، قیمت اجناس کی گرانی خواہ اس گرانی کا باعث یہ ہو کہ سکہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کیے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے یا کوئی اور سبب ہو یہ تمام امور ایسے ہیں جو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں کی اقتصادی حالت پر یکساں مؤثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے منادی کر رہے ہیں کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے اور مقتدا اگر اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات میں تو ضرور آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کر سکتے ہیں لیکن مسلمان پیشوایانِ قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلہ پر صرف کیے رکھی ہے کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بحصہ رسدی ملتی رہیں۔ یہ کوشش بجائے خود ضرور قابل ستائش ہے اور تا وقتیکہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو، ہمارے سربرآوردگانِ ملت کو برابر اس کوشش میں سرگرمی کے ساتھ معروف رہنا چاہیے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی انہیں مدنظر رکھنی چاہیے کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ ہے۔ سرکاری ملازمت محدود ہے۔ وہ چند اشخاص کو ضرور آسودہ و خوشحال بنا دیتی ہے لیکن قوم کے تمام افراد اسی صورت میں آسودہ و خوشحال ہو سکتے ہیں جبکہ ان کو اقتصادی آزادی نصیب ہو۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوں تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی کے اور بہت سے اصناف ایسے ہیں جو اہمیت اور سودمندی میں سرکاری ملازمت کے لگ بھگ ہیں جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ روایات ترکہ میں پہنچی ہوں اس کے لیے سپہ گری کے تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت و حرفت کی ڈگر پر پڑ لینا یقیناً تکلیف دہ ہے لیکن چونکہ مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ایشیا کی تمام قوموں کی اقتصادی حالت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے لہٰذا یہ کودنا تو لنا ہی پڑے گی۔ علاوہ ان اقتصادی مشکلات کے رفع کرنے کے جو ہماری سنگ راہ ہیں ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہیے جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

صنعتی تعلیم سے عام خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کیلئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ بخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف ان چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے۔ ان کی دماغی قابلیت درجہ اوسط سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے ہمارے اغنیا کے بذل وجود کا مصرف ایسا ہونا چاہیے کہ عام مسلمانوں کے بچے ارزاں صنعتی تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم بلا کسی اخلاقی تربیت کے بجائے خود کافی و مکتفی نہیں ہے۔ اقتصادی مقابلہ میں تربیت کے اخلاقی عنصر کی کچھ کم ضرورت نہیں پڑتی۔ اعتمادِ باہمی، دیانت داری، پابندیٔ اوقات اور تعاون و اقتصادی اوصاف ہیں جو مہارتِ فن کی برابر کی جوڑ ہیں، ہندوستان میں بہت سے کارخانے محض اس لیے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو نہ تو ایک دوسرے پر بھروسہ تھا، اور نہ اصول امدادِ باہمی ان کا رہنما تھا۔ اگر ہم اچھے کاری گر، اچھے دکاندار، اچھے اہل حرفہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ انہیں اوّل پکا مسلمان بنائیں۔

علامہ نے معاشیات کے میدان میں برتری کے لیے جہاں مسلمانوں کو صنعتی تعلیم اور تجارت کی جانب توجہ دلائی وہاں انہیں اس اہم نکتہ پر بھی غور کرنے کے لیے کہ مسلمانوں میں اچھے اہل حرفہ اور اچھے شہری پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پکے مسلمان بنیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے اس جانب توجہ دی ہے وہ خوشحالی اور معاشی آسودگی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے اور جب بھی انہوں نے اسلام کی تعلیمات سے انحراف برتا تو آخرت کے خسران کے ساتھ ساتھ انہیں دنیا میں بھی نقصان اور گھاٹے ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خلافت راشدہ کا دور جہاں اخلاقی برتری اور اسلامی اصولوں پر عملدرآمد ہونے کا زرین دور تھا وہاں مسلمانوں میں معاشی آسودگی اور خوشحالی کا بھی دور دورہ تھا۔ خود برصغیر میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کا دور جسے ابھی تین صدیاں بھی نہیں گذریں اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ اس وسیع سلطنت میں جہاں ایک طرف شریعت کی حکمرانی تھی اور خود بادشاہ پابندِ صوم وصلوٰۃ اور انصاف کا پیکر عظیم تھا وہاں یہ وسیع سلطنت معاشی خوشحالی میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ عالمگیرؒ نے معاشیات کے اسلامی قوانین و محاصل پر اپنی حکومت کی بنیاد

رکھی گئی۔

اس کے دور میں جو اٹھارویں صدی کے اوائل میں نہ صرف بلحاظ آبادی اور وسائل دنیا کی سب بڑی (بشمول خلافت عثمانی) سلطنت تھی بلکہ بلحاظ تعلیم نظم ونسق اور فوجی تنظیم کے بھی معاصر سلطنتوں میں ممتاز تھی۔ اندرونی فتنوں اور خانہ جنگی اور بغاوت کے فرو کرنے یا رعایا کی سود و بہبود کے ہمہ گیر تقاضوں کو پورا کرنے میں عالمگیرؒ کو غیر مشروع محاصل کا سہارا نہ لینا پڑا بلکہ مآثر عالمگیری کی شہادت کے علاوہ سرکار اور مورلینڈ کی شہادت بھی یہی ہے کہ آپ نے اپنے دور میں ستر سے زائد غیر مشروع محاصل معاف کر کے مشروع محاصل سے ان اخراجات کی پابجائی کی۔ (جادوناتھ سرکار، مغل ایڈمنسٹریشن کلکتہ، ۱۹۳۵، ص ۸۱)

اسلامی محاصل نہ صرف ان معمولی اقیام، امن وامان، نظم ونسق، تعلیم وغیرہ) فرائض کی انجام دہی کے لیے کافی ہوتے بلکہ اتنے زائد ثابت ہوئے کہ اس عظیم الشان مملکت کی کروڑوں کی آبادی کے کروڑوں افراد کے معاشی کفیل تھے۔ چنانچہ تھامس کے الفاظ میں آدھی سلطنت حکمرانوں کی فیاضیوں پر، حتی ہے یا کم از کم اس کی ملازم یا تنخواہ یاب ہے، (ذرائع محاصل سلطنت مغلیہ ہند، ایڈورڈ تھامس، مترجمہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، ۱۹۴۵، ص ۶۱) اور مآثر عالمگیری کے الفاظ میں جس قدر خیرات ومبرات حضرت عہد معدلت میں ہوئی اور جس قدر وظائف علماء و فقراء و دیگر اہل احتیاج کو عطا کیے گئے اس کا عشر عشیر بھی کبھی کسی سابقہ حکومت میں رونما نہ ہوسکا۔ (مآثر عالمگیری مطبوعہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ ص ۳۶۸) یہ صدقات اسلامی پر عملدرآمد کا ثمر شیریں تھا۔

ط علامہ نے اہل وطن کو صنعتی ترقی اور تجارت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اور محنت کش طبقے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہاں تک کہا۔

"میں صنعت وحرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا ہوں اور اگر میرے دل کی پوچھو تو سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس بڑھئی کے ہاتھ جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے ہوگئے ہیں، ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوبصورت اور مفید ہیں۔ جنہوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا۔"

ل (قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک نظر از اقبال ص ۵۵ - ۵۶)

جس کے متعلق تھامس ہی کی شہادت ہے کہ عہدِ عالمگیری کی سرکاری آمدنی اپنے پیش روؤں (شاہجہاں اور اکبر) سے زیادہ تھی (تھامس صفحات ۶۶ - ۶۸) عالمگیر کے اس حسن انتظام، دین و دنیا کے بارے میں سلیقہ مندی اور اسلام اور کفر کی جنگ میں اسلام کے انتہائی قابل سپہ سالار ہونے کی وجہ سے ہی اقبال اس کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں

ع درمیانِ کارزار کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

علامہ اقبال اسلامی قوانین کے تفصیلی مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ صرف اسلام ہی مسلمانوں کے معاشی مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں قائداعظم محمد علی جناح" کے نام ایک خط میں روٹی کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس خط میں پاکستان کے قیام کے مطالبے کی طرف بھی واضح اشارہ موجود ہے وہ اسلامی ریاستوں کے قیام کو جواہر لال کی بے دین اشتراکیت کا جواب سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں۔

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں۔ کہ گذشتہ دو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو کی ساہوکاری و سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے لیکن یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے۔ اگرچہ ابھی قوی نہیں ہوا لیکن یہ نظریہ بھی پوری قوت و شدت حاصل کر کے رہے گا۔

جواہر لال کی منکر خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جا سکتی ہے؟ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے اور فقہِ اسلامی کا

مطالعہ مقتضیاتِ حاضرہ کے پیش نظر دوسرے مسائل کا حل بھی پیش کر سکتا ہے۔

شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ ایک مصیبت تو یہ ہے کہ کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا ایسی چند ریاستوں کی عدم موجودگی میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ اس ملک میں محال ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسے ہی مسلمانوں کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔ اگر ہندوستان میں اس طریق کار پر عملدرآمد اور اس مقصد کا حصول ناممکن ہے تو پھر ایک ہی راہ رہ جاتی ہے اور وہ خانہ جنگی ہے جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کئی سالوں سے شروع ہے

مجھے قوی اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمالی مغربی ہندوستان میں فلسطین کی سی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ جواہر لال کی اشتراکیت خود ہندوؤں میں کشت و خون کا موجب ہو گی۔ معاشری جمہوریت اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہو گا یا نہیں؛ میں اس سے متعلق تو کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس قدر صاف نظر آتا ہے کہ ہندو دھرم معاشری جمہوریت (سوشل ڈیماکریسی) اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم کا خاتمہ ہے۔

اسلام کے لیے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل کی ترویج جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔

مسائل حاضرہ کا حل مسلمان کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن جیسا اوپر عرض کیا ہوں۔ اسلامی ہندوستان میں ان مسائل کے حل بآسانی رائج کرنے کے لیے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آن پہنچا؟ شاید جواہر لال کی بے دین اشتراکیت کا

آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے

بہرحال میں نے اپنے خیالات آپ کی خدمت میں اس امید پر پیش کر دیئے ہیں کہ آپ ان پر اپنے خطبہ یا لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں پوری پوری توجہ مبذول کر سکیں۔

اسلامی ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی فطانت و فراست ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی!"

یہ خط بصیغۂ راز تھا اقبال کا پہلے خیال تھا کہ اخبارات میں قائداعظم کے نام ایک کھلا خط شائع کریں لیکن مزید غور پر انہوں نے اس وقت کو اس کے لیے موزوں نہ پایا۔ اقبال کے اس خط کو ابھی تین سال بھی نہ گذرے تھے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس نے قرارداد پاکستان پاس کر کے علامہ اقبال کے ان خیالات کو ایک عملی اقدام کی شکل دے دی۔ اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اسلامی قانون کے نفاذ کو کس قدر اہم سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے معاشی مسئلہ کے حل کو اس سے وابستہ سمجھتے تھے۔

علامہ کی اسلام کے معاشی پہلو سے دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لارڈ لوتھین کو بھی اس طرف متوجہ کرتے ہیں، لارڈ لوتھین برطانیہ کے طبقۂ نوابین کے اہم رکن تھے۔ وہ امریکہ میں برطانیہ کے سفیر بھی رہ چکے تھے اور علامہ کے انگریزی خطبات کی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے اشاعت میں ان کی کوششوں کا دخل تھا۔ ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"وقت آگیا ہے کہ انگلستان اسلام کے ثقافتی پہلو میں خاص طور پر دلچسپی لے۔ اسلام معاشی نظام کی حیثیت سے بہت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور موجودہ دور کی مشکلات کے عملی حل پیش کر سکے گا۔" (ہاشمی ۲۲۵)

علامہ مغرب کے معاشی نظریات سے قطعاً متاثر نہ تھے۔ ابتدائی دور میں بھی جب انہوں نے علم الاقتصاد لکھی، وہ مغرب کے مختلف نظریات سرمایہ داری، اشتراکیت وغیرہ کو درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے ان کا ہمیشہ سے یہی خیال رہا کہ معیشت کو اخلاقی اصولوں سے الگ کر دینے کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ وہ اخلاق کو معیشت سے مقدم سمجھتے تھے اور دولت

یا سرمایہ کو مقصدِ حیات نہیں بلکہ ذریعہ حیات جانتے تھے، علامہ لکھتے ہیں۔

"خوراک، لباس، مکان ہماری زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان کے مقاصد کی قدر پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصل وقعت صرف اسی صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں۔ اس لیے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے کسی قدر مطالعہ علم الاخلاق کا بھی ضروری ہے۔ اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلا لحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے، بجائے خود ایک مقصد تصور کی گئی جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ اگر دولت ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو یہ بے فائدہ ہے کیونکہ دولت یا سرمایہ بھی مقصدِ حیات نہیں بلکہ ذریعۂ حیات ہے"[1]

علامہ جہاں اشتراکیت کو اسلام کے اصولوں کے منافی سمجھتے تھے وہاں وہ مغرب کے اس نظام سرمایہ داری کے بھی خلاف تھے کیونکہ جہاں یہ نظامِ دولت کو زندگی کے مقاصد کا درجہ عطا کرتا ہے اور زندگی کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ علامہ لینن کی زبان سے مغرب کے اس بے رحمانہ اقتصادی نظام کا پردہ چاک کرواتے ہیں۔

لینن خدا کے حضور میں پہنچتا ہے تو اسے وہ عالم اپنی آنکھوں سے نظر آتا ہے جسے وہ محض مذہب کی خرافات کہتا رہا تھا وہ کہتا تھا۔

؎ آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات[2]

اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں مغرب کے نظام کی چیرہ دستیوں کا ذکر

---

[1] علم الاقتصاد از علامہ اقبالؒ ص ۲۲

[2] بالِ جبریل ۱۴۴

کرتے ہوئے کہتا ہے۔

مشرق کے خداوند سفیرانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!
رعنائیِ تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات[1]

علامہ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ایشیا، کی مجبور و مقہور قومیں مغرب کے سرمایہ داری نظام کی گرفت کو کمزور بنا دیں گے اور اس سے نجات حاصل کر لیں گی۔ آپ نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور ۳۲ء میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہا:

"ایشیائی قومیں لازماً اس استفادی اقتصادیات کے خلاف بغاوت کریں گی جو مغرب نے مشرق پر جاری کر دی ہے۔ ایشیاء اپنی انفرادیت کے ساتھ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھ نہیں سکتا۔ تم اپنے اندر جو اعتقاد رکھتے ہو۔ وہ فرد کی اہمیت کا قائل ہے اور اس چیز کے لیے کوشاں ہے کہ تم خدا اور انسان کی خدمت کر سکو۔ اس کے امکانات ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آئے۔ وہ اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے۔ جہاں ذات رنگ یا دولت کے پیمانے سے اس کی عظمت کو ناپا نہیں جاتا بلکہ اس کی طرزِ زندگی سے جہاں غریب امیروں

---

[1] (بالِ جبریل ۱۴۵ - ۱۴۷)

پر ٹیکس عائد کرتے ہوں جہاں انسانی سوسائٹی شکم کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی کو عقد میں لاسکتا ہو جہاں ذاتی ملکیت ایک امانت ہو۔ جہاں اس طور پر اکتنازِ دولت کا امکان نہ ہو کہ وہ دولت پیدا کرنے والے پر ہی چھا جائے۔ (حرفِ اقبال از لطیف احمد شیروانی ص - ۱۷)

یہاں اقبال نے جہاں مغرب کے اس نظام کی مذمت کی ہے جو دولت کے ارتکاز کو مطمع نظر بناتا ہے وہاں اشتراکیت کی مساواتِ شکم پر قائم اساس معیشت کو بھی رد کیا ہے کارل مارکس کے اس فلسفے کو جاوید نامہ میں یوں بیان کیا ہے کہ

دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس [1]

علامہ مساواتِ شکم کی بجائے حقیقی مساوات واخوت کے قائل تھے۔ وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دونوں نظام خدا کے منکر، روح کے دشمن اور انسان کو دھوکہ دینے والے ہیں۔ جہاں اشتراکیت تشدد کے ذریعے انتذار حاصل کرتی ہے وہاں ملوکیت محکوموں کے گاڑھے پسینے کی کمائی چھین کر عیش وعشرت کے سامان مہیا کرتی ہے۔ ان دونوں چکی کے پاٹوں کے درمیان انسان پس رہا ہے۔ جہاں اشتراکیت علم، دین اور فن کی قاتل ہے وہاں ملوکیت جسم سے روح نکال لیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا بھی چھین لیتی ہے۔ دونوں نظام مادہ پرستی پر مبنی ہیں۔ تن کو بارونق اور دل کو تاریک بناتے مگر انسانی زندگی کا اصل مقصد حیوانوں کی طرح کھانا پینا اور مرجانا نہیں بلکہ زندگی کے خمیر میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا اعلیٰ نصب العین حاصل کرنا ہے۔ علامہ کہتے ہیں۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس و آدم فریب
زندگی ایں را خراج آں را خراج — درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں بر دجاں راز تن نان راز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل

---

[1] (جاوید نامہ - ۶۹)

زندگانی سوختن با ساختن
در گِلے تخمِ دلے انداختن [1]

علامہ کے معاشی افکار پر سید نذیر نیازی صاحب اپنی کتاب میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ انہیں سیالکوٹ میں یوم اقبال کے سلسلے میں اسلام کے معاشی نظام پر علامہ اقبال کے خیالات پر مشتمل مقالہ لکھنا تھا انہوں نے علامہ سے اظہار مدعا کیا۔ علامہ نے جو کچھ بیان کیا وہ سید نذیر نیازی صاحب نے ۱۴ر جنوری ۱۹۳۸ء کے ملفوظات کے ضمن میں یوں تحریر کیا ہے۔

میں نے کہا ایک مسئلہ ارشاد ہو تو عرض کروں۔ فرمایا کیا؟ میں نے عرض کیا یہ زمانہ سرمائے اور محنت کی کشمکش کا ہے۔ ایک طرف اشتراکیت ہے دوسری جانب سرمایہ داری۔ ارشاد ہوا "ٹھیک ہے لیکن تمہارا سوال کیا ہے؟" عرض کیا سوال یہ ہے کہ سائل دولت پر گفتگو کیجیے یا فلاح عامہ کا ذکر چھیڑیئے یا کوئی ایسی بات کیجیے جس سے سیاسی اور معاشی انصاف کا پہلو نکلے تو لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔ مزدور کا حق زبان پر لائیے تو اعتراض ہوتا ہے کہ یہ اشتراکیت کی منطق ہے۔ اس سے مادیت اور لادینی کی بو آتی ہے فرد کی صلاحیتوں حریت اور آزادی پر زور دیجیے تو معترض سمجھتا ہے سرمایہ داری کی حمایت کی جا رہی ہے۔ حضرت علامہ بتوجہ میری معروضات سن رہے تھے فرمایا جو کچھ تم کہہ رہے ہو تمہارے سوال کی تمہید ہے۔ سوال کیا ہے؟

میں نے طوالتِ کلام پر معذرت کرتے ہوئے عرض کیا سوال یہ ہے کہ بحالتِ موجودہ ہمارے سامنے دو ہی نظام ہیں۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد۔ مگر دونوں اس امر کے دعوے دار کہ انسان کی بھلائی انہی میں ہے۔ اسلام بظاہر دونوں کے خلاف ہے گویا خیال بھی ہوتا ہے کہ اس میں دونوں کی گنجائش ہے حالانکہ یہ دونوں نظام باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ اندریں صورت ہم کیا کہیں کہ اسلام کی روش سرمایہ اور محنت کے بارے میں کیا ہے؟ یعنی اس کے نظامِ اجتماع و عمران میں سیاست اور

---

[1] (کلیاتِ اقبال ص ۷۵۳)

معاش کو باہم تعلق کیا ہے؟ بالفاظ دیگر وہ کیا نظام معیشت ہے جو ازروئے شریعت وجود میں آئے گا؟

ارشاد ہوا: "تم ابھی تک اپنا سوال متعین نہیں کر سکے۔ تم نے جو بات کی وہ ایک طویل اصولی بحث ہے۔ تمہارا ذہن اس بحث کی طرف منتقل ہوا تو کیونکر؟ تمہاری مشکل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا زمین کی ملکیت اور عدم ملکیت کے مسئلے سے۔ اس لیے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی بحث میں سرِدست یہی مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ کارخانہ داری کی تو ابھی ابتداء ہے یہ مسئلہ طے ہو جائے تو بحیثیت ایک قوم ہم اپنا مؤقف بھی متعین کر سکیں۔ نہ یہ کہا جائے کہ دین سے انحراف ہو رہا ہے نہ یہ کہ دین کیا ہے؟ محض سرمایہ داری کا پردہ!

ارشاد ہوا" زمین کے بارے میں شریعت کے احکام واضح ہیں۔ قرآن پاک نے صاف اور صریح الفاظ میں کہا ہے الارض اللہ (جیسے الملک اللہ، الحکم اللہ) البتہ اس سلسلے میں جو مشکل ہے وہ یہ کہ اسلام جیسا کہ بارہا کہہ چکا ہوں دین ہے مذہب نہیں۔ لہٰذا جہاں تک سیاسی اور معاشی مسائل کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں اسلام ایک عمرانی تحریک بھی ہے لیکن یہی نکتہ ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا لہٰذا اس سلسلے میں جو بے سر و پا سوالات اٹھائے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ بحیثیت ایک نظامِ مدنیت اسلام ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ نظامِ مدنیت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعورِ ملی بیدار ہو گا اور وہ سمجھیں گے کہ حیاتِ ملی عبادت ہے ایک سیاسی اجتماعی ہیئت سے نہ کہ صرف ایک اخلاقی اور مذہبی نظام سے۔ ذرا اس شعور کو بیدار ہو لینے دو۔ زمانہ خود ہی سمجھا دے گا کہ مسائل کیا ہوتے ہیں اور ان کا ہر پہلو واضح طور پر سامنے رکھو۔ مدارِ بحث بھی سرتاسر اسلام کو ہونا چاہیے۔ جو کچھ لکھو اصولاً اور بااحتیاط۔

(اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں) مرتبہ سید نذیر نیازی جلد اوّل ص ۷۵ - ۷۷)

اسلام کو ایک اجتماعی ضابطے اور عمرانی تحریک کی حیثیت سے نہ سمجھے جانے کی وجہ تھی کہ جب مغرب کی حکمران اقوام کے اجتماعی ضابطے اور فلسفے اپنی تمام تر سیاسی بالادستی

سمیت مسلمانوں کے سامنے آئے تو انہوں نے انہیں سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اپنے جواہر ریزوں سے عدم واقفیت نے پتھروں اور خزف ریزوں پہ کئے گئے نقش و نگار کو اصل سمجھا اور انہیں دل و دماغ کے جھروکوں میں سجا کر رکھا۔ اسلام نے ہمیں جو نظامِ مدنیت عطا کیا تھا وہ سیاسی ملوکیت کی طویل رات میں گم ہو چکا تھا اب اسلام کی حیثیت ایک پرشکوہ دین کی نہ رہی تھی جو قوت نافذہ بھی رکھتا ہو۔ اس کے احکام اب کرسیٔ عدالت سے فیصلے کے نہیں بلکہ کتابوں میں پڑھنے پڑھانے اور لفظی موشگافیوں کے لائق سمجھے جانے لگے تھے۔ یہی حالت تھی کہ کوئی کہہ اٹھا تھا کہ

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

یہ دیو اس ملوکیت کے جبر و استبداد کا تھا جس نے اس دور میں اپنے چہرے پہ کئی خوشنما نقاب سجا رکھے تھے لیکن جنہیں اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت عطا کی تھی وہ اس کے اصل چہرے کو پہچانتے تھے علامہ نے اپنی وفات سے چار ماہ قبل یکم جنوری ۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن سے جو پیغام نشر کروایا اس کی حیثیت مغرب کے خلاف ایک فردِ جرم کی سی ہے اگر ان تمام ہلاکتوں کا جائزہ لیا جائے جو اس پیغام سے صرف تین سال بعد دوسری جنگ عظیم کی شکل میں شروع ہو گئی تھیں اور آنے والے پانچ برسوں میں انسانیت کے خون سے کھیلتی رہیں تو علامہ کا یہ بیان الہامی کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

"ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کے نیچے کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں روحِ آزادی اور شرفِ انسانیت کو اس طرح کچلا جا رہا ہے اور انسانی تاریخ کا کوئی تاریک ترین دور بھی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ وہ نام نہاد مدبرین جن کے ہاتھوں میں حکومت اور انسان کی زمام سونپی گئی تھی، خونریزی اور جبر و استبداد کے شیطان ثابت ہوئے ہیں وہ حکمران جن کا فرض تھا کہ وہ ان تصورات کی حفاظت اور آبیاری کرتے جن سے

اعلیٰ انسانیت وجود میں آتی ہے۔ انسان کو انسان کے تسلط سے بچاتے اور بنی نوع انسان کی اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرتے انہوں نے اپنے غلبہ و تسلط کی بھوک میں مبتلا اور استعماری جبر میں اندھے ہو کر مخصوص گروہوں کی حرص و آز پورا کرنے کے لیے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا اور لاکھوں کو دام غلامی کا پنجیر بنایا۔ کمزور لوگوں کو غلام بنانے اور ان کی گردنوں پر اپنی حکومت کا جوا سلط کرنے کے بعد ان کو ان کے املاک، مذہب، اخلاق، تہذیبی و ثقافتی روایات اور جاگیر داری سے محروم کر دیا پھر انہوں نے ان کے اندر انتشار و تفرقہ کا بیج بو دیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے گلے کاٹیں اور جاگیر داری کے جھنڈے تلے سو جائیں تاکہ ملوکیت کی جونک کسی مداخلت کے بغیر پورے اطمینان کے ساتھ ان کا خون چوستی رہے۔"[1]

اقبال کا یہ نشتر یہ ان لوگوں کی توجہ چاہتا ہے جو دو ہلاکت خیز جنگوں میں مبتلا کرنے والے استعمار کے حقیقی روپ پہچاننے میں اب بھی ناکام رہے ہیں جو اب بھی کبھی سفید سامراج اور کبھی سرخ آمریت کو سینہ سے چمٹائے ہوئے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے دکھوں کا مداوا انہی قاتلوں کے پاس ہے جن کی آستینیں کوریا سے لے کر انگولا تک کے لہو سے رنگین ہے یہ سفاک قومیں اپنی معاشی بالادستی سے غریب اقوام کے سرمایہ کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں ہیں ان کے سودی نظام کی لپیٹ میں دنیا کے بیشتر ممالک آچکے ہیں اور یہ ان مجبور اقوام کے اخلاق، دین اور تمدن ہر پہلو کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وقت آن پہنچا ہے کہ انسانیت کو ان مہذب درندوں سے نجات دلائی جائے اور امت مسلمہ انسانیت کی تعمیر نو کا عظیم فریضہ انجام دے۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

---

[1] (حرفِ اقبال، شیروانی ص ۲۲۳)

اقبالؒ اور تصوّف

علامہؒ کے نظریات تصوّف کے بارے میں کیا تھے، اس کے بارے میں آپ کے کلام اور نثر کی تحریروں سے روشنی پڑتی ہے۔ علامہؒ نے اپنی زندگی میں مسلمان اقوام کو قعرِ مذلت میں دیکھا جس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔ سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کا حادثہ، برطانوی ہند میں مسلمانوں پر ظلم و ستم، بین الاقوامی یہود کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں، غرض انوری کے بقول ہر بلا آسمان سے اُترتے وقت مسلمانوں ہی کا گھر پوچھتی تھی۔ ان حالات میں اقبالؒ بجا طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس مرگِ مفاجات کی تہہ میں جرمِ ضعیفی کارفرما ہے۔ بدقسمتی سے وہی تصوّف جو قرونِ اولےٰ میں حسنِ عمل اور اخلاص فی العمل کے ہم معنی تھا اور جو تعلق باللہ کا نقیب تھا، مسلمانوں میں رہبانیت اور حقائق سے فرار اختیار کرنے کا بہانہ بن چکا تھا۔ تصوّف کے ڈانڈے جہاد سے ملتے ہیں، لیکن یہاں جہاد کے بالکل برعکس محض اللہ، کی ضربیں لگانے پر اکتفا کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان میں بالخصوص تصوّف نے جو شکل اختیار کر لی تھی وہ عجمی تصوّرات سے قریب اور اسلام کی عملی اور سخت کوش روح سے متصادم تھی۔ ان حالات میں جہاں ایک طرف علامہؒ نے تصوّف کی غیر اسلامی شکلوں کے خلاف کی بہت شدید تنقید کی، وہاں دوسری طرف انہوں نے اس تصوّف کی بہت تعریف بھی کی جو عمل میں اخلاص پیدا کرتا تھا۔ جہاں ذکر کی گرمی سے عملی قوار کو تقویت ملتی تھی اور زندگی میں حرکت اور توانائی پیدا ہوتی تھی۔ اب کرامتوں کے تذکروں پر اکتفار تھا۔ وہ سیرت مفقود تھی جو کہ زندگی کی تلخیوں کو شیریں بنانے اور سخت کوشی سے زہر زندگانی کو انگبیں کرنے کی کرامت اپنے اندر رکھے۔ علامہؒ اس تصوّف کے قائل نہ تھے جو کسی خاص وضع قطع، انداز سخن اور اصطلاحات تک محدود ہو۔ علامہؒ خود کہتے ہیں۔

؎ اقبال قبا پوشد در کارِ جہاں کوشد
برخیز کہ درویشی با دلق و گلیمے نیست

عجمی تصوّف کے اثرات کی وجہ سے خانقاہوں میں سیرت و کردار کی متاعِ مفقود ہو چکی تھی۔ اب یہاں قال اللہ و قال الرسول کی باتیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ کشف و کرامات کے تذکرے، تعویذ گنڈوں کے سلسلے، سستی نجات کے نسخے اور دنیوی کاروبار میں ترقیوں کے لئے وسیلے تو ملتے تھے لیکن وہ کیفیات موجود نہ تھیں جن کا ذکر اقبال نے یوں کیا ہے۔

؎ تکیہ بر حجت و اعجازِ بیاں نیز کنند — کارِ حق گاہ بشمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہِ خرقہ زرہ می پوشند — عاشقان بندۂ حال اند و چناں نیز کنند [1]

اسی لئے انھیں کہنا پڑا۔

؎ اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک — نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

اس میں شک نہیں کہ علامہ کو اہل اللہ سے گہری ارادت مندی تھی وہ ان اولیاء اللہ کے دل سے قائل تھے جو سیرتِ اسلامی کی متاعِ گراں بہا سینوں میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں انہوں نے کہا۔

؎ نہ پوچھ! ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو مل ان سے
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

تاہم ایسے خرقہ پوشوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کہنا پڑا۔

؎ اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز
اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز [2]

---

[1] کلیاتِ اقبال ۴۳۴ [2] بالِ جبریل ۴۲

؎ نگاہِ گرم کر شیروں کے جس سے ہوش اُڑ جائیں
نہ آہِ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

؎ یہ معاملے ہیں نازک جو تیری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

؎ رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی [1]

اقبالؔ کے دور میں پنجاب کے پیروں نے بالخصوص انگریزوں کی کاسہ لیسی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ لوگ جن کے آباؤ اجداد اعلائے کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علمبردار تھے، ان کی اولاد آج انگریز کی افواج میں بھرتی کے لئے ممد و معاون ثابت ہو رہی تھی اور ایسے تعویذ دے رہی تھی جس سے ان کے بقول وہ دشمن کی گولی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ یہ پیر بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بنا دیئے گئے تھے اور ان کا سیاسی کردار بیسویں صدی کے پہلے تین دہوں میں انتہائی مکروہ صورت میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے نشۂ خدمتِ سرکار میں مست پیر زادوں کے بارے میں حضرت مجددؒ کے ساتھ مکالمہ یوں بیان کیا۔

؎ حاضر ہوا میں شیخِ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار

اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

---

[1] (بالِ جبریل، ۴۷)

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں میری بینا ہیں و لیکن نہیں بیدار

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر خطۂ پنجاب سے بیزار

عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطّہ کہ جس میں
پیدا کلہِ فقر سے ہو طرّۂ دستار

باقی کلہِ فقر سے تھا ولولۂ حق
طرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار[1]

علامہ اس تصوّف کے خلاف تھے جو عجمی اثرات کے تحت مسلمانوں میں پھلا پھولا۔ دوسری طرف انہیں اس تصوّف سے کوئی کد نہ تھی جو اخلاص فی العمل کے مترادف تھا بلکہ وہ اس کے خود قائل تھے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے حافظ اسلم جیراج پوری کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

تصوّف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرونِ اولےٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوّف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالےٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ میں نے ایک تاریخ تصوّف کی لکھنی شروع کی تھی مگر افسوس کہ مسالہ نہ مل سکا اور ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔ پروفیسر نکلسن "اسلامی شاعری اور تصوّف" کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو عنقریب شائع ہوگی، ممکن ہے کہ یہ کتاب ایک حد تک وہی کام کر دے جو میں کرنا چاہتا تھا۔ منصور حلاّج کا رسالہ کتاب الطواسین، جس کا

---

[1] (بالِ جبریل ۲۱۱-۲۱۲)

ذکر ابنِ حزم کی "فہرست" میں ہے، فرانس میں شائع ہوگیا ہے۔ مؤلف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں، آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابنِ حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے، اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے لطف یہ ہے کہ ۔ غیر صوفیا قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے۔ معلوم نہیں متاخرین اس کے اسقدر دلدادہ کیوں ہو گئے۔ مذہبِ آفتاب پرستی کے متعلق جو تحقیقات حال میں ہو رہی ہیں، اس سے اُمید ہوتی ہے کہ عجمی تصوّف کے پوشیدہ مراسم کی اصلیت بہت جلد دنیا کو معلوم ہو جائے گی۔[1]

تصوّف کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خیالات بھی علامہؒ سے مختلف نہ تھے۔ ان کے نام ایک خط سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ لکھتے ہیں۔ "آپ کا نوازش نامہ قوّت روح اور اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔ میں ایک مدّت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد انہیں نتائج پر پہنچا ہوں جو آپ کے والا نامے میں درج ہیں۔ جو کام آپ کر رہے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوّف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔

آپ کو خیر القرون قرنی والی حدیث یاد ہوگی۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری اُمّت میں تین قرنوں کے بعد السمنُ (و رنظہر فیہم السمن) کا ظہور ہوگا۔ میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار وکیل امرتسر میں شائع کئے تھے، جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ "سمن" سے مراد رہبانیت ہے جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی۔ ائمہ محدثین نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یہ لکھا ہے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ہے۔ مگر لسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں کھلتا۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی اور علالت

---

[1] (بنام حافظ محمد اسلم جیراج پوری، ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء، اقبال نامہ اول ۵۳/۵۵)

کی وجہ سے میں ان مضامین کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سنبت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقشبند رح اور مجدد سرہند رح میرے دل میں بہت عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدین (عبدالقادر گیلانی رح) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔[1]

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں علامہ خود سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے وہاں مولانا سید سلیمان ندوی رح نے مولانا اشرف علی تھانوی رح سے بیعت کی تھی۔ یہ ہر دو اصحاب تصوف کو اخلاص فی العمل کا مترادف سمجھتے تھے اور جو عجمی گمراہیاں مختلف سلسلوں میں سرایت کر گئیں تھیں، ان کے خلاف تھے۔ ان عجمی گمراہیوں میں سے سب سے بڑی یہ تھی کہ اسلام، جو کہ قوت اور شوکت کا پیغام تھا، ضعف اور مسکینی کا مظہر بن گیا تھا۔ علامہ نے افلاطون اور حافظ پر جو شدید تنقید کی، وہ اسی وجہ سے تھی کہ ان کے خیالات میشی و گوسفندی سے لبریز تھے اور ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔

؎ باقی نہ رہے شیر نہ شیری کا فسانہ

اقبال اکبر الہ آبادی کے اس خیال سے بالکل متفق تھے کہ "مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے"۔ ان کو لکھتے ہیں۔ "یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کیلئے یہی خیال محرک ہوا۔ میں گذشتہ دس سال سے اسی پیچ و تاب میں ہوں"۔[2]

لکھتے ہیں "کبھی موقع ہوتا ہے تو اپنا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں۔ یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدا تعالےٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی اور آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ کئی صدیوں سے علماء اور صوفیاء میں طاقت کے

---

[1] بنام سید سلیمان ندوی رح ص ۷۷، ۷۹ - ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء اقبال نامہ اوّل

[2] بنام اکبر الہ آبادی، ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۵ - اشعار اقبال

لیئے جنگ رہی، جس میں آخر کار صوفیا غالب آئے یہاں تک کہ اب برائے نام علماء اکرام باقی ہیں، وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں، ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے یہ روش، گویا علماء کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانیؒ، عالمگیرؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوت عمل مفقود ہے ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔[1]

اس گروہ صوفیاء نے جس کا ذکر اقبال نے کیا ہے گروہ احرار کو اس لیے کامیاب نہ ہونے دیا کہ اوّل الذکر کا تعلق عجمی تصوف سے تھا جو کہ طبائع کو پست کر دینے والا ہے اس سے ادبیات اور اشعار میں ایک چٹخارہ سا تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است لیکن اس سے قوم کے عملی پہلوؤں کو زک پہنچتی ہے اور دلوں میں جو امنگ قوت اور جذبہ اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے برعکس نتائج نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال عجمی تصوف کے خلاف تھے۔ اسرار خودی میں حافظ پر بھی علامہ کو یہی اعتراض تھا کہ اس کے اشعار ایک انفالیت (Passive Attitude) کے علمبردار ہیں۔ آپ اکبر الہ آبادی کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن و چمک پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے Pessimistic Literature کبھی زندہ نہیں رہ سکا۔ قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا Optimistic ہونا ضروری ہے۔ اسرار خودی میں حافظ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں جن کا

---

[1] / اکبر الہ آبادی ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء / اقبال نامہ دوم ص ۴۸ - ۴۹ /

عنوان یہ ہے۔

"درحقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ"

علامہ کا تصوف کے بارے میں کیا نظریہ تھا اس کے بارے میں ان کے خطوط اور کلام میں مختلف جگہ اشارات ملتے ہیں۔ آپ نے اپنے ایک ملاقاتی ڈاکٹر سید اللہ سے گفتگو کے دوران فرمایا:

"تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے۔ یونانی تصوف، ایرانی تصوف، ہندوستانی تصوف سب انحطاطِ قومی کے نشان ہیں۔ اسلامی تصوف بھی اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔ اسلام کے اولین دور کے صوفی زاہد تھے اور زہد اور تقویٰ ان کا مقصد تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعات اور نظریات شامل ہو گئے۔ تصوف اب محض زہد نہیں رہتا اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں۔ یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے۔ اور اس کی فدر کثرت نہیں بلکہ شرک ہے۔ وہ فلسفہ اور وہ مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشو و نما کے منافی ہو بیکار چیز ہے۔ تصوف نے روح کو بہت نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے تعویذ Scientific تلاش کرتے ہیں۔ گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جد و جہد سے کرنے کی جگہ سہیل طریقوں کی تلاش ہے "شجر ممنوعہ" میرا خیال ہے تصوف سے مراد ہے خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

پھر فرمایا انا الحق کے معنی یہ نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ انا ہی اصل چیز ہے۔ بندہ اگر خدا میں گم ہو گیا تو اس سے اپنی ہستی مٹا دی۔"[1]

---

[1] (بنام اکبر الہ آبادی ۱۱ جون ۱۹۸۰ء، اقبال نامہ دوم ص: ۵۶ - ۵۷)
[2] گفتگو ۱۰۷ - ۱۰۸)

اقبالؒ اور حافظؒ :-

عبدالرشید طارق صاحب لکھتے ہیں کہ انہوں نے خواجہ حافظ پر ایک مقالہ لکھا تھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ صوفی نہ تھے۔ ایک شام جب انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ "خواجہ حافظ حقیقت میں صوفی نہ تھے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے مولانا جامیؒ کی کتاب نفحات الانس کا حوالہ دیا اور کہا کہ صوفیوں کی اصطلاحات اور زبان کے استعمال سے کوئی صوفی تھوڑا ہی بن جائے گا جس طرح Cowl پہننے سے کوئی پادری نہیں بن جاتا۔

اس سلسلے میں انہوں نے خواجہ حافظؒ کی شاعری، ان کی سہل انگاری، تن آسانی اور حجرہ نشینی کی تعلیم اور جبر و قدر کے نقطۂ نظر کے تباہ کن نتائج پر روشنی ڈالی، فرمانے لگے صوفی عمل کی تلقین کرتا ہے اور یہ خواجہ حافظؒ کے یہاں مفقود ہے اس کا اثر جو کچھ ہندی مسلمانوں پر ہوا وہ ظاہر ہے۔ یہاں سے پلٹے تو فرمانے لگے میں ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل سے ناامید نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ عنقریب ان میں کوئی ۔ ۔ ۔ Guiding spirit ← نمودار ہو گی۔ فقر کی بابت پوچھا تو فرمایا فقر سے میری مراد افلاس اور تنگدستی نہیں بلکہ استغنا و دولت سے لاپرواہی ہے۔ دولتِ جوہر مردانگی کی موت ہے۔ اس سے جرأت اور بہادری جاتی رہتی ہے۔"

ع میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری [1]

محمد دین فوق صاحب نے یادِ رفتگاں کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جو اولیائے اللہ کے تذکروں پر مبنی تھی۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں۔

"اہل اللہ کے حالات جو آپ نے بنام یادِ رفتگاں، تحریر فرمائے ہیں مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض باتوں سے تو جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا۔ خدا کرے آپ کی توجہ اس طرف لگی رہے۔ زمانہ حال کے مسلمانوں کی نجات

---

[1] (ملفوظات ۲۲۸ - ۲۲۹)

اسی میں ہے کہ ان لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل علت حسنِ ظن کا دور ہو جانا ہے۔

بھائی فوق! خود بھی اس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقاً مل جاتا ہے۔[1]

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ جہاں دردِ دل کی لازوال نعمت سے مالا مال تھے وہاں وہ اہلِ دل حضرات کی جستجو میں بھی رہتے تھے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے متاثر ہو کر علامہ نے وہ نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے

ع تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

تاہم آپ تصوف کی اس روش سے مطمئن نہ تھے جو عوام میں مقبول ہو چکی تھی اور جس کے بارے میں علامہ کا خیال تھا کہ یہ عام اخلاقی اعتبار سے بھی اقوامِ اسلامیہ کے لیے مضر ہے یہ تصوف فلسفہ کی آمیزش کی وجہ سے اخلاص فی العمل کی بجائے ایک الگ حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں۔

"فارسی شعراء نے جو تعبیر اس مسئلے (وحدۃ الوجود) کی کی ہے اور جو جو نتائج اس سے پیدا کیے ہیں ان پر مجھے سخت اعتراض ہے۔ یہ تعبیر مجھے نہ صرف عقائدِ اسلامیہ کی مخالف معلوم ہوتی ہے بلکہ عام اخلاقی اعتبار سے بھی اقوامِ اسلامیہ کے لیے مضر ہے یہی تصوف عوام کا ہے اور شیخ علی حزیں نے بھی اسی کو مدنظر رکھ کر کہا تھا کہ 'تصوف برائے شعر گفتن خوب است'، لیکن حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ خود سلسلہ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔۔ بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دیئے ہیں۔ جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے وہ تصوف کا غیر خواہ ہے نہ (کہ) مخالف۔ انہی غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے ہی مغربی محققین نے تمام تصوف کو غیر اسلامی قرار دے دیا ہے اور یہ حملہ انہوں نے حقیقت میں مذہب اسلام پر کیا ہے۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ

---

[1] بنام محمد دین فوق ۷/ اکتوبر ۱۹۰۴ء انوارِ اقبال ۵۲

تصوفِ اسلامیہ کی ایک تاریخ لکھی جائے جس سے معاملہ صاف ہو جائے اور غیر اسلامی عناصر کی تقطیع ہو جائے۔ سلاسلِ تصوف کی تاریخی تنقید بھی ضروری ہے اور زمانۂ حال کا علم النفس جو مسالہ تصوف پر حملہ کرنے کے لیے تیار کر رہا ہے۔ اس کا پیشتر سے ہی علاج ہونا ضروری ہے۔ میں نے اس پر کچھ لکھنا شروع کیا ہے مگر میری بساط کچھ نہیں۔ یہ کام اصل میں کسی اور کے بس کا ہے۔ میں صرف اس قدر کام کر سکوں گا کہ جدید مذاق کے مطابق تنقید کی راہ دکھلا دوں۔ زیادہ تحقیق و تدقیق مجھ سے زیادہ واقف کار لوگوں کا کام ہے۔[1]

علم النفس اور تصوف کے تعلق پر علامہ نے ایک اور جگہ یوں کہا تھا کہ "تصوف اسلام کی نفسیات ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں علم النفس پر جو جدید تحقیقات ہوئی ہیں اور جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کو اسلام میں تاریخ تصوف کے حوالے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ علامہ نے اس بارے میں جو اشارہ کیا ہے، بدقسمتی سے اب تک اس سلسلے میں وقیع کام نہیں ہوا۔ علامہ نے آج سے ۶۰ برس قبل جس اہم سمت میں اشارہ کیا تھا وہ ہنوز تشنۂ تعبیر ہے علامہ کی کسر نفسی بھی ملاحظہ کیجیے کہ "زیادہ تحقیق و تدقیق مجھ سے زیادہ واقف کار لوگوں کا کام ہے"

علامہ کی ذاتی زندگی میں تعلق با اللہ کا چراغ جگمگاتا نظر آتا ہے۔ آپ کی دردیشی اور دولت سے استغناء اس دور میں انتہائی حیرت ناک بات تھی۔ آپ اپنے ملنے والوں سے بھی اسی بات کا تذکرہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ اور اعتماد اور تمام مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرنا انتہائی اہم ہے۔ لفظ اللہ، آپ کے وردِ زبان رہتا۔ ذکر اللہ کی یہ نعمت تھی جس نے اقبال کو یورپ میں بھی آداب سحر خیزی سکھائے اور وہ بھی اس وقت جب اقبال کی عمر تیس برس سے کم تھی۔ اقبال کی پوری زندگی میں ہمیں تعلق با اللہ اور ذکرِ الٰہی کی نعمتوں کا فیضان نظر آتا ہے۔ (ص ۲۶۷)

"بہر حال اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ وہ مسلمان کی آخری امید ہے۔ سیٹھ صاحب اور بڑے شیخ صاحب سے کہیے کہ درود شریف پڑھنے سے غفلت نہ کریں۔ اس زمانے

---

[1] (بنام مولانا شاہ سلیمان پھلواروی صاحب ۹/ مارچ ۱۹۱۶ء، انوارِ اقبال ۱۸۱ - ۱۸۲)

کے مسلمانوں کے لیے یہ بات خاص کر حلال مشکلات ہے۔"[1]

"آپ کے مصائب[2] کا حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔ مولوی عبداللہ[3] غزنوی آج حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کی خبر موصول ہوئی۔ ایک منٹ تامل کیا۔ پھر طلباء کو مخاطب کر کے کہا

"ما برضائے او راضی ہستیم بیائید کہ کار خود بکنیم"[4]

یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے۔ مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔"[5]

دعا کے بارے میں آپ نے نذیر نیازی صاحب سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا۔

"وہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ ہم سے اور ہماری دنیا سے بے تعلق تو نہیں۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اسی سے کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے مجھی سے دعا کرو۔ میں تمہاری دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہوں۔ زندگی کیا ہے ایک مسلسل دعا۔"[6]

علامہ بزرگانِ دین کی کرامات اور تصرفات کے قائل تھے۔ اس دور میں جب کہ مغرب سے درآمد شدہ انیسویں صدی کی عقلیت پرستی کا غلبہ تھا ایسے خیالات لوگوں کی طبیعت پر بار ہوتے ہوں گے لیکن علامہ کو اس بات کی کب پرواہ تھی کہ ان کی باتوں کا مغرب پسند افراد برا منائیں گے۔ آپ نے تاریخِ اسلام کا جو مطالعہ کیا تھا اس سے آپ کی نظروں

---

[1] بنام منشی سراج الدین، ۱۱ جولائی ۱۹۲۱ء، انوار اقبال ۱۶۰

[2] یہ خط علامہ نے محمد دین فوق کے لڑکے کی وفات پر تعزیت کے لیے لکھا تھا۔

[3] مولوی عبداللہ غزنوی، غزنوی خاندان کے اولین فرد ہیں جو افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آکر آباد ہوئے۔ مولانا غزنوی توحید و سنت کے علمبردار تھے بڑے فاضل اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔

[4] ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ اب آئیں کام کریں۔

[5] بنام محمد دین فوق ۱۹ دسمبر ۲۲ء، انوار اقبال ۷۱ - ۷۲

[6] (اقبال کے حضور میں ص ۳۶۱)

سے یہ بات کیسے مخفی رہ سکتی تھی کہ انہی اولیائے عظام کی برکتوں سے برصغیر میں اسلام کی مشعل روشن ہوئی۔ ان اہل دل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں۔

سید نذیر نیازی علامہ کے آخری دنوں میں ان کے پاس باقاعدہ حاضر رہتے تھے آپ علامہ کے الفاظ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فرمایا: "انسان کے لیے تعلق باللہ ضروری ہے۔ اسلام نے تعلق باللہ کا رشتہ ایک طرف علم اور دوسری جانب عمل سے جوڑا اور ہدایت کی کہ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ذکر الٰہی ہوتا ہے۔ اس میں جگہ کی قید ہے نہ وقت کی۔ اس نے باقاعدہ عبادت کو بھی ہر پہلو سے واضح اور متعین کر دیا۔"[1]

حضرت علامہ کو زیادہ تر تکلیف شانے کے درد کی ہے۔ ضیق سے بھی پریشان ہیں سیدھا لیٹنا ممکن نہیں بار بار کروٹ بدلتے ۔۔۔۔ یوں ذرا سکون ہوتا تو بے اختیار فرماتے "یا اللہ"! یوں بھی یا اللہ ہمیشہ ان کے وردِ زبان رہتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے گفتگو کرتے ہوئے۔[2]

اللہ کی ذات پر توکل مسلمان کا سرمایۂ حیات ہے۔ علامہ منشی سراج الدین صاحب کے نام خط لکھتے ہوئے جو علامہ کے جگری دوستوں میں سے تھے، فرماتے ہیں۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں (اقبال)

"شمال مغربی سرحدی صوبے کو مستثنیٰ کرتے ہوئے، حدود ہندوستان کے اندر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر وہ حصہ ہے جو مذہبی اور کلچرل حیثیت سے خالصتہً اسلامی ہے اور ایسا کہ اسلام نے وہاں خدانخواستہ جبر و اکراہ سے گھر پیدا نہیں کیا، بلکہ یہ بار آور پودا حضرت شاہ ہمدانی جیسے

---

[1] (اقبال کے حضور میں ۷۳)

[2] الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض۔ (آل عمران - ۱۹۱)

(اقبال کے حضور میں ص ۲۴۳) یکم مارچ ۳۸

نیک وکامل بزرگانِ دین کے پاک ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے[1]۔ اور ان ہی کے مساعی تبلیغ دین کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے گھر بار اور وطن محض اس لیے ترک کیے کہ رسول اللہ کے لائے ہوئے پیغام سے ان دیار و ممالک کے بسنے والوں کو بہرہ ور کریں اور الحمد للہ کہ وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے"

تصوف کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات کو جاننے کے لیے دو اہم تحریروں کو آخر میں شامل کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک وہ انٹرویو ہے جو رسالہ "طریقت"، لاہور میں ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا۔ منشی محمد دین فوق صاحب نے جو علامہ کے قریبی دوستوں میں سے تھے، آپ کے کہنے پر یہ رسالہ نکالا تھا۔ یہ جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ اس انٹرویو سے تصوف

---

[1] حضرت سید میر علی ہمدانی (وفات ۷۸۶ھ) جنہیں شاہ ہمدان، امیر کبیر، علی ثانی اور حواری کشمیر کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے ۷۷۴ھ میں وادی کشمیر میں وارد ہوئے۔ آپ بارہ برس تک (۷۸۶ھ) تک تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہے۔ پانچ سال جموں و کشمیر میں اور پانچ سال بلتستان، نگر، گلگت، لداخ، شگر اور تبت میں مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ وادی کے سب سے بڑے مبلغ آپ ہی تھے۔ وادیٔ کشمیر میں ۳۷ ہزار سے زائد افراد نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ بلتستان اور گلگت وغیرہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے حق کی آواز پہنچائی۔ ان علاقوں میں آپ کی بنائی ہوئی خانقاہیں اور مساجد اب تک موجود ہیں۔ شاہ ہمدان چھ سات سو صوفیاء اور سادات کے ساتھ وادی میں تشریف لائے تھے اور آپ نے یہاں اسلامی طرزِ زندگی کو رواج دینے اور اصلاح رسوم کے سلسلہ میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ آپ کی مشہور کتاب نصیحۃ الملوک ہے۔ جسے مولانا صدرالدین الرفاعی نے ایڈٹ کیا ہے۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ راقم الحروف کو راولپنڈی میں اس مخطوط کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہ جہاں علم سیاسیات اور انتظامیات سے متعلق ایک جامع چیز ہے وہاں ادبی اعتبار سے انتہائی سہل اور خوبصورت فارسی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے اسے نہ صرف اصل مخطوطے کی صورت میں چھپنا چاہیے بلکہ اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر ریاض نے شاہ ہمدان سے متعلق کافی تحقیقی مواد جمع کیا ہے۔)

کے بارے میں علامہ کے نظریات کو سمجھنے میں خاص طور پر مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ 'نیوایرا' لکھنو میں علامہ کی ایک مطبوعہ تحریر کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ اس میں تصوف اور عجم کے بارے میں علامہ نے نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ امید ہے کہ اقبالیات کے طلبا ان تحریروں سے علامہ کا مفہوم سمجھنے میں مدد پائیں گے۔

فوق : صوفیوں سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا ؟

اقبال : اصل تصوف خصوصاً ہندوستان کے صوفیائے عظام نے اسلام کو وہ رونق بخشی اور بجائے تیر و تلوار کے محض حسنِ عمل اور اخلاقِ محمدی کے ذریعے اس کی وہ اشاعت کی کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں چھ کروڑ یقیناً ان ہی بزرگوں کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں

فوق : صوفیوں سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا ؟

اقبال : مسلمانوں کی اخلاقی زندگی پر صوفیائے کرام نے بہت بڑا اثر ڈالا۔ تمام ایسے اوصاف جو اخلاقی پہلو سے انسانیت کا خاصہ ہیں محض ان ہی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو انسان اور پھر مسلمانوں کو مسلمان بنایا۔

فوق : مسلم پالٹیکس کو ان سے کیا فائدہ ہوا ؟

اقبال : صوفیوں کا گروہ پولیٹیکل معاملات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہے۔ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس، اصلاح باطن اور نفس کشی ہے اس لیے اس نے ملکی الجھنوں میں بہت کم بلکہ بالکل دخل نہیں دیا۔ البتہ بعض بعض سلاطین کو جو اپنے شاہانہ فرائض سے غافل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد کا باعث ہوتے رہے ہیں تادیبی ہدایات فرماتے رہے ہیں۔ جیسا کہ تاریخوں کے مطالعہ اور صوفیائے کرام کے حالات سے اکثر ظاہر ہوتا ہے۔

فوق : اسلامی تصوف دنیا داری کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے ؟

اقبال : اسلامی تصوف کی یہی تعلیم ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا بھی رکھے۔ اسلام رہبانیت کے خلاف ہے اور گھر بار اہل و عیال کو ترک کر کے جنگلوں اور بیابانوں میں زندگی بسر کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلامی تصوف ایسے یوگ کو جو صرف اپنی ذات کے لیے ہو ایک بے فیض اور خشک چشمے سے تشبیہ دیتا ہے۔ بیشک یکسوئی حاصل کرنے

کے لیے خلوت و عزلت نشینی کی ضرورت ہے لیکن تمام لوگ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ دراصل ترکِ دنیا ایک برا نمونہ ہے اہل دنیا کے کاروبار کے لیے بلکہ یہ صریح خلاف ورزی ہے الٰہی قانون کی جو انسانی نسل کے بڑھتے رہنے اور اس کے پھولنے پھلنے کا متمنی ہے۔

فوق: عرس کی رسم کب سے جاری ہے؟

اقبال: عرب اور دیگر ممالک اسلامیہ کی تو خبر نہیں لیکن ہندوستان کے عرسوں کے متعلق یہ قیاس کیا جاتا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں چونکہ جاترا کی رسم عرصہ دراز سے چلی آتی ہے اور وہ دور دراز ممالک سے بعض خاص تیرتھوں پر جاترا کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس لیے جب وہ رفتہ رفتہ مشرف بہ اسلام ہونے لگے تو ان کو اسلام سے مانوس کرنے کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے گئے جو ان کے مذہبی و قومی شعائر سے کسی قدر مشابہ تھے۔ یہ میرا قیاس ہے یقینی نہیں۔

فوق: عرس کا مقصد کیا ہے؟

اقبال: عرس کا مقصد تو دراصل یہ ہے کہ جس بزرگ کا عرس ہو اس کے سبق آموز حالات بیان کیے جائیں۔ لوگوں کو اس کے اچھے عمل کی تقلید و پیروی کی ترغیب دی جائے لیکن افسوس ہے کہ موجودہ عرسوں کا بیشتر حصہ اپنے اصلی مقصد سے دور ہٹ چکا ہے اور محض بے خیر ہے۔

فوق: صوفی لوگ موجودہ زمانے کی جد وجہد میں ہمارے لیے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں؟

اقبال: اہل تصوف خصوصاً ان بزرگوں کا جو صاحب اثر ہیں اور اپنے عقیدت مندوں کا بہت بڑا حلقہ رکھتے ہیں یہ نہایت ضروری فرض ہے کہ وہ اپنے معتقدوں اور ارادت مندوں کو اپنے اثر میں رکھیں۔ اور ان کی زندگی کو مذہبی اور اخلاقی پہلو سے ایک کامیاب زندگی بنا دیں۔ سوشل ترقی کے لیے جد وجہد کرنا بھی ایک قسم کی بیداری ہے اور یہ بیداری جب کبھی ہو گی حضرات صوفیہ کے پاک نفوس ہی سے ہو گی

فوق: اولیاء کی کرامتوں کے متعلق کیا خیال ہے؟

اقبال: میں کرامتوں کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس جن کو اللہ تعالےٰ

نے خاص دل اور خاص دماغ عطا کیا ہے اور جو تزکیۂ نفس میں صاحبِ کمال ہیں تیر از کماں رفتہ اور آب از جو رفتہ واپس لا سکتے ہیں۔

اولیاء راہست قدرت از الٰہ
تیرِ جستہ باز گرداند ز راہ

فوق: قبروں پر جانا چاہیے یا نہیں؟

اقبال: اگر مراد اس سے قبر پرستی ہے یعنی صاحبان قبور سے حاجات طلب کی جائیں جس طرح خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کی جاتی ہیں تو میں اس کے سخت خلاف ہوں بلکہ اس کو سخت گناہ سمجھتا ہوں اور اگر قبروں پر جانے سے مطلب فاتحہ پڑھنا، عبرت حاصل کرنا اور موت کو یاد کرنا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں بلکہ ایسا حضور ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی قائل ہوں کہ قبرستانوں پر خصوصاً کسی صاحبِ دل کے مزار پر جانے سے صفائی باطن بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

فوق: پیر کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اقبال: پیر یا مرشد کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کوئی صحیح اور کامل راستہ نہیں دیکھ سکتا۔ روحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف انہیں لوگوں کو ہوگا جو اہل دل ہیں۔ جن کے دل میں درد ہے۔ جن کے قلب میں گرمی اور جن کی روح میں تڑپ ہے لیکن کم سے کم اخلاقی فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے۔ پیر کی صحبت سے البشرطیکہ پیر دکانداری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے اور جس کا اخلاق درست ہے۔ جس کے افعال ٹھیک ہیں اور جس کے اعمال "اعمالِ حسنہ" کہے جاتے ہیں اس سے بڑھ کر اور کون بہترین انسان ہو سکتا ہے

فوق: ازمنۂ وسطیٰ کے سے اب پیر کیوں نہیں ہوتے؟

اقبال: اس کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی ان اوصاف سے معریٰ ہے جن سے ایسے نیک وجود پیدا ہو سکتے ہیں یورپ اور امریکہ میں بڑے بڑے عالم فلاسفر اور موجد پیدا ہوتے ہیں بلکہ دنیا کی کاروباری زندگی میں مشینوں، انجنوں اور نت نئی ایجادوں کے ذریعہ جس قدر انقلاب ان لوگوں نے پیدا کیا ہے اس نے تمام دنیا اور بالخصوص اہلِ ہند کو عالمِ حیرت

میں ڈال دیا ہے۔ مگر اس پر کبھی غور بھی کیا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے عالموں، فلاسفروں اور موجدوں کی طرح اور ممالک میں ایسے لوگ کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ اس کا جواب سوائے سوسائٹی کے تاثرات کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں علم و ہنر کا چرچا نہیں جہاں دماغوں سے سوچنے اور غور کرنے کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں ایک فلاسفر ایک عالم اور ایک موجد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

لیکن بعض مستثنیات بھی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانے کے لیے بعض دفعہ ایسے امور کا اظہار بھی کر دیتا ہے کہ سوسائٹی کا اثر بالائے طاق رہ جاتا ہے اور انسان کو اپنی عاجزی اور بندگی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً گوتم بدھ کا ایک بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا اور پھر فقیری اختیار کر لینا۔ سوسائٹی کے اثر پر اگر غور کیا جائے تو گوتم بدھ کے گرد و پیش جس قسم کی سوسائٹی تھی وہ دکھ، بیماری۔ فقر و فاقہ اور دردِ دل سے بالکل لاعلم اور عیش و عشرت اور تفریح و مسرت میں مست و محو رہا کرتی تھی۔ ایک بادشاہ کا بیٹا دکھ محسوس کرتا ہے۔ ایک عالم کی تکلیفوں کو اپنی ذاتی تکلیف سمجھتا ہے اور اسی قلق سے مضطرب ہو کر سلطنت ترک کر دیتا ہے۔

عرب جیسے جاہل اور اجڈ ملک میں جہاں دنگہ فساد، خوں خرابہ، لڑکیوں کا قتل اور دنیا جہان کے دیگر عیوب ایک معمولی بلکہ تفریح کی بات سمجھے جاتے تھے۔ وہاں ایک شخص درگاہِ رب العزت سے اس قسم کا غیر معمولی دل و دماغ لے کر آتا ہے جو ایک عالم میں نہ مٹنے والا انقلاب اور دلوں سے نہ محو ہونے والی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ میری مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص کا ایک روشن نمونہ تھے۔ ان کے گرد و پیش اور نواحیات میں جس قسم کے حالات تھے ان کا خاکہ مولانا حالی نے اپنی ایک نظم میں اتارا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اہل عرب بات بات پر لڑتے تھے اور لڑائی کا سلسلہ صدیوں تک جاری رکھتے تھے۔ ایک خدا کی جگہ کئی کئی خدا اور اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے بت پوجتے تھے۔ شخصیت پرستی کا دور دورہ تھا۔ شراب اور فواحشات کی گرم بازاری تھی۔ انصاف اور

قانون کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان حالات کی موجودگی میں ایسے رحمت للعالمین کے وجودِ ذی جود کی کس طرح توقع ہو سکتی ہے جس نے عرب، جاہل عرب ۔ کو وہ قابلِ فخر خطّہ بنا دیا کہ آج تمام دنیا کے مسلمان سرزمین عرب کو دنیا کا بہترین و افضل ترین ٹکڑا تصور کرتے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر جان فدا کرنے کو تیار ہیں۔

درحقیقت یہ ایک الٰہی قانون ہے کہ بڑے بڑے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں ان کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہوتی۔[1]

آج کا مسلمان یونان اور عجم کے تصورات پر مبنی تصوف کے دھندلکوں میں بے مقصد آوارہ خرامی کرنا چاہتا ہے۔ یہ تصوف حقیقتِ ازلی سے منہ موڑ کر ہماری نگاہوں کو نیلی سرخ زدہ 'روشنیوں' کی طرف پھیر دینا چاہتا ہے۔ یہ حقیقتِ ازلی نہیں بلکہ تھکے ہوئے دماغ کے خلیوں کی پیداوار ہے۔ میرے نزدیک یہ تصوف جو ہمیں حقیقت کو ان مقامات پر تلاش کرنے کے لیے کہتا ہے جہاں سرے سے اس کا گذر ہی نہیں عالمِ اسلام کے زوال کے اسباب کی نشاندہی کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ زمانہ قدیم کی ذہنی سرگذشت کے مطالعہ سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ ہر دور میں زوال پذیر افراد نے نفیِ ذات اور متصوفانہ نقطہ نظر کو اختیار کر کے پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اس دنیا کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے زوال کے ان علمبرداروں نے خود ساختہ ازل کی تلاش کو مقصد بنایا۔ انہوں نے اپنے معاشرے کی روحانی تہی دامانی اور جسمانی تنزل کو بظاہر دلفریب مقصد حاصل کرنے کے پردے میں اپنی انتہا تک پہنچا دیا۔ اور اس طرح صحت مند اور طاقتور عناصر کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسلام کے مخصوص اصولوں پر مبنی معاشرے کو ان جذباتی رجعت پسندوں کے ہاتھوں بے حد نقصان پہنچا ہے۔ ہم نے ایک معاشرے کی حیثیت سے نسل اور زبان کو اصول نہیں قرار دیا اس کے برعکس ہم نے قوانین کے الٰہی مجموعے پر معاشرے کی بنیاد کو استوار کیا۔ تاہم قدیم صوفی نے اس بنیاد یعنی شریعت کو محض ظاہری اور حقیقت کا بھوسہ قرار دے دیا۔ ان نظریات کو بھی خفیہ طور پر پھیلایا گیا کہ ظاہر کی پابندی ایسی ضروری نہیں

---

[1] (رسالہ 'طریقت'، لاہور، اگست ۱۹۱۴ء مندرجہ اقبال ریویو کراچی جنوری ۱۹۷۱ء ص ۱۴-۱۸)

بعض اوقات معاشرے کی پابندیوں کی وجہ سے کھل کر اس بات کا اظہار نہیں کیا گیا لیکن مسلمانوں کے افکار و ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عجم کے دل و دماغ میں پرورش پانے والے تصوف کی وجہ سے قانون شریعت کو نظر انداز کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے یہ شریعت ہی ہے جس نے معاشرے کو ایک نظم و ضبط میں پُر رکھا ہے اور جس کے بغیر پورا معاشرہ فساد کی نذر ہو جاتا ہے۔ اسلام نے جو مخصوص جمہوری مزاج پیدا کیا تھا اس کی جگہ روحانی قوت رکھنے والے کچھ افراد کی برتری نے لے لی۔ یہ کہا گیا کہ عام مسلمان ان حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ جو صرف چند لوگوں ہی کا حصہ ہیں۔ شیخ احمد الرفاعیؒ نے جو ایک مشہور صوفی بزرگ ہیں، عبدالسمیع ہاشمی کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا تھا۔

"وہ جبر دار اہل عجم کی زیادتیوں سے دھوکا نہ کھانا کہ ان میں سے بعض حد سے گذر گئے ہیں"

ایک اور جگہ یہی بزرگ شیخ عجمی تصوف پر گہری ضرب لگاتے ہیں (ظاہر اور باطن کے فرق اور حقیقت و مجاز کے الگ ہونے پر، جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے) اور صاف اعلان کرتے ہیں۔

"شیخ وہ ہے جس کا ظاہر و باطن مشرع ہو طریقت عین شریعت ہے۔ جھوٹا اس فرقے کو نجاست سے آلودہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ باطن اور ہے اور ظاہر اور ہے"[1]

سپین کے مسلمان جو مغربی اور وسط ایشیا کے تصورات اور ان کے جانکاہ اثرات سے محفوظ تھے اسلام کی اصل روح سے ایشیا کی ان مسلم نسلوں کی نسبت کہیں زیادہ قریب تھے جنہوں نے اسلام کی عربی روح کو عجم کے محلول سے گذرنے دیا اور اس طرح اسلام کو اس کی حقیقت سے کہیں دور کر دیا۔ ایران کی فتح درحقیقت عجم کا اسلام قبول کرنا نہ تھا بلکہ خود اسلام کو عجمی روح کے مطابق ڈھالنا تھا۔ دسویں صدی کے بعد کے ادوار میں مغربی ایشیا کے مسلمانوں کی ذہنی تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو میرے تحریر کردہ ہر لفظ کی تصدیق ہو سکے گی۔ تنزل کا جادو اس قدر دلفریب ہوتا ہے کہ ہم زہر کا پیالہ پینے کے ساتھ ساتھ زہر

---

[1] (رسالہ الحکم الرفاعیہ ترجمہ مولانا شرر)

پلانے والے ہاتھوں کو چومتے بھی ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اسلام تاریخ کے اجالے میں پیدا ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کے صدقے جمہوری روایات پیدا ہوئیں ایسے ذہین صحابہؓ کے درمیان زندگی بسر کی جنہوں نے ان کے مقدس ہونٹوں سے نکلی ہوئی ایک ایک بات آنے والی نسلوں تک پہنچائی۔ آپؐ کی تعلیمات میں رہبانیت کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ قرآنِ پاک کا ہر لفظ زندگی کی مسرتوں اور روشنیوں کا مظہر ہے یہ زندگی کے اس مایوس کن راہبانہ تصور کے خلاف ایک بھرپور حملے کی حیثیت رکھتا ہے جس نے صدیوں سے انسان کو نامیدی و یاس میں مبتلا رکھا ہے۔ اس دنیا کے حقائق کا ہنستے کھیلتے مردانہ وار مقابلہ کرنا اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کے نفاذ اور سربلندی کے لیے کام کرنا ہی اصل بات ہے ان لوگوں کی بات پر قطعاً دھیان نہ دیجیے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں ایک خفیہ نظام ہے جس کے بھید ہر کس و ناکس پر کھولے نہیں جا سکتے۔ یہی بات ایک طرف اس دھوکے باز شخص کو تقویت دیتی ہے تو دوسری طرف آپ کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے اس میں عہدِ روما کی عیسائیت کی روح کارفرما ہے جو اپنی تاریکیوں کے تحفظ کے لیے ایک ایسا قلعہ بناتی ہے جس میں تاریخ دان جھانک نہ پائیں۔ ایسا شخص جو "خفیہ نظام" یا "چھپی ہوئی شریعت" کا ڈھونگ رچاتا ہے آپ کی اسلامی تاریخ سے لاعلمی کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس متوقع خطرے کے پیشِ نظر کہ کہیں ایسا نہ ہو کر آپ کے ذہن کے افق پر پھیلائی ہوئی مکر و فریب کی اس دھند پر تاریخِ اسلام کی شعاعیں پڑ کر اس کا پردہ چاک کر دیں وہ حواس کے ذریعے علم کو "بہت بڑا پردہ" قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "العلم الحجاب الاکبر" کہ علم بہت بڑا پردہ ہے۔ اس طرح حقیقت کا یہ دشمن حقائق کو سمجھنے والے ادراک یعنی علم ہی کی نفی کر ڈالتا ہے اور تاریخ کے علم کی بنیادوں ہی کو متزلزل کر دیتا ہے کیونکہ اسے اسی میں اپنی نجات نظر آتی ہے۔

میں مسلمان نوجوانوں سے کہوں گا کہ وہ اس راہبانہ تصور سے خبردار رہیں۔ یہ پھندہ بہت عرصہ آپ کی گردنوں میں پڑا رہا ہے۔ دنیائے اسلام کے احیاء کا دارومدار صرف اس بات

پر ہے کہ وہ اس توحید کی مشعل کو ہاتھ سے نہ جانے دیں جس مین کسی قسم کے سمجھوتے کی گنجائش نہیں جو اخلاق کے بلند ترین مقام پر لے جاتی ہے اور جو قوت کی مظہر ہے۔ یہ وہی توحید ہے جسے آج سے تیرہ سو برس قبل عربوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ آیئں ہم سب عجم کے دھندلکوں سے باہر نکلیں اور عرب کے صحراؤں کی چمکتی دھوپ میں چلتے پھرتے نظر آیئں۔ [1]

---

[1] (اسلام اور تصوف مطبوعہ نیو ایرا لکھنو ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء)

شخصیات

شبلی نعمانیؒ ۱-

آپ ۱۸۵۷ء کے پر آشوب سال میں اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ آپ ۱۸۷۶ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ قانون کی پریکٹس کرتے رہے لیکن اس کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد آپ نے ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ جہاں وہ ۱۸۹۸ء تک رہے۔ ۱۸۹۲ء میں آپ نے ترکی شام اور مصر کا سفر کیا۔ آپ نے ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی باگ دوڑ سنبھالی۔ اس کے ساتھ ہی اعظم گڑھ میں دار المصنفین قائم کیا اور مشہور علمی و ادبی رسالہ معارف جاری کیا۔ آپ کی تصانیف میں سیرۃ النبی (جس کی تکمیل آپ کے شاگرد سید سلیمان ندویؒ نے کی)، الفاروق، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی، الکلام علم الکلام، سوانح مولانا روم، شعر العجم وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

سید سلیمان ندویؒ ۱-

آپ ضلع پٹنہ کے موضع دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد آپ عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم ندوہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں انہیں مولانا شبلی نعمانی کی صحبت میسر آئی۔ ۱۹۰۶ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ کچھ عرصہ 'ندوہ' کے ایڈیٹر رہے اور دار العلوم میں تعلیم بھی دیتے رہے۔ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان سے جو خلافت کا وفد انگلستان گیا آپ اس میں شریک تھے۔ آپ نے موتمر اسلامی حجاز میں بھی شرکت کی۔ آپ حکومت افغانستان کی دعوت پر ایک سہ رکنی وفد میں شامل ہوئے جس کے دوسرے ارکان علامہ اقبال اور سر راس مسعود تھے اس وفد کو افغانستان میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورے

کے لیے بلایا گیا تھا۔ آپ نے اپنے استاد شبلی نعمانی کی غیر مکمل تصنیف سیرۃ النبی کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے علاوہ خطبات مدارس، عرب و ہند کے تعلقات، خیام، برید، فرنگ ارض القرآن، سیرۃ عائشہ آپ کی بلند پایہ تصنیفات میں سے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ نے آپ کی علمی خدمات کی بنیاد پر ان کو ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ آپ ۱۹۵۰ء میں کراچی آ گئے اور یہاں ۲۲، نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں وفات پائی۔

محقق طوسی :- نصیر الدین ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی، مشہور ہیئت دان، تذکرہ نویس اور منگول حملوں کے دور کا مشہور شیعہ سیاستدان تھا۔ وہ ۱۲۰۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔ جب منگولوں نے بغداد پر حملہ کیا تو یہ مشیر کے طور پر ہمراہ تھا۔ اس کی مشہور کتاب اخلاقِ ناصری ہے۔ اس کی تحقیقات کا دائرہ خاصا پھیلا ہوا ہے۔ طب، طبیعات، حساب، ہیئت اور نجوم جیسے مختلف علوم و فنون پر اس کی کتب پائی جاتی ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ :- آپ ۱۸۸۵ء میں یو پی کے شہر بجنور میں پیدا ہوئے۔ دیو بند میں فقہ، حدیث، فلسفہ، منطق اور ادب کی تعلیم حاصل کی۔ آپ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے خالص شاگردوں میں سے تھے۔ دیو بند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے دہلی کی مسجد فتح پوری میں کچھ عرصہ درس دیا۔ بعد میں آپ دیو بند میں استاد مقرر ہو گئے۔ اگرچہ دیو بند کانگریس کا گڑھ تھا۔ لیکن آپ مسلم لیگ کے حامی تھے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں آپ نے مسلم لیگ حمایت کی اور علماء کو منظم کرنے اور انہیں مسلم لیگ کی حمایت پر آمادہ کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں بھی آپ کی بے شمار خدمات ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ مجلس دستور ساز کے رکن منتخب ہو گئے۔ آپ نے مستقل طور پر کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ نے اسلامی دستور بنوانے کی کوششوں میں حصہ لیا۔ آپ کا انتقال کراچی میں ۱۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہوا۔ آپ کی بلند پایہ تصنیفات میں صحیح مسلم کی شرح "فتح الملہم" ہے۔ اس کے علاوہ شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن کے حواشی بھی آپ کی یادگاروں میں سے ہیں۔

احمد رضا خان :- آپ ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم دینی و دنیوی کی تکمیل گھر پر اپنے والد مولوی محمد نقی علی خان سے کی۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ درس و تدریس کے علاوہ مختلف علوم و فنون پر کئی کتابیں اور رسائل تصنیف و تالیف کیے۔ جن میں بارہ جلدوں میں فتاوی رضویہ کا مجموعہ بھی ہے۔ قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ علوم ریاضی و جفر میں بھی مہارت حاصل کی۔ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بہت سی نعتیں اور سلام لکھے ہیں۔ جو بے حد مقبول ہیں۔ آپ نے ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ کو وفات پائی۔ بریلوی مکتب فکر آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔

سر سکندر حیات خان :- ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ اور لندن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں فوج میں بھرتی کرانے میں نمایاں خدمت انجام دی۔ برطانوی فوج میں بھی رہے اور افغانستان کے ساتھ جنگ میں شریک تھے۔ پنجاب لیجسلٹو کونسل کے رکن بنے۔ ۱۹۳۰ء میں ریونیو ممبر پنجاب گورنمنٹ بنے۔ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۴ء میں پنجاب کے عارضی گورنر بھی رہے۔ سر فضل حسین کی وفات پر یونینسٹ پارٹی کے لیڈر اور ۱۹۳۷ء میں پنجاب کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

اسلم جیراج پوری :- آپ ضلع اعظم گڑھ کے قصبے جیراج پور میں ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں پیسہ اخبار لاہور میں عربی کے مترجم مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج میں عربی فارسی کے معلم مقرر ہوئے۔ جامعہ ملیہ کی تاسیس پر مولانا محمد علی جوہر کے اصرار پر علی گڑھ سے چلے آئے اور جامعہ ملیہ میں تاریخ اسلام کے مدرس مقرر ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں تاریخ القرآن، حیاتِ حافظ، حیاتِ جامی اور دیگر کئی محققانہ مضامین شامل ہیں۔ آپ کا سب اہم کارنامہ "تاریخ الامت" ہے جو آٹھ جلدوں میں ہے۔

حکیم احمد شجاع :- آپ ۱۸۹۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ سے ایف اے

کا امتحان دیا۔ ۱۹۱۴ء میں میرٹھ سے بی اے کیا اور وہیں انگریزی اور تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد وہاں سے ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ یہاں سے رسالہ "ہزار داستان" نکالا۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں مترجم بنے آزادی سے قبل پنجاب اسمبلی میں ڈپٹی سیکرٹری ہو گئے تھے، بعد میں سیکرٹری بھی رہے۔ اگرچہ آپ کی اصل شہرت ڈرامہ نویسی کے میدان میں ہے۔ آپ نے معاشرتی ڈرامے لکھے جن میں "باپ کا گناہ" اور "آخری فرعون" زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی سوانحی تصنیف خوں بہا ہے۔ آپ کا ایک اہم کارنامہ قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ آپ کو علمی اور تحقیقی سرگرمیوں سے خاصی دلچسپی تھی۔

محمد حسین عرشی :- آپ ۱۸۹۷ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پرائیویٹ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور آ گئے۔ نثر میں آپ کی اہم کتب و رسائل یہ ہیں ملتِ ابراہیم، تحقیقِ قربانی، اقبال کی پیشین گوئیاں مقدمہ زندگانیِ محمدؐ۔ آپ نے فارسی اور اردو میں غزلیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں اور انگریزی اور عربی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کیے ہیں۔

مارٹن لوتھر :- مشہور جرمن عیسائی مصلح (۱۴۸۳ تا ۱۵۴۶ء) نے اپنے کیریئر کا آغاز بحیثیت پادری کیا۔ اسے ۱۵۲۱ء میں کلیسائے روم نے عیسائیت سے خارج کر دیا۔ اس نے بائیبل کا (۲۲ - ۱۵۲۱ء) ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ اس نے پاپائے روم کے خلاف بغاوت کر کے ایک نئے فرقہ "پروٹسٹنٹ" کی بنیاد رکھی۔

جان سٹورٹ مل :- برطانوی معیشت دان اور فلسفی (۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء) افادیت پسند تحریک کا رہنما اور انفرادی آزادی کا علمبردار تھا۔ اس کی مشہور کتاب "آزادی کے بارے میں" جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی سیاسیات کے میدان میں اہم حیثیت رکھتی ہے۔

کانٹ :- ایمینول کانٹ مشہور جرمن فلسفی (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء) فلسفی اور تنقید نگار ہونے کی وجہ سے معروف ہے۔ "عقلِ خالص کا

تنقیدی جائزہ" اس کی مشہور کتاب ہے جس میں اس نے عقل کے محدود ہونے پر اظہارِ رائے کیا ہے۔

سر جیمز جینز :- مشہور انگریز ماہر طبیعات اور ماہر فلکیات تھا۔ اس نے ستاروں کی ماہیت کے بارے میں تحقیقات کی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ سائنس کو عام فہم انداز میں لکھنے کی وجہ سے بھی معروف ہے۔

الحاج مفتی امین الحسینیؒ :- سابق مفتی اعظم فلسطین اپنے مجاہدانہ کارناموں کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے بیت المقدس اور جامع الازہر قاہرہ میں تعلیم حاصل کی۔ پہلی جنگ کے دوران عثمانی فوج میں افسر تھے۔ ۱۹۲۱ء میں مفتیٔ فلسطین مقرر ہوئے ۱۹۲۲ء میں سپریم مسلم کونسل کے تاحیات صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں ورلڈ مسلم کانفرنس منعقدہ بیت المقدس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں عرب کمیٹی برائے فلسطین کے صدر بنے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران آپ یورپ چلے گئے اور انگریزوں کے خلاف نازیوں کی مدد کرتے رہے۔ ورلڈ مسلم کانفرنس منعقدہ کراچی (۱۹۵۱ء) میں شریک ہوئے اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں کراچی آئے تو علمائے اسلام کی کانفرنس کی صدارت کی۔ آپ پاکستان بننے سے پہلے بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں آپ علامہ اقبال کے یہاں بطور مہمان ٹھہرے۔ ۱۹۷۲ء میں اسلامی سربراہ کانفرنس میں تشریف لائے اس سے اگلے سال بیروت میں انتقال فرمایا؛ آپ اتحاد عالم اسلامی کے بڑے سرگرم اور فعال رکن تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر آپ نے اپنی تمام جائیداد بیچ کر پاکستان کے دفاعی فنڈ میں دے دی تھی۔

ظہیر فاریابی :- حکیم ظہیر فاریابی چھٹی صدی ہجری کے فارسی شاعر ہیں۔ آپ ایرانی النسل تھے۔ تمام زندگی ایران میں گذاری۔ حکیم فلسفی اور عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپ کے قصائد بہت مشہور ہیں۔ آپ کے دیوان کے بارے میں ایک شعر بے حد مشہور ہے۔ یہ اس ظہیر کا نہیں ایک دوسرے ظہیر قادیانی

کا ہے ؎ دیوانِ ظہیر فاریابی

در کعبہ بدزد اگر بیالی

مجدد الف ثانیؒ :- آپ کا نام شیخ احمد سرہندی تھا۔ آپ سرہند شریف میں ۹۷۱ ہجری (۱۵۶۳ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کا نام شیخ عبدالواحد فاروقی تھا۔ آپ نے اسلام کے احیاء کے لیے جو عظیم کارنامہ کیا اور جس طرح مسلمانوں کو ہندو تہذیب کے غلبے سے بچایا اس کی وجہ سے آپ کو مجدد الف ثانی کا خطاب دیا گیا ہے۔ آپ کے مکتوبات جو تین جلدوں میں چھپ چکے ہیں انتہائی اہم ہیں۔ علامہ آپ کی لحد مبارک پر تشریف لے گئے۔ آپ نے ان کے بارے میں یہ مشہور شعر بھی کہا ہے

؎ تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

آپ کی وفات صفر ۱۰۳۴ھ کو ہوئی (۲۹ نومبر ۱۶۲۴ء)

عراقیؒ :- آپ کا نام مولانا فخرالدین اور تخلص عراقی تھا۔ آپ فارسی زبان کے صوفی شعراء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے ملتان تک آئے۔ اور خواجہ ذکریا ملتانی کے مرید ہوئے اور انہیں کی صاحبزادی سے عقد کیا آپ کا مجموعہ کلام بھی ہے۔ آپ کا مشہور شعر یہ ہے۔

چو خود کردند رازِ خویشتن فاش

عراقی را چرا بدنام کردند

امام ابوحنیفہؒ :- آپ کا نام نعمان اور کنیت ابوحنیفہ تھی۔ آپ کو امام اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ ۸۰ھ میں کوفہ کے ایک معزز تاجر ثابت کے یہاں پیدا ہوئے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم کے لیے مختلف مقامات کا سفر اختیار کیا۔ جب آپ کے پہلے استاد حماد کا انتقال ہو گیا تو ان کے جانشین مقرر ہوئے یزید بن عمر نے امری سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے کے لیے آپ کو قاضی القضاۃ

چیف جسٹس کا عہدہ سنبھالنے کے لیے کہا مگر آپ نے انکار کر دیا اور سختیوں کے باوجود اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ عباسی برسرِ اقتدار آئے تو منصور نے دوبارہ یہ پیش کش کی اور آپ کے انکار پر آپ کو قید کر دیا۔ اسی قید و بند میں آپ نے وفات پائی۔

مولانا روم رح ۱۔

مولانا جلال الدین رومیؒ ۱۲۰۷ء میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بہاؤالدین اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ سے ان بن ہو گئی۔ اس لیے وطن کو خیرباد کہہ کر مغرب کا رخ کرنا پڑا۔ مولانا روم اس وقت صغیر سن تھے۔ راستے میں نیشاپور کے مقام پر فریدالدین عطارؒ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے رومی کو گود میں لے کر بہت دعائیں دیں۔ حج سے فارغ ہو کر ان کے والد انہیں ترکی کے شہر قونیہ میں لے آئے اور یہیں بس گئے۔ روم میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے آپ مولانا روم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ کی مشہور تصنیف مثنوی ہے جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

یہ دنیا کی مشہور مثنویوں میں شمار ہوتی ہے اس کا ترجمہ نکلسن نے انگریزی میں کیا ہے اور بھی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ نے ۱۲۷۳ء میں وفات پائی اور قونیہ میں دفن ہوئے۔ علامہ اقبال انہیں اپنا پیر و مرشد قرار دیتے تھے اور ان کے لیے مرشدِ روم کا لقب استعمال کرتے تھے

جمال الدین افغانی رح ۲۔

آپ کا نام سیّد محمد بن صفدر، ولادت اسعد آباد کابل ۱۳۵۴ھ (۱۸۳۸ء) اور وفات ۱۸۹۷ء میں استنبول میں ہوئی۔ آپ نے ملت اسلامیہ کی یک جہتی اور آزادی کے لیے نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔ آپ چاہتے تھے کہ تمام اسلامی ممالک ایک مرکز کے تحت متحد ہو جائیں اس مقصد کے لیے آپ نے زبان و قلم سے جہاد کیا۔ ہندوستان، ایران، مصر اور ترکی میں رہے بعد میں فرانس چلے گئے۔ کسی جگہ چین سے بیٹھنا نہ ملا۔ ہر جگہ کی حکومتیں ان کو خطرہ تصور کرتی رہیں آپ نے العروۃ الوثقیٰ نامی اخبار بھی نکالا۔ آخر عمر میں استنبول میں رہے اور وہیں مارچ ۱۸۹۷ء

میں انتقال کیا۔ چالیس پینتالیس برس کے بعد افغانی حکومت نے آپ کی لاش کو نئے تابوت میں بند کر کے کابل میں دفن کیا اور ایک عمدہ مقبرہ تعمیر کروایا۔

آئن سٹائن :- البرٹ آئن سٹائن (۱۸۷۹ء تا ۱۹۵۵ء) مشہور جرمن یہودی سائنس دان تھا۔ جس نے بعد میں امریکی شہریت اختیار کر لی تھی۔ اسے نظریہ اضافیت کی وجہ سے شہرت حاصل ہے۔ اس نے سائنس کے مختلف میدانوں میں اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔

برگسان :- ہنری برگسان (۱۸۵۹ء تا ۱۹۴۱ء) مشہور فرانسیسی فلسفی تھے۔ اس کی وجہ شہرت اس کا نظریہ وقت ہے۔ علامہ اقبال کی اس سے پیرس میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے اسے حضور اکرمؐ کی حدیث لاتسبوا الدھر سنائی۔ کہ زمانے کو برا بھلا مت کہو..... تو وہ اچھل پڑا.....

سپینگلر :- اوسولڈ سپینگلر (۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء) مشہور جرمن فلسفی اور تاریخ دان۔ اس کی دو کتابیں 'زوال مغرب' کے نام سے دو جلدوں میں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئیں اس میں اس نے مغربی تہذیب کے خاتمہ کی پیشین گوئی کی ہے اس نے دور قدیم کی مردہ تہذیبوں کے ساتھ موازنہ کر کے دلائل پیش کیے ہیں۔

دانتے :- الی گیری دانتے (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) اس اطالوی شاعر کا تعلق فلورنس کے ایک مشہور خاندان سے تھا۔ اس کی ڈیوائن کامیڈی جو عالمی ادب کی مشہور نظم ہے، دوزخ، اعراف، اور بہشت کے سفر کی روداد ہے۔ اس نظم میں وہ روح کے سفر کی عکاسی کرتا ہے۔ علامہ کے جاوید نامے کا بسا اوقات غلط طور پر اس سے موازنہ کیا جاتا ہے۔

ارسطو :- یونانی فلسفی (۳۸۴ تا ۳۲۲ ق - م) افلاطون کا شاگرد اور اسکندر اعظم کا استاد تھا۔ افلاطون کے فلسفے کے برعکس اس نے سائنس اور مادی اشیاء کی جانب توجہ دی۔ اس نے اخلاقیات، سیاسیات، شاعری اور مابعد الطبیعات کے موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔

بیکن :- فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء تا ۱۶۲۶ء) برطانوی سیاستدان فلسفی اور مضمون نگار تھا۔ اس نے استقرائی طریق استدلال کے ذریعے مسلم سمجھنے جانے والے اصولوں کو چیلنج کر دیا۔ اس کا یہ طریقہ مسلمانوں کے یہاں عام طور پر رائج تھا اور اس نے بھی سپین کی تصنیفات کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس کے 'مضامین' اس کی اصل وجہ شہرت ہیں۔ اس نے جیمز اوّل کے دور میں بڑی ترقی کی اور لارڈ چانسلر بن گیا لیکن رشوت لینے کی وجہ سے اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ نکال دیا گیا۔

ایم اسلم :- میاں محمد اسلم اردو زبان کے معروف ناول نگار ۱۶ اگست ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میاں نظام الدین لاہور کے رؤسا میں سے تھے۔ آپ نے علامہ کی زیر تربیت کافی وقت گذارا۔ آپ کے خاندان کے علامہ سے گہرے مراسم تھے۔ آپ نے ۸۴ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ فسادات پنجاب ۱۹۴۷ء کے بارے میں آپ کا ناول رقصِ ابلیس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ کی کتابوں میں اصلاحی رنگ ہوتا ہے۔ آپ نے بچوں کے لیے ۷۲ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

محمد اسد :- مشہور صحافی و مصنف Leopold Weiss

کے مصنف۔ صحیح بخاری اور قرآن مجید کے مترجم۔ نسلاً یہودی۔ وطن آسٹریا۔ جنگ عظیم اوّل کے دوران میں بسلسلۂ صحافت شام و فلسطین آئے اور اسلام قبول کیا۔ اور محمد اسد نام رکھا۔ دیر تک جزیرۃ العرب میں مقیم رہے۔ شاہ ابن سعود مرحوم سے خصوصی تعلقات تھے۔ ۱۹۳۲ء میں برصغیر آئے۔ پہلے کشمیر میں رہے پھر تین برس دہلی میں قیام رہا۔ پھر دیرہ دون چلے گئے۔ اسلامک کلچر حیدر آباد کی ادارت سنبھالی۔ پھر لاہور منتقل ہو گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں جرمن نژاد ہونے کی وجہ سے انہیں نظر بند رہنا پڑا۔ جنگ ختم ہونے پر وہ ڈلہوزی چلے گئے۔ پاکستان قائم ہوا۔ تو محکمہ تعمیر اسلامی مغربی پنجاب کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ پھر دفتر خارجہ سے منسلک ہوئے۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ بالآخر یورپ چلے گئے۔ پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی کلچر کا اہتمام ہوا تو پاکستان آئے۔ ان دنوں مراکش میں مقیم ہیں۔

Islam at the crossroads اور The Road to Mecca

عبداللہ یوسف علی :- (علامہ) عبداللہ یوسف علی، اپنی انگریزی تفسیر و ترجمہ قرآن کی وجہ سے معروف ہیں آپ نے انڈین سول سروس کی ملازمت کی۔ اور ریٹائر ہونے کے بعد انگلستان میں سکونت اختیار کی۔ پہلے ۱۹۱۴ء میں اور بعد میں ۱۹۱۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں پرنسپل کی حیثیت سے رہے۔ لندن جا کر علامہ خاموش زندگی بسر کرتے رہے حتی کہ ۸۰ برس کی عمر میں ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ :- اردو ادب کے مشہور نقاد و ادیب اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے نگران۔ آپ اورنٹیل کالج کے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریطس ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی مقاماتِ اقبال" ولی سے اقبال تک اور تنقید میر معروف کتابیں ہیں اس کے علاوہ بھی کئی کتب تصنیف کی ہیں

محمود الحسن شیخ الہند :- ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے وہاں مدرس اور پھر ۱۸۸۸ء میں صدر مدرس متعین ہوئے اور ۳۳ سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۰۹ء میں جمعیت الانصار قائم کی۔ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ معظمہ میں مقیم ہوئے۔ شریف مکہ نے انہیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریز آپ کو اسیر کر کے مالٹا لے گئے۔ آپ چار سال تک مالٹا میں نظر بند رہے۔ ۱۹۲۰ء میں واپس آئے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کا افتتاح کیا۔ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر دہلی میں وفات پائی اور دیوبند میں دفن ہوئے۔ آپ کا عظیم کارنامہ آپ کا ترجمہ قرآن حکیم ہے جس پر شبیر احمد عثمانی" صاحب نے حاشیہ لکھا ہے۔

حکیم محمد حسن قرشی :- آپ ۱۸۹۶ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں طبی تعلیم کا آغاز کیا اور دہلی میں تکمیل کی۔ آپ طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں لاہور آ گئے اور انجمن حمایت اسلام کے طبیہ کالج سے

منسلک ہو گئے۔ بیس برس تک کالج کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۳۶ء میں حکومت ہند کی قائم کردہ طبی تحقیقاتی کمیٹی کے رکن نامزد کیے گئے ۱۹۵۱ء میں حکومت پاکستان نے انہیں طبی رجسٹریشن کمیٹی کا رکن نامزد کیا۔ آپ طب مشرقی پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ علامہ اقبال سے بہت نزدیک رہے اور آخری دنوں میں ان کے معالج رہے۔ علامہ کو آپ پر بے حد اعتماد تھا۔ سید نذیر نیازی صاحب کی کتاب 'اقبال کے حضور میں' میں آپ کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔

مرزا محمد سعید دہلوی :- آپ اردو ادب کے مشہور ادیب ہیں۔ آپ کا مشہور ناول 'خواب ہستی' ہے انگریزی زبان و ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ ایک عرصے تک آل انڈیا ریڈیو میں تازہ مطبوعات پر تنقید و تبصرہ آپ ہی کے ذمے رہا۔ سر عبدالقادر اور علامہ اقبال کے ہم عصروں میں سے ہیں 'مخزن' میں بہ کثرت مضامین لکھتے رہے ہیں۔

محی الدین ابن عربی :- ابو بکر محمد محی الدین ابن عربی ۱۷، رمضان ۵۶۰ھ (۱۱۶۵ء) میں اندلس میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۷۳ء سے ۱۲۰۲ء تک اشبیلیہ میں رہے اور تعلیم حاصل کی۔ پھر بلادِ مشرق کی سیاحت کے لیے روانہ ہوئے اور مصر ہوتے ہوئے حجاز پہنچے۔ مکہ معظمہ میں کافی عرصہ قیام کیا یہاں سے بغداد موصل اور ایشیائے کوچک کی سیر کرتے ہوئے دمشق پہنچے اور بقیہ عمر یہیں گذار دی۔ ۶۳۸ھ بمطابق ۱۲۴۰ء وفات پائی۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۳۰۰ کے لگ بھگ ہے جن میں سے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم زیادہ معروف ہیں۔ ان کا موضوع تصوف ہے۔ تاریخ تصوف میں آپ کا اہم مقام ہے آپ کو شیخ اکبر کے نام سے پکارا جاتا ہے آپ کی فکر کی بنیاد وحدت الوجود کے نظریے پر ہے جسے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے رد کر کے وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی :- پاکستان کے مشہور مصور عبدالرحمن چغتائی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ مصوری، نقاشی، فن تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ کے تجربہ کار ناقد ہیں۔ فن تعمیر ان کا خصوصی دلچسپی کا موضوع ہے۔

اور اس سلسلے میں آپ کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ نے پیرس سے پی ایچ ڈی کی۔ مستقل قیام لاہور میں ہے۔ علامہ اقبال کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ اس زمانے میں آپ کا اکثر تذکرہ ماسٹر عبداللہ چغتائی کے نام سے ملتا ہے۔ بہت عمدہ ذاتی لائبریری ہے۔ گلبرگ میں قیام ہے۔

زمخشری ا۔ جاراللہ زمخشری مشہور مفسر قرآن تھے ان کی تفسیر قرآن حکیم کشاف کے نام سے معروف ہے آپ معتزلہ خیالات کے حامل تھے خوارزم کے علاقے میں ایک گاؤں زمخشر میں ۱۰۷۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۴۴ء میں وفات پائی۔ کئی تصانیف کے مصنف ہیں۔ تاہم وجہِ شہرت تفسیر کشاف ہے۔ ان کا ذکر علامہ نے شعر میں یوں کیا ہے۔

ع ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

حفیظ ہوشیارپوری ا۔ ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ایم اے فلسفہ کیا۔ ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے۔ لاہور ریڈیو سٹیشن کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو بے حد مہارت ہے اور شعر کے میدان میں یہی ان کی وجہ شہرت بھی ہے۔

اکبر شاہ نجیب آبادی ا۔ نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ لاہور کے ہائی سکولوں میں پڑھاتے بھی رہے۔ تعلیم و تدریس سے فارغ وقت تصنیف و تالیف میں بسر کرتے۔ تاریخ اسلام کا وسیع مطالعہ تھا۔ اس موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں آئینہ حقیقت نما خاص طور پر نمایاں ہے لاہور میں فوت ہوئے اور یہیں دفن ہوئے۔

اکبر الہ آبادی ا۔ آپ کا نام اکبر حسین اور تخلص اکبر تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو ضلع الہ آباد کے قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اور کچھ عرصہ تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں نج اور بعد میں

سیشن جج ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے ۱۸۹۸ء میں آپ کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا ستمبر ۱۹۲۱ء میں ۷۵ سال کی عمر میں آپ نے الہ آباد میں انتقال فرمایا۔ علامہ آپ کو مولانا اکبر کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کو اپنا مرشد قرار دیتے ہیں۔ مغربی تہذیب کو سب سے پہلے آپ نے طنز کے تشتر سے چھیڑا۔ اس دور میں جب انگریز کے خلاف بات کرنا جرائر انڈیمان پہنچنے کے مترادف تھا آپ نے نہایت جرأت سے اظہار رائے کیا۔ آپ کے کلام کے چار کلیات چھپ چکے ہیں

ڈاکٹر مختار احمد انصاری :- برصغیر کی تحریک آزادی کے مشہور راہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۸۸۰ء میں ضلع غازی پور (یوپی) کے ایک قصبہ یوسف پور محمد آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے لندن سے اعلیٰ طبی تعلیم حاصل کی اور وہاں کے ایک بڑے ہسپتال میں ہاؤس سرجن بھی رہے۔ ۱۹۱۱ء میں آپ نے انگلستان سے واپس آکر دہلی میں پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۱۳ء میں تحریکِ خلافت کے تحت برصغیر سے ترکی جانے والی طبی وفد کے قائد تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر تحریکِ آزادی کے لیے وقف کی۔

امام غزالیؒ :- ان کا نام محمد زین الدین اور کنیت ابو حامد تھی۔ آپ ۱۰۵۸ء میں طوس کے ایک موضع غزالی میں پیدا ہوئے اور ۱۸/دسمبر ۱۱۱۱ء کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ مشہور عالم، صوفی اور فلسفی تھے۔ کیمیائے سعادت اور احیاء العلوم کے علاوہ تفسیر جواہر القرآن، تحفتہ الفلاسفہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ آپ ۱۰۹۱ء میں نظامیہ بغداد کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ نیشاپور میں بھی رہے۔ آپ نے علم الکلام کو بہت ترقی دی۔ اور اپنے دور کے تمام اعتراضات کا جو اسلام پر کیے جاتے تھے جواب دیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۶۹ بتائی جاتی ہے

بو علی سینا :- (۹۸۰ء تا ۱۰۳۷ء) مشہور طبیب، فلسفی ماہر لسانیات، شاعر اور سائنسدان نام ابو علی الحسین لقب الشیخ الرئیس بخارا کے قریب ایک شخص عبداللہ نامی کے گھر پیدا ہوا جو عقیدہ کے لحاظ سے اسمٰعیلی شیعہ تھا۔ ہمدان کے مقام پر

دفن ہوا۔ اس کی تصنیفات میں کتاب الشفاء، القانون فی الطب اور اشارات بہت شہرت رکھتی ہیں۔ موسیقی پر بھی ایک کتاب لکھی ہے کہا جاتا ہے کہ اس کی کتابوں کی تعداد ۹۹ کے لگ بھگ ہے کہا جاتا ہے کہ ۱۸ سال کی عمر میں شاہی طبیب مقرر ہو گیا تھا۔

امام رازیؒ :- علامہ فخر الدین ابو عبداللہ محمد بن عمر بن الحسین ۵۴۳ھ میں رے میں پیدا ہوئے۔ آپ ۵۸۲ھ میں غزنی اور پنجاب آئے اور بالآخر ہرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سلطان علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ آپ کا سرپرست تھا۔ یہاں انہیں دشمنی کی وجہ سے زہر دے دیا گیا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ آپ کی وفات ۶۰۶ھ میں ہوئی۔ علامہ رازی نے علوم کو فلسفیانہ پیرائے میں پیش کیا۔ وہ امام غزالیؒ کے مخالف تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی جو ان کی شہرت کا بڑا سبب ہے۔

امام ابنِ تیمیہؒ :- آپ کا اصل نام تقی الدین تھا۔ آپ کی ساتویں پشت میں ایک تیمیہ علم و فضل میں صاحبِ کمال تھیں اس لیے ان کے خاندان کا ہر شخص ابن تیمیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اور اپنے دور میں علوم و فنون کے میدان میں انتہائی مصروف ہوا۔ آپ ۱۰ ربیع الاوّل ۶۶۱ھ کو حران میں پیدا ہوئے اور بیس سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد علمائے کبار میں شمار ہونے لگے۔ آپ نے تاتاریوں کے خلاف جہاد میں بھی حصہ لیا اور انہیں پسپا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ آپ نے باطل عقائد کے خلاف بھی زبان و قلم سے جہاد کیا۔ ۷۰۵ھ میں خلیفۂ مصر کے حکم سے آپ کو قید کر دیا گیا۔ یہاں بھی آپ تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ۷۰۷ھ میں رہا ہوئے لیکن ۷۲۶ھ میں دوبارہ گرفتار کر کے مصر کے قلعے میں محبوس کر دیئے گئے۔ اس بار انہیں ظلم دوات بھی محروم کر دیا گیا۔ اسی قید میں آپ ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ کو اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ آپ کے جنازے میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد تھے۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد سات سو سے زائد ہے۔ آپ نے عالم اسلام میں علمی بیداری کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ اور سنت کے احیاء کا فریضہ انجام دیا۔ آپ نے اسلامی فکر پر بے حد گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

ابن رشد :- ارسطو کے فلسفے کا شارح ابن رشد قرطبہ میں ۱۱۲۶ء میں پیدا ہوا۔ تعلیم بھی وہیں حاصل کی اور بالآخر قرطبہ کے قاضی مقرر ہوا۔ ۱۱۶۹ء میں اشبیلیہ کے قاضی اور ۱۱۸۹ء میں ابن طفیل کی جگہ امیر یوسف کے شاہی طبیب اول مقرر ہوا۔ فلسفہ اور طب کے میدان میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۱۹۹ء میں اپنے دور کے اس فلسفی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مغرب کے فلاسفہ پر اس کے گہرے اثرات ہیں اور ابن رشد مغرب میں ' Averroes ' کے نام سے معروف ہے وہ اپنے نظریات کے اعتبار سے اکاد کی طرف میلان رکھتا تھا۔ اس کی اصل وجہ شہرت فلسفہ طب اور نجوم کے میدان میں تصنیفات بالخصوص ارسطو کے فلسفے کی تشریح ہے۔

تمہید :- اسلام اور تمدن اسلامی اس وقت دنیا کے ہر نزدیک و بعید خطے میں ایک عظیم انقلابی کیفیت سے دوچار ہے ترکی کا اجتہادی اقدام۔ ایران کا دور جدید۔ مصر کا جوش اصلاح افغانستان کا مغربی قوغل ، غرض عالم اسلام کے جس نقطہ مدفیت پر نظر ڈالیے۔ جہات کا ایک ہنگامہ زار برپا ہے۔

ممالک اسلامیہ کے یہ تمام ترتغیرات خفی اور ملی، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جہاں ایک نوید زندگی کی شادابیوں سے لبریز ہیں وہاں درحقیقت ایک پیام بیداری کی حیثیت بھی رکھتے ہیں یہ پیغام بیداری کیا ہے۔ خالص علمی نقطہ نظر سے اس کا اور اس کے معنوی اثرات کا تجزیہ کیجیے۔ تو بھی ہماری نگاہوں کو اکثر اہم نتائج سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے۔ جن میں سے ایک (کم سے کم تاریخی اعتبار سے ہی سہی) ماضیات اسلام کا تحفظ بھی ہے۔ یعنی اخلاقی معاشرتی، تمدنی نقطہ پر اپنی دماغی قوتوں کو صرف کرنے کے علاوہ جس حد تک ہندوستانی مسلمانوں اور عام مسلمانوں کے قدیم تاریخ کا تعلق ہے ازبس ضروری ہے کہ اس مفید سلسلے کی طرف بہتر سے بہتر توجہات منعطف کی جائیں۔ کیونکہ مسلمانوں کو موجودہ دور جمود سے نکالنے کے لیے اور ان میں بیداری کی روح پھونکنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔ اسی تدبیر کو عملی صورت میں لانے کے لیے ادارہ معارف اسلامیہ کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی ہے جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) **اغراض ومقاصد**: ہندوستان کے تمام محققین علوم اسلامیہ کے درمیان اشتراک عمل اتحاد ذہنی، اجتماعی اور وسائل امداد باہمی کے قیام میں سہولتیں بہم پہنچانا۔

(۲) محققین کی ایسی مشکلات کو جو بسا اوقات ان کے مشاغل علمیہ میں پیش آتی ہیں حتی الامکان کرنے کی کوشش کرنا۔

(۳) محققین کو نتائج تحقیقات علمیہ کی اشاعت کی غرض سے جمع کرنا۔

(۴) بیرونی ممالک کے مستشرقین کو وقتاً فوقتاً افادہ علمیہ کی غرض سے دعوت دینا۔

(۵) ارتقائے تمدن اسلامیہ کے سلسلہ میں اسلام کی مختلف خدمات کو منظر عام پر لانا۔

(۶) عام طور اسلامی تحقیقات کے لیے قوم میں تحریص وتشویق کی تحریک جاری رکھنا۔

(۷)

توسیع کا منصوبہ: ادارے کی وسعت کار حسب ذیل دائروں پر مشتمل ہوگی۔

(۱) **ادبیات ولسانیات**: (۱) عربی (۲) فارسی (۳) اردو

(۲) **انساب وآثار**: (۱) تاریخ وتمدن (۲) سیرت (۳) علم الانساب (۴) آثار قدیمہ (۵) کتبے (۶) سکے۔

(۳) **جغرافیہ وسیاحت**

(۴) **مذہبیات**: (۱) قرآن وتفسیر (۲) حدیث واسماء الرجال (۳) فقہ (۴) کلام

(۵) **فلسفہ**: (۱) مابعد الطبیعیات (۲) نفسیات (۳) منطق (۴) اخلاقیات (۵) جمالیات؟

(۶) **عمرانیات**: (۱) سیاسیات (۲) اقتصادیات (۳) قانون

(۷) **فنونِ لطیفہ**: (۱) مصوری وتعمیرات (۲) موسیقی (۳) سنگ تراشی (۴) خطاطی

(۸) **علومِ حکمیہ**: (۱) ریاضیات (۲) فلکیات (۳) طبیعیات (۴) کیمیا (۵)

(۹) حیاتیات

(۱۰) **صنعت وحرفت**:

(۱۰) قومیات : (۱) عرب (۲) ترک (۳) تاجیک (۴) افغان غیرہم

طریق و عمل :- اس لائحہ عمل کے شائع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان ہند کو ہمارے مقاصد سے آگاہی حاصل ہو۔ ہمدردی پیدا ہو۔ طریق عمل بالفصل یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ہر دوسرے سال ہمارے مختلف مقامات پر جلسہ کیا جائے اور اس میں تقاضے نہ کیے جائیں بعض مقام پر جلسہ ہو وہاں کے ارباب علم و فضل سے توقع کی جائے کہ وہ استقبالیہ کمیٹی اور جلسہ کا انتظام کریں۔

ادارہ کی مجلس عاملہ :- ان مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے معاونین ایک کمیٹی کے طور پر کام شروع کریں گے۔

امرائے اسلام سے توقع ہے کہ وہ اپنی روائتی فیاضی کو مدِ نظر رکھ کر گراں قدر مالی امداد ادارہ کو عملی صورت میں کے لیے عطا فرمائیں گے۔ دیگر اصحاب کے لیے رکنیت چندہ ۵ روپے سالانہ مقرر کیا گیا ہے اور کسی خاص جلسہ میں شرکت کے لیے دو روپے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے نام

۸۴ —————— ۱

مائی ڈیر صاحبزادہ صاحب !

میں نے علومِ اسلامیہ کے متعلق آپ کے نہایت عمدہ نوٹ کا بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے اس پر بہت کچھ غور کیا ہے۔ اس مضمون پر مختلف نقطۂ نظر بالخصوص جدید دنیائے اسلام میں عالمگیر روحِ انسانیت کی تخلیق بلکہ بیداری کے لحاظ سے نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ بہر حال قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کروں میں چند منتشر خیالات جو میرے ذہن میں آئے علوم اسلامیہ کے مقاصد کے سلسلہ میں بیان کروں گا۔

۱ — بہتر و مسلمہ جامعیت کے علماء، فقہاء وغیرہ کو تعلیم و تربیت دینا یہ آپ کا پہلا مقصد ہے جو آپ نے اپنے مراسلہ کے صفحہ چار پہ بیان فرمایا ہے اور اس سے مجھے کلی اتفاق ہے۔

۲ — ایسے عالم پیدا کرنا جو اسلامی افکار اور ادبیات کے مختلف شعبوں میں اپنی تحقیقات سے اسلامی تمدن اور موجودہ علوم کے درمیان حیاتِ دماغی کا جو تسلسل پایا جاتا ہے، اس کی از روئے نشو و نما جستجو کریں۔ اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔

یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال بدقسمتی سے کہا جاتا ہے ایسے وقت میں رونما

ہوا جب مسلم حکماء کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ استخراجی علوم لایعنی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حد تک مائل ہو چکے تھے دنیائے اسلام میں تحریک ذہنی عملاً اس وقت سے مسدود ہو گئی اور یورپ نے مسلم حکماء کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں جذبۂ انسانیت کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں۔ یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین جذبۂ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیر ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے اور نہ مسلمانوں کو کیونکہ مسلمان حکماء کے جو کارنامے محفوظ ہیں وہ ابھی تک یورپ ایشیا اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں۔ آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے۔ وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ ائن اسٹائن کے نظریہ سے کسی قدر ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹیفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث و مباحثے ہوتے تھے ابوالمعالی جس کا قول ابن رشد نے نقل کیا ہے۔ تو ائن سٹائن کا موجودہ نظریہ ان کو اتنا اجنبی نہ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ جدید استقرائی منطق سے اسے جو بیگانگی ہے وہ بہت کچھ کم ہو جائے۔ اگر اس کو یہ علم ہو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے ان مشہور و معروف اعتراضات سے وجود میں آیا جو انہوں نے ارسطو کے استخراجی منطق پر عاید کیے تھے اس قسم کے عالموں کا تیار کرنا از بس ضروری ہے۔ کیونکہ جدید علم کے اخذ و جذب کرنے میں صرف یہی لوگ مدد کر سکتے ہیں۔

۳ — ایسے عالموں کا تیار کرنا جو اسلامی تاریخ، آرٹ (فنون) اور علم تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہوں۔ یہ اصل میں آپ کا تیسرا مقصد ہے جو آپ نے اپنے مراسلہ کے صفحہ ۴ پر بیان فرمایا ہے۔ میں نے اس میں سے

سائنس اور فلسفہ کو علیحدہ کر کے اسے کسی قدر محدود کر دیا ہے۔ آپ کا مقصد نمبر ۲ بھی اسی میں آجاتا ہے۔

۴ — ایسے عالموں کا پیدا کرنا جو اسلام کے قانونی لٹریچر میں تحقیق و تدقیق (ریسرچ) کے لیے موزوں ہوں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمارا قانونی لٹریچر جس کا کافی حصّہ ابھی غیر مطبوعہ ہے بے انتہا ہے۔ میری رائے میں ایسے علومِ اسلامیہ کی ایک علیحدہ شاخ قرار دینا چاہیئے۔ (قانون سے میرا مقصد صرف اس قانون سے ہے جس کا تعلق فقہ سے ہے) صرف انہیں عام اصولوں کے تحت میں ہمیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کی اسکیم مرتب کرنا چاہیئے۔ اب میں اس مسئلہ کے عملی رُخ پر غور کرتا ہوں۔

۲۔ مسلم دینیات کا مطالعہ:

ہمارا پہلا مقصد جس کی بابت ہم دونوں متفق ہیں موزوں صفات کے علماء پیدا کرنا ہے جو ملّت کی روحانی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ مگر زندگی کے متعلق ملّت کے زاویہ نگاہ کے دوش بدوش ملّت کی روحانی ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ فرد کی حیثیت اس کی دماغی نجات و آزادی اور طبیعی علوم کی غیر متناہی ترقی۔ ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، اس نے جدید زندگی کے اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے چنانچہ جس قسم کا علم کلام اور علم دین ازمنہ متوسط کے مسلمان کی تسکین قلب کے لیے کافی ہوتا تھا، وہ آج تسکین بخش نہیں ہے۔ اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکر دینی کو از سرِ نو تعمیر کرنا قطعاً لازمی ہے اور بہت سے مسئلوں کی طرح اس مسئلہ میں بھی سرسید احمد خاں کی دور رس نگاہ کم و بیش پیشین گویانہ تھی۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے انہوں نے اس کی بنیاد زیادہ تر ایک گذرے ہوئے عہد کی فلسفیانہ معتقدات و

افکار پہ رکھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق نہیں کر سکتا میرے نزدیک قدیم طرز پہ مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے۔ اگر اس سے آپ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ سوسائٹی کی زیادہ قدامت پسند جماعت کی تالیف قلب مدنظر رہے۔ جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلہ میں اس کی کوئی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کی ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور علم کلام کی تعمیر و تشکیل میں اس کو برسرپیکار لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام انہیں لوگوں کے ہاتھ انجام پا سکتا ہے جن میں اس کام کی صلاحیت ہے مگر ایسے آدمی کس طور پہ پیدا کیے جائیں؟

میں آپ کی اس تجویز سے پورے طور پہ متفق ہوں کہ دیوبند اور لکھنؤ کے بہترین مواد کو برسرکار لانے کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دینے کے بعد کیا کریں گے؟ کیا آپ ان کو بی۔ اے اور ایم اے بنائیں گے جیسا کہ سر ٹامس آرنلڈ کی تجویز ہے۔ مجھے یقین ہے جہاں تک دنیاتی افکارِ دماغی کے مطالعہ یا ترقی کا تعلق ہے، وہ آپ کا مقصد نہیں پورا کر سکیں گے۔ دیوبند اور لکھنؤ کے وہ لوگ جو علمِ دینیات پہ غور و فکر کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہوں ان کو میرے نزدیک قبل اس کے کہ وہ آرنلڈ کے مجوزہ نصاب کو عبور کرنے دیئے جائیں جس کو ان کی ضرورتوں کا خیال کر کے بہت مختصر کر دینا پڑے گا افکار جدیدہ اور سائنس سے ناآشنا کر دیا جائے۔ جدید سائنس اور خیالات کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ان کو آرنلڈ کے مجوزہ نصاب کے ایسے مضامین پہ لیکچر سننے کو کہا جا سکتا ہے جو ان کے خاص مضامین سے متعلق ہوں۔ مثلاً اسلام کے فرقہ جات اور اسلامی اخلاق اور فلسفہ مابعد الطبیعات اس ترتیب کے بعد انہیں مسلم دینیات کلام اور تفسیر پہ مجتہدانہ خطبہ دینے کے لیے یونیورسٹی فیلو بنایا جائے۔ صرف یہ

لوگ یونیورسٹی میں دینیات کا ایک نیا اسکول قائم کر سکیں گے اور ہمارا مقصد نمبر (۱) پورا ہو سکے گا۔ لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ سوسائٹی کا قدامت پسند عنصر مطمئن ہو جائے تو آپ قدیم طرز کی دینیات کے اسکول سے ابتدا کر سکتے ہیں جیسا کہ آپ نے اپنے مراسلہ کی دفعہ نمبر ۴ میں تجویز کیا ہے۔ مگر آپ کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ آپ تدریجاً اس کے بجائے ان لوگوں کی جماعت کو کارفرما بنائیں جو میری تجویز کردہ اسکیم کے مطابق خود اجتہاد فکر پہ قادر ہوں گے۔

۳۔ ہمارا دوسرا مقصد:

دیوبند اور لکھنؤ کے وہ لوگ جو خالص سائیٹیفک تحقیقات کا مخصوص ذوق رکھتے ہوں ان کو ان کے میلاناتِ طبعی کے مطابق جدید ریاضیات، سائنس اور فلسفہ کی مکمل تعلیم دینی چاہیئے۔ جدید سائنس اور حکمت کی تعلیم پورا کرنے کے بعد ان کو اجازت دے دی جائے کہ وہ آرنلڈ کا کورس پورا کریں جس کو ان کی ضروریات کا لحاظ کر کے مختصر کر دیا جائے گا۔ مثلاً صرف اس شخص کو آرنلڈ کورس کا نمبر ۳ "دنیائے اسلام اور سائنس" پہ لیکچر سننے کی اجازت دی جائے جو صرف طبعی سائنس پڑھ چکا ہے۔ اس کے بعد اسے آپ یونیورسٹی کا فیلو بنا سکتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنا پورا وقت خاص سائنس میں ریسرچ پر صرف کرے جس کا اس نے مطالعہ کیا ہے۔

۴۔ ہمارا تیسرا مقصد:

آرنلڈ کا کورس ان لوگوں کو لینے کی اجازت ہونی چاہیئے جو سائنس یا فلسفہ میں خاص دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ مسلم تمدن اور تہذیب کے اصولوں کی عام تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اسے صرف لکھنؤ اور دیوبند کے لوگوں تک محدود نہیں کرنا چاہیئے۔

آپ کی اپنی یونیورسٹی کے ایسے لوگ جو عربی اچھی طرح جانتے ہیں اسے اختیار کر سکتے ہیں مگر اس کورس میں مسلم آرٹ اور فنِ تعمیر بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔

۵۔ مسلم قانون اور تاریخ قانون:

ہمیں دیوبند اور لکھنؤ سے ایسے ذہین اور طبّاع لوگ منتخب کرنے چاہئیں جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں۔ چونکہ قانونِ محمدی سرتاسر تعمیری تشکیل کا محتاج ہے ہم کو چاہیئے کہ انہیں اصول فقہ و قانون سازی کے اصولوں کی تعلیم میں اور شاید جدید اقتصادیات اور اجتماعیات کی جامع تعلیم دینے کی بھی ضرورت پیش آئے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو ایل ایل بی بنائیں اور پھر آرنلڈ کا کورس پڑھنے کی اجازت دیں مگر ان کے لیے بھی کورس میں تخفیف کرنی پڑے گی مثلاً ان سے کہا جائے کہ "سیاسی نظریہ اسلامیہ اور اسلامی اصول فقہ کا ارتقا وغیرہ مضامین کے لکچروں میں شریک ہوں۔ بعض کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے دیا جائے۔ دوسروں کو یونیورسٹی کی فیلوشپ اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ کچھ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کے لیے وقف کر دیں۔ اس ملک میں قانون محمدی جس طریقہ سے عمل میں لایا جاتا ہے وہ بغایت تاسف انگیز ہے۔ اور بعض دشواریاں ایسی ہیں جو صرف (مجلسِ قانون سازی کے) قیام سے دور ہو سکتی ہیں۔ مسلمان قانون دان جن کا پیشہ وکالت ہو اور جو قانون محمدی کے اصولوں پر پورے طور پر حاوی ہوں، وہ عدالت اور کونسل دونوں میں بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

۶۔ مختصراً میری تجاویز حسبِ ذیل ہیں:

جو نصاب سر ٹامس آرنلڈ نے تجویز کیا ہے میں اس کو قبول کرتا ہوں مگر پورا کورس صرف ان طالب علموں کو لینے کی اجازت ہونی چاہیئے جو قانونی دینیات اور

سائنس کے لیے کوئی خاص ذوق نہ رکھتے ہوں۔ جہاں تک دینیات کی تعلیم کا تعلق ہے میں آپ کی تجویز (آپ کے خط کی دفعہ ۴) کو تسلیم کرتا ہوں مگر اسے صرف عارضی اور امتحانی حیثیت دینا چاہتا ہوں اس کی جگہ رفتہ رفتہ ان لوگوں کے لیے اور ان کے لیے جو قانون اور خاص علوم کا مطالعہ کریں گے، آرنلڈ کا کورس ان کی ضروریات کے لحاظ سے مختصر کرنا پڑے گا۔ یہ جتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو اسلامی حکمت، ادبیات، آرٹ، تاریخ نیز دینیات کا نصاب اختیار کریں گے، جرمن اور فرنچ زبانوں کا حسبِ ضرورت جاننا ازبس ضروری ہے۔

مکرر..... منسلکہ خط ٹائپ کیا جا چکا تھا کہ میں پروفیسر محمد شفیع سے ملا جن کو آپ نے کہا تھا کہ مجھ سے علومِ اسلامیہ کے متعلق تبادلہ خیال کریں۔ ان سے گفت و شنید کا ماحصل یہ ہے:

۱ پروفیسر محمد شفیع میرے خیال میں دینیات کی نسبت زیادہ حامی نہیں ہیں۔

۲ ان کا خیال ہے کہ اسلامی حکمت وغیرہ کی تعلیم کے لیے زیادہ تر یونیورسٹی کے گریجویٹوں میں سے انتخاب کرنا چاہیئے۔ معمولی یونیورسٹی تعلیم کے بعد وہ ان لوگوں کو عربی زبان و ادب کی تعلیم دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ میں ہر دو امور میں ان سے اتفاق نہیں کر سکتا میری رائے میں جدید اسلامی ملتوں کے لیے جدید دنیاتی افکار کی توسیع اور ترویج ضروری ہے قدیم اور جدید اصولات تعلیم کے مابین اور روحانی آزادی اور معبدی اقتدار کے مابین دنیائے اسلام میں ایک کشاکش شروع ہو گئی ہے۔ "یہ روحِ انسانیت کی تحریک" افغانستان جیسے ملک پر بھی اثر ڈال رہی ہے۔ آپ نے امیر افغانستان کی وہ تقریر پڑھی ہو گی جس میں انہوں نے علماء کے اختیارات کے حدود متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدید دنیائے اسلام کی مختلف تحریکیں اسی نتیجہ کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان حالات کے ماتحت مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ دلیری سے اس وادی کی طرف قدم بڑھائیں۔ اس میں شک نہیں محتاط رہنا لازمی ہو گا اور فکر و حکمت کی

اصلاح اس طور پر عمل میں لانی ہوگی کہ معاشرتی امن و سکون میں خلل نہ آنے پائے۔

رہا پروفیسر شفیع کا دوسرا خیال۔ اس کے سلسلہ میں میری رائے ہے کہ دیوبند اور ندوہ کے لوگوں کی عربی علمیت ہماری دوسری یونیورسٹیوں کے گریجویٹ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر پروفیسر شفیع کا خیال ہے کہ قدیم طرزِ تعلیم کی وجہ سے جو دیوبند اور ندوہ میں جاری ہے اُن کے طالب علموں کا ذہنی نصب العین تنگ ہو جاتا ہے ان کو یہ تسلیم ہے کہ عربی زبان کی قابلیت ان کی بہتر ہوتی ہے۔ میری رائے میں جو لوگ غیر معمولی روشن دل و دماغ کے ہوتے ہیں ان کے لیے طریقۂ تعلیم کی نوعیت کچھ بہت زیادہ اہم نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کا پیش نہاد کافی (لچکیلا) ہوتا ہے اور ان میں وسعت پذیر ہونے کی کافی صلاحیت ہوتی ہے۔ قدیم اور جدید طرز تعلیم کے محض بہترین ناقد اسی قدیم طریقہ تعلیم کی پیداوار ہوئے ہیں۔ مزید برآں ندوہ کے بعض افراد ایسے ہیں جو پروفیسر شفیع کے عقیدہ کی تکذیب کرتے ہیں۔

میں یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، آپ ندوہ اور دیوبند کے لوگوں کو انٹرمیڈیٹ کے معیار تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنے پر مجبور کیے جائیں۔ یہاں وہ سوائے انگریزی کے کوئی دوسری زبان اختیار نہ کر سکیں گے۔ دوسرے مضامین میں وہ حسبِ ذیل مضامین سے انتخاب کر سکیں گے:

(الف) علوم طبعی۔ (ب) ریاضیات۔ (ج) فلسفہ۔ (د) اقتصادیات۔

چونکہ ان کو انگریزی کی تعلیم محض کام چلانے کے مطابق حاصل کرنی ہوگی میں یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات ایم، اے اور بی، اے سے انگریزی کو بالکل حذف کر دینا چاہتا ہوں۔ ان امتحانات میں ان کو صرف سائنس اور فلسفہ کے مضامین لینے کی ضرورت ہوگی۔ ابھی میں اس امر کے متعلق توجہ نہیں کر سکا ہوں کہ آیا ان کو بی اے اور ایم، اے کے امتحانات پاس کرنا ضروری ہوں گے۔ اس امر کے متعلق دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں اگر یہ طے ہو کہ ان کو یونیورسٹی کے امتحانات

بی، اے یا ایم، اے پاس کرنا نہ پڑیں گے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کو بمقابلہ دیگر طلبار کے جن کو امتحان پاس کرنا ہے زیادہ وسیع پیمانہ پر مطالعہ کا موقع ملے گا۔ مگر اس حالت میں ان لوگوں کی علمی کارکردگی پر یونیورسٹی کو خاص طور پر نگران رہنا پڑے گا۔

نوٹ: اصل خط ایک نوٹ کی صورت میں انگریزی میں ہے وہ نہیں مل سکا۔
مندرجہ بالا اردو ترجمہ 'سہیل' سے نقل کیا جاتا ہے۔ (مرتّب)

خالد خلیل کے نام

۱۰۹

(انگریزی)

مائی ڈیر خالد خلیل !

میں آپ کو یہ خط سید سجاد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے مکتوب کے جواب میں لکھ رہا ہوں جنہوں نے کچھ عرصہ ہوا آپ کا خط یہاں اخبارات میں شائع کرایا اور خصوصاً مجھ سے ایسی تجاویز طلب کیں جو آپ کے معلمانہ مساعی و مشاغل میں معین ہو سکیں۔ میرے نزدیک قسطنطنیہ یونیورسٹی کے ادارۂ دینیات نے یہ نہایت دانشمندانہ کام کیا ہے۔ اگر اسلامی علم الانساب کا کام باقاعدہ طور پہ کیا گیا تو اغلباً ایسے اکتشافات بہ روئے کار آئیں گے جن سے دنیائے اسلام کی بابت ترکوں کا دائرۂ نظر وسیع تر ہو جائے گا اور اس طرح پہ ممکن ہے کہ نوخیز نسل کا ذہنی اور روحانی نصب العین محکم تر ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس قسم کے تحقیقات سے انسانی علوم کے سرمایہ میں اضافہ ہوگا اور ممکن ہے نسلی خصوصیتوں کی تہ میں وحدتِ روح کے ایسے سامان دریافت ہو سکیں جن کا اندازہ سطحی مشاہدہ سے بمشکل لگایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو سکے کہ ایشیا کی سیرت کی تشکیل میں جس کا راز اب تک معلوم نہیں کیا جا سکا ہے مہتمم بالشان تاتاری نسل کی بعض اہم ترشاخیں

کارفرما رہی ہوں۔ جو کام آپ کے پیشِ نظر ہے اس کے امکانات بے پایاں ہیں اور مجھے یقین ہے، آپ اپنے خطباتِ علمی سے انسانیت، اسلام اور اپنے ملک وملّت کی زبردست خدمت انجام دیں گے۔ اور کم از کم دس سال کی مستقل سعی و محنت کے بعد آپ ملل سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایک کلیۃً جدید نقطۂ نظر مہیا کر سکیں گے۔

۱۔ میں پہلے ایک عام تجویز پیش کروں گا۔ آپ کو ادارۂ دینیات کو مشورہ دینا چاہیئے کہ جتنی کتابیں تاریخی یا اور قسم کی یورپین اور اسلامی زبانوں میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کے متعلق لکھی گئی ہیں، وہ ان سب کو فراہم کرے۔ یورپین کتابوں میں سے اکثر بلا شبہ خاص اغراض کو مدنظر رکھ کر تصنیف کی گئی ہیں۔ (مثلاً تبلیغی۔ سیاسی۔ تجارتی وغیرہ) تاہم ان کتابوں میں کہیں کہیں آپ کو اپنے مضمون سے متعلق نہایت مفید معلومات ملیں گی۔ مثلاً مارشل کی 'اسلام چین میں'، ایک مشنری نے مشنری اغراض کے لیے لکھی ہے۔ بایں ہمہ اس کتاب کے بعض حصص کے مطالعہ سے چینی مسلمانوں کے موجودہ نصب العین ان کی تحریکات اور ان کی آرزوں کا پتہ لگتا ہے۔ مصنّف نے ان کی اصلیت کے متنازع فیہ مسئلہ، ان کی موجودہ آبادی، ان کے معابد اور ان کے ادب کی نوعیت سے بھی بحث کی ہے۔ ایک دوسری مثال سٹوڈرڈ کی تصنیف 'جدید دنیائے اسلام' ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو جنگ عظیم کے بعد ضبطِ تحریر میں آئی ہیں اور اس کے مصنف کا مقصد (جو اینگلو سیکسن نسل کی برتری کا قائل معلوم ہوتا ہے) محض ایک طرح کی سیاسی اشتہار بازی ہے۔ تاہم یہ ایک مفید کتاب یورپین زبانوں میں لکھی ہوئی ان کتابوں کے بے شمار حوالے دیتی ہے جو اسلام اور مللِ اسلامیہ پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جن کو سیاحوں یا حکومتہائے یورپ کے ان سیاسی نمائندوں نے فرداً فرداً بعض اسلامی ممالک پر لکھا ہے۔ جہاں وہ متعین تھے۔ مثلاً برٹن اور فلبی (عرب) گوبنو (فارس) اور ویمبری (وسط ایشیا) یہ وہی ویمبری ہے جس نے مرحوم سلطان عبدالحمید کو بتایا تھا کہ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے سے قبل ترک اپنے ایک مخصوص رسم الخط کے

مالک تھے۔

یہ سب کتابیں جمع کرنی چاہئیں اور اپنے خطبات کی ترتیب وتیاری میں آپ کو ان سے مدد لینی چاہیئے۔ میسرز لوزک اینڈ کمپنی برٹش میوزیم لنڈن سے مراسلت کیجئے ان کی فہرستِ کتب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپین مستشرقین نے اسلامی تمدن پر کتنا زبردست ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کا لائپزگ (جرمنی) کے پروفیسر ڈاکٹر فشر سے مراسلت کرنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے، وہ آپ کے مضمون کے متعلق قیمتی مشورے دے سکیں گے۔ اگر آپ خود ان سے واقف نہیں تو خط میں میرا حوالہ دے دیجئے گا۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر زویمر کا بھی نام لوں گا جو قاہرہ میں ایک امریکن مشنری ہیں۔ وہ اسلام کی مخالفت میں ایک رسالہ 'مسلم ورلڈ' کی ادارت بھی کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے متعدد کتابوں اور مضامین کی صورت میں ملل اسلامی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ گذشتہ سال وہ لاہور آئے تھے اور انہوں نے جرمان زبان میں مجھے ایک کتاب دکھائی تھی۔ جس میں اسلام اور ملل اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے عنوانات درج تھے۔ میں اس کے مصنف کا نام بھول گیا ہوں۔ مگر یہ آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر زویمر کو لکھیں تو وہ آپ کو بتا دیں گے۔ یہ کتاب حال میں شائع ہوئی ہے اور اس سے اغلباً آپ کو ایسی کتابوں کے نام ملیں گے جو آپ کے مضمون کے متعلق ہیں۔ پروفیسر ہارووٹز (فرینکفورٹ جرمنی) سے بھی مشورہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ تصریحاً میں مشورہ دوں گا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مستقل طور پر پیشِ نظر رہے۔ اس میں آپ کو اسلامی ممالک مثلاً افغانستان۔ بلوچستان۔ کشمیر وغیرہ پر ان کی نسلی اور نسبی خصوصیات پر مضمون ملیں گے۔ فارس کے متعلق میں

کے مطالعہ کا مشورہ دوں گا۔ یہ کسی قدر پرانی کتاب ہے۔ مگر اس سے آپ کو اپنے

کام کی نوعیت اور ترتیب کا ایک عام اندازہ ہو جائے گا۔

۳۔ جہاں تک آپ کے خطبات کی ترتیب کا تعلق ہے۔ میں حسبِ ذیل مشورے دینا چاہتا ہوں۔ شروع میں دو ایک ابتدائی خطبات ہوں۔ جن میں حسبِ ذیل امور پر بحث ہو:

(الف) علمِ وظائف الاعضاء کے نقطۂ نظر سے نسل کی حیثیت۔

(ب) وہ اسباب جن سے نسلوں کی تفریق پیدا ہوئی۔

(ج) کیا مذہب ایک نسل آفرین عنصر ہے؟ بذاتہٖ میں محسوس کرتا ہوں کہ تفریقِ لسانی کے باوجود کیا عالم اسلام کی ادبیات ایک مشترک پیش نہاد کی حامل ہیں بحیثیت مجموعی میرا خیال ہے کہ ایسا ہے۔

(د) اسلامی نسلوں کا ایک سرسری دائرہ۔

۱۔ سامی۔

(ا) عرب، (ب) افغانی اور کشمیری۔ (کیا یہ عبرانی ہیں؟)

۲۔ آریائی۔

(ا) ایرانی۔ (ب) ہندی مسلمان۔ یہ مخلوط النسل ہیں۔ آریائی عنصر غالب ہے جاٹ اور راجپوت جیسا کہ بعض مصنفین کا خیال ہے شاید تاتاری ہیں۔

۳۔ تاتاری۔

(ا) وسطِ ایشیا کے تاتاری۔ (ب) منگولیں۔ (کاشغری اور تبتی)

(ج) چینی مسلمان۔

(د) عثمانی ترک۔

۴۔ حبشی اور بربری۔

۵۔ علم الانساب کے اغراض و مقاصد۔

(۴) میری رائے ہے کہ مثال کے طور پر افغانوں پر خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے۔

خطبۂ اوّل :

افغان۔ افغانستان میں نسلوں کا خلط ملط۔ فارسی بولنے والے افغان اور پشتو بولنے والے افغان۔ کیا افغان اور پٹھان میں کوئی چیز مابہ الامتیاز ہے کیا افغان عبرانی ہیں؟ اپنی اصلیت کے متعلق ان کی اپنی روایات۔ کیا پشتو زبان میں عبرانی الفاظ ملتے ہیں؟ کیا وہ ان یہودیوں کے خلاف ہیں جن کو ایرانی کسریٰ نے اسیرین کی غلامی سے نجات دلائی تھی؟ جدید افغانستان کے بڑے بڑے قبائل ان کی تخمینی آبادی۔

خطبۂ دوم :

افغانوں کے اسلام لانے کے زمانہ سے ان کی سیاسی تاریخ پر سرسری تبصرہ۔

خطبۂ سوم :

افغانوں کو متحد کرنے کی جدوجہد۔

(ا) مذہبی۔ پیر روشن اور ان کے اخلاف۔

(ب) سیاسی۔ مشہور افغان شیر شاہ سوری جس نے افغانانِ ہند کو متحد اور عارضی طور پر حکومت مغلیہ کو بہ طرف کر دیا تھا۔ اس کی تگ و دو صرف ہندوستان تک محدود ہونا۔

(ج) خوشحال خاں کھٹک۔ سرحدی افغانوں کا زبردست سپاہی شاعر جس نے ہندوستان کے مغلوں کے خلاف افغان قبیلوں کو متحد کرنا چاہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ افغان عبرانی النسل تھے۔ اس نے آخر شہنشاہ اورنگ زیب سے شکست کھائی۔ اور کسی ہندی قلعہ میں قید کر دیا گیا۔

افغانوں کا شاید اوّلین قومی شاعر تھا۔

(د) احمد شاہ ابدالی۔

(ہ) مرحوم امیر عبدالرحمان خاں۔ موجودہ امیر اور افغانوں میں قومی تشخص پیدا کرنے کی جد وجہد۔

خطبۂ چہارم :

موجودہ افغانی تمدن۔ ان کی قدیم اور جدید صنعت وصناعت۔ ان کی ادبیات ان کی آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کی ترجمان کی حیثیت سے۔

خطبۂ پنجم :

افغانی نسل کا مستقبل۔

(ا) آخر میں ایک نہایت اہم تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ گو اس کا تعلق اس خط کے مضمون سے نہیں ہے۔ ادارۂ دینیات کو چاہیئے کہ دینیات کی ایک پروفیسر شپ قائم کرے۔ جس پہ کسی ایسے شخص کو متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر وتصور کا مطالعہ کیا ہو۔ تاکہ وہ مسلم دینیات کو افکارِ جدیدہ کا ہمدوش بنا سکے۔ قدیم اسلامی دینیات کے (جس کا ماخذ زیادہ تر یونانی حکمت وفکر تھا) تار وپود بکھر چکے ہیں۔ اب وقت آچکا ہے کہ اسی کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ترکی کو چاہیئے کہ جس طور پر وہ اور معاملات میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ اس معاملہ میں بھی پیش قدمی کرے۔ یورپ نے عقل والہام کو ہم آہنگ بنانا ہم سے سیکھا ہے وہ وہ اپنے دینیات کو موجودہ فلسفہ کی روشنی میں از سرِ نو تعمیر کرنے میں ہم سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اسلام کی عیسائیت سے کہیں زیادہ سادہ اور عقلی مذہب ہے اس شعبہ میں کیوں بے حس وحرکت رہے۔ ادارۂ دینیات کو ایک جدید علم کلام کی طرح ڈالنی چاہیئے اور ترکی کی نوخیز نسل کو یورپ کی لامذہبیت سے محفوظ و

مصئون کر لینا چاہیئے۔ مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے۔ جو حیاتِ ملّی کے مختلف پہلوؤں کے لیے بیش بہا ترین سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے بحیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم و تربیت میں سے مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی بے لگام انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔ شاید ایک نئی جنگ کی صورت میں وہ اپنی ہلاکت کا باعث خود ہو۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا لاہور

(اصل انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ یہ ترجمہ سہیل علی گڑھ سے ماخوذ ہے۔)

اشاریہ

اسماء الرّجال

کتب و رسائل

مقامات و ادارے

اشاریہ

اسماء الرّجال

الف :

آرنلڈ، پروفیسر ۲۰۵
آزاد، محمد حسین ۲۳۲
آفتاب احمد خان، صاحبزادہ ۲۹۳
آئی آئی قاضی، علامہ ۶۵
ابراہیم علیہ السلام، حضرت ۳۳
ابلیس ۱۲۵
ابن المعتاظ ۱۸۳
امام ابن تیمیہ ۱۴۵، ۱۵۲، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۹۰
ابن حزم ۲۵۹
ابن خلدون ۲۵، ۱۱۱
ابن رُشد ۱۵۲، ۲۹۱
ابنِ طفیل ۲۹۱
ابنِ عربی، محی الدین ۹۲، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۱۴، ۲۸۷
ابن قاسم، محمد ۱۶۵
ابو لہب ۱۴۳، ۱۵۱

احمد الدین امرتسری ۲۱۸
احمد رضا بجنوری، مولوی ۲۰۴
احمد رضا خان ۲۷۹
احمد سعید مولوی ۱۹۸
احمد شجاع پاشا، حکیم ۸۰، ۲۷۹
احمد علی، مولوی ۲۱۶
احسان الحق حقی، ڈاکٹر ۷۹، ۲۰۵، ۲۲۶
ارسطو ۹۱، ۲۳۲، ۲۸۴، ۲۹۱
آرتھر ڈنگٹن، سر ۱۶۴
اسد، علامہ محمد ۸۲، ۸۴، ۲۰۵، ۲۸۵
اسکندر اعظم ۲۸۴
اسلم، محمد ۱۳، ۹۴، ۹۷، ۲۸۵
اسلم جیراجپوری، حافظ محمد ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۷۹
اسمٰعیل شہید، مولانا شاہ ۱۴۵، ۲۰۲، ۲۶۱
اعجاز احمد، شیخ ۶۶
افلاطون ۵۷، ۲۶۰، ۲۸۴
اقبال، محمد، سر، علامہ ۸، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۸، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۲، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۶،

۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۲۱،
۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۴،
۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵،
۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۸،
۱۷۲، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۴، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۴،
۱۹۵، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷،
۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۱،
۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲،
۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۳، ۲۴۵،
۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۷، ۲۶۰،
۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۶،
۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹

اکبرالہ آبادی ۱۴، ۱۷، ۹۴، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۳۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱
۲۴۱، ۲۴۵، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۸۸، ۲۸۹

اکبر مینر، محمد ۱۴، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶

اکبر شاہ نجیب آبادی ۱۷۰، ۱۷۱، ۲۸۸

اشرف علی تھانوی، مولانا ۲۶۰

اصغر علی روحی ۲۱۸

اکبر علی ارسطو، شیخ ۸۰

اکرم خان ۲۳۴

آل احمد سرور ۲۰۴، ۲۳۹

البرٹ، آئن سٹائن ۲۸۴

الطاف حسین حالی، سید ۲۹، ۲۳۲

اللہ تعالیٰ، خدا	۱۰، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۳۰، ۳۱، ۳۵، ۳۷، ۵۸، ۷۹، ۱۱۶، ۱۳۸، ۱۴۶، ۱۷۰، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۸، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۸، ۲۳۸، ۲۴۸، ۲۵۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۹۰
المراغی، علامہ	۸۸
الیاس برنی	۱۰۶، ۲۳۴
ای گیری دانتے	۲۸۴
امام ابو حنیفہؒ	۹۱، ۱۲۲، ۱۲۶، ۲۸۲
امام فخر الدین رازیؒ	۷۶، ۱۳۵، ۱۵۱، ۱۵۲، ۲۰۳، ۲۸۸، ۲۹۰
امام شافعیؒ	۲۴، ۱۱۹
امام غزالیؒ	۷۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۳۴، ۱۵۱، ۱۵۲، ۲۸۹، ۲۹۰
امام مالکؒ	۲۰۳
امام محمد	۲۰۴
امان اللہ بنارسی، حافظ	۲۰۳
امراؤ القیس	۴۳، ۴۷، ۱۱۷
امیر معاویہؓ	۱۸۴
امیر یوسف	۲۹۱
انور شا کشمیری، علامہ سید	۲۰۵-۲۱۲-۲۱۴-۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷
انوری	۲۵۵
او یلنڈ	۷۰
اویس، حضرت	۲۰۳

ب

بابر ۱۰۱

باسویل ۲۲۰

بائرن ۱۴۸

بھٹناگر، ڈاکٹر ۸۰

براؤن ۱۰۶، ۲۰۱

برکات احمد، مولانا حکیم ۹۳

برگساں، ہنری ۸۱، ۱۴۸، ۲۸۴

بروس ۱۶۶

بشیر احمد ڈار ۲۲۰

بلھے شاہ ۵۹

بوعلی سینا ۲۸۹

بہاءالدین ۱۲۲

بہاءاللہ ۱۲۲

بیدل ۵۵، ۵۶

بیگ، ڈاکٹر ۱۰۳

پ

پاپائے روم ۲۸۰

پرنس کتانی ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۶

ت

تاثیر، ڈاکٹر ۷۷، ۸۰

تھامس ۲۴۴، ۲۴۵

تصدیق حسین تاج ۱۰۷

ٹ

ٹیپو سلطان ۹۰، ۱۰۴، ۱۶۵، ۱۷۱

ج

جامی، مولانا ۱۰۶، ۲۶۳

جان سٹورٹ مل ۸، ۱۳۴

جانسن، ڈاکٹر ۲۲۹

جبریل امین ۴۰، ۱۲۵

جلال الدین، بارایٹ لاء ۳۵، ۷۴، ۸۲، ۸۳، ۹۴

جلیل قدوائی ۶۹

جمال الدین افغانی، سید ۱۰

جمیل، محمد ۱۰۳، ۱۴۰

جینٹلی، پروفیسر ۶۲

جنید بغدادیؒ ۲۴، ۲۵

جواہر لال ۲۴۵، ۲۴۶

جہانگیر ۶۵

جیمز جینز، سر ۱۶۲، ۱۶۴، ۲۸۱، ۲۸۵

چ

چراغ علی ۹۰

چنگیز خان ۴۵، ۴۹

ح

حارث محاسبی ۹۱، ۱۰۹

حافظ شیرازی ۹۱، ۱۰۹، ۱۷۹، ۲۰۲، ۲۴۱، ۲۶۰، ۲۶۳

حافظ ابن قیم ۹۱، ۱۹۹، ۲۰۰

حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری ۱۳۶-۱۳۷

حبیب الرحمٰن، مولوی ۲۱۴-۲۱۶

حبیب بورقیبہ ۱۲۵

حشمت علی، مولانا ۲۱۸

حضور اکرمؐ، رسولِ پاک ۲۰-۳۷-۴۳-۴۶-۴۷-۴۹-۶۸-۶۹-۱۱۴-
۱۱۸-۱۱۹-۱۲۷-۱۲۸-۱۵۴-۱۵۸-۱۷۰-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-
۱۷۵-۱۸۰-۱۹۳-۲۰۱-۲۲۱-۲۴۸-۲۶۷-۲۷۰-۲۷۲-۲۷۹

حق نواز ۶۴

حمید احمد خاں، پروفیسر ۵۵-۱۰۰

حمید نظامی ۷۷

حیدر کرار، حضرت علیؓ ۱۴۳-۱۵۱-۱۸۲

حفیظ ہوشیارپوری ۲۸۸

خ

خالد بن ولیدؓ ۱۶۵

خالد خلیل، پروفیسر ۲۹۳

خالد حسین، محمد ۲۲۶

خوشحال خاں خٹک ۹۲

خیام ۲۷۸

د

دانتے ۱۴۷-۱۴۸

دواک بن شمیل المازنی ۱۸۷

ڈ

ڈلہوزی ۲۸۵

ڈیکارٹ ۳۴-۱۳۵

ز

زہیر بن سلمی ۱۸۶
زکریا ملتانی، خواجہؒ ۲۸۲

ر

رابعہ بصری، حضرت ۱۶
راجر جیکسن ۱۲۴-۱۲۵-۲۸۵
رادھاکرشنن پروفیسر ۱۶۳
راس مسعود، سید ۹۹-۲۳۰-۲۷۷
راغب اصفہانی ۲۰۱
رحیم بخش شاہین ۱۳
رومی، مولانا جلال الدین ۲۳-۶۵-۷۱-۱۵۱-۱۵۲-۲۳۲-۲۸۳
رسکن ۱۸۸

س

سارٹن ۲۰۸
ساکن بھلواروی ۲۰۴
سالک، عبدالمجید ۶۵-۸۰
سپینگلر، اوسوالڈ ۸۱-۸۳-۲۸۴
سراج الدین پال ۱۰۶-۱۷۸-۱۷۹-۱۹۱-۱۹۳-۲۰۵-۲۶۶ (ح)
سرسید ۳۵-۹۰-۱۲۵-۱۷۱
سرکشن پرشاد ۱۸

سعید الدین جعفری، سید محمد ۱۵۲

سعید اللہ، ڈاکٹر ۵۶-۲۶۲

سعد بن ناشغب ۱۸۸

سعدی ۷۷-۱۴۵

سقراط ۱۵۷

سکندر حیات خان، سر ۷۵-۷۶-۲۷۹

سلیمان ندوی، سید ۷۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۱۷-۱۲۲-۱۳۳-۱۴۳-۱۶۷-
۲۰۲-۲۱۲-۲۲۲-۲۲۳-۲۳۰-۲۴۳-۲۴۵-
۲۵۹-۲۶۰-۲۷۷

سنائی، حکیم ۷۱-۹۲-۱۵۱-۱۸۶-۲۳۲

ش

شاہ ابن سعود ۲۸۵

شاہجہاں ۱۹-۶۵-۲۴۵

شاہ سلیمان پھلواری، مولانا ۲۶۵ (ح)

شاہ محمد غوث گوالیاری ۹۱

شاہ ولی اللہ ۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۵۲-۲۰۴

شاہ ہمدانی، حضرت میر علی ۲۶۷-۲۶۸

شبلی، مولانا ۱۲۲-۱۸۵-۱۹۴-۲۱۳-۲۱۴-۲۲۳-۲۳۲-
۲۷۷-۲۷۸

شبیر احمد عثمانی، مولانا ۲۱۲-۲۱۶-۲۷۸-۲۸۶

شجاع الدین، ڈاکٹر خلیفہ ۹۷-۱۰۰

شرر، مولانا عبد الحلیم ۲۷۴

شریف، پروفیسر میاں محمد ۱۶۱

شیر شاہ سوری ۶۵

شفیع داؤدی، مولوی ۱۹۰

شکیب، ارسلان، امیر ۲۲۵

شیکسپیئر، ولیم ۱۹۲

شمس الرحمٰن، مولوی ۱۹۷-۱۹۹-۲۳۰-۲۳۴

شیخ حبیب احمد آفندی ۲۲۹

شیخ عبدالعلی طہرانی ۱۵-۱۷

شیخ ازہر، احمد رفاعی، مصطفیٰ ۸۶-۸۷-۹۲-۱۸۰-۲۰۵-۲۲۸-۲۷۴

شیروانی، حبیب الرحمٰن ۲۵۴

شیلے ۱۸۴

ص

صالح محمد، مولوی ۴۲-۱۹۷ (ح) ۱۹۸-(ح) ۱۹۹(ح)

صدرالدین الرفاعی، ملّا ۲۶۸

صدرالدین شیرازی، مولانا ۱۴

صلاح الدین النجار، شیخ ۲۲۹

صلاح الدین خدا بخش ۱۶۵

ط

طارق بن زیاد ۱۶۵

طرفہ ۱۸۶

طوسی، نصیرالدین ۷۴-۱۰۷-۱۰۹-۱۵۸-۱۹۵-۲۰۴-۲۱۴-۲۸۱-۲۸۲

ظ

ظفر علی خاں ۱۴۹

ع

عابد علی عابد، سید ۵۸

عالمگیر، اورنگ زیب ۶۵-۱۶۵-۲۴۳-۲۴۴-۲۶۱

عبدالرحمٰن چغتائی ۲۱۸-۲۸۴

عبداللہ ۲۸۹

عبداللہ، شیخ ۷۷

عبداللہ غزنوی، مولوی ۲۶۶

عبداللہ، ڈاکٹر سید ۸۰، ۲۸۴

عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر ۲۰۱-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۷-۲۸۷

عبداللہ قریشی ۳۴

عبداللہ یوسف علی ۷۷-۲۸۶

عبدالغنی، محمد پروفیسر ۱۰۰

عبدالواحد، سید ۵۶-۶۰-۷۹-۸۰-۱۲۶-۲۰۰-۲۰۳

عبدالواحد فاروقی ۲۸۲

امیر عبدالقادر الجزائری ۹۲

عبدالقادر، قصوری، مولوی ۲۱۵

عبدالقادر، سر ۲۸۷

عبدالقادر، مولوی ۱۹۹

عبدالماجد دریابادی ۹۹

عبدالرشید طارق ۳۶-۲۶۳

عبدالسمیع ہاشمی ۲۷۴

عراقی ۹۱-۹۲-۱۸۱-۲۰۱

عزیز الرحمٰن مفتی ۲۱۴

عشرت حسین، سید ۲۲۰

عطاء اللہ شاہ بخاری، سید ۲۱۶
علم الدین سالک ۷۷
علاؤ الدین محمد خوارزم ۲۸۳ - ۲۹۰
علی بخش ۱۸
عمرؓ، حضرت ۱۵ - ۵۷ - ۱۷۲ - ۱۷۴
عمر الدین، محمد ۱۰۸ - ۱۰۹
عمرو بن کلثوم ۱۸۵
عنترہ ۴۸ - ۴۹

غ

غنی کاشمیری ۶۷

ف

فرہاد ۵۰
فرید الدین عطارؒ ۲۸۳
فشے ۴۵

فضل حسین، سر ۲۲۷ - ۲۷۹

فضل کریم ۱۵۷

فیلک ویلائی ۹۷

فوق، محمد الدین ۱۶۸-۱۶۹-۲۰۰-۲۶۲-۲۶۴-۲۶۶-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱

ق

قاسم رضوی، سید ۷۷

قاضی محب اللہ ۲۰۲

قتیبہ بن مسلم ۱۶۵

قرشی، حکیم ۲۰۷ - ۲۰۸

قطامی ۱۸۴

ک

کبیر سید علی ہمدانی، امیر ۲۰۰

کارل مارکس ۱۴۸-۲۲۴-۲۳۵-۲۳۹-۲۵۰

کانٹ، عمانویل ۲۸۰

گ

گاندھی ۹۷

گرامی، مولانا ۳۴

گلیلیو ۲۰۸

گوتم بدھ ۲۷۲

گوئٹے ۹۶-۷۰-۱۴۸

ل

لات ومنات ۵۴

لارڈ لوتھین ۲۴۷

لطیف احمد شیروانی ۷۵-۷۹ - ۲۵۵

لینن ۲۴۸

م

مارٹن لوتھر ۹۲-۱۲۲-۱۴۳-۲۸۰

مارک ٹوئین ۹۶

مارگیرڈ سمتھ ۱۰۹

مجدد الف ثانی، حضرت ۵۵-۹۲-۱۰۴-۱۰۶-۱۰۸-۲۰۴-۲۳۸-۲۶۱-۲۵۷

۲۸۲-۲۸۷

مجید ایم اے ۸۰

محمد حسین عرشی ۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۷-۱۶۱-۱۹۱-۱۹۲-۲۸۰-

۲۸۶

محمد سعید دہلوی، مرزا ۲۸۷

محمد صدیق، مستری ۸۶

محمود الحسن، شیخ الہند ۲۷۸، ۲۸۶

محمود جونپوری، ملّا ۲۰۳

محمود غزنوی ۵۳

محمود نظامی ۱۲

محفوظ علی بدایونی ۲۰۴

محی الدین، عبدالقادر گیلانی، حضرت ۲۶۰

مسعود عالم ندوی، مولانا ۲۱۲

مصطفےٰ کمال ۱۲۰
معاذ ابن جبل، حضرت ۱۱۸
مفتی امین الحسینی، الحاج ۲۸۷
مفتی عالم جان ۲۱۶
مفتی عزیز الرحمٰن ۲۱۹
مقبول حسین قریشی، کرنل ۸۲
ملا صدرا ۹۱
ملٹن ۱۹۲
ممتاز، احمد انصاری، ڈاکٹر ۲۸۶ - ۲۸۹
مسعود (عباسی خلیفہ) ۲۸۳
منصور حلاج ۹۵-۲۵۸
منظور نعمانی، مولانا محمد ۲۱۴
مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ ۵۹-۷۷-۷۹-۸۴-۸۵-۸۶-۸۹-۱۸۸-۲۰۵-
۲۱۲-۲۲۲-۲۳۷

ن

ناسخ ۵۸
ناصر علی سرہندی ۵۶
نبی الاسلام علی الخمس ۲۱
نپولین ۶۹
نٹشے ۱۴۸-۱۶۱
نذیر نیازی، سید ۵۸-۸۴-۹۵-۱۲۷-۱۴۰-۱۹۵-۲۰۵-۲۰۷-
۲۰۸-۲۲۷-۲۵۱-۲۶۶-۲۶۷-۲۸۷
نظام الدین ٹیاں ۹۲-۲۰۱-۲۸۵

نظامی، مولانا ۱۹۳

نقشبند، خواجہ ۲۶۰

نقی علی خاں، مولوی محمد ۲۷۹

نکہت شاہجہانپوری ۱۶۷

نکلسن، پروفیسر ۲۹-۱۴-۱۸۵-۲۰۵-۲۵۸-۲۸۳

نسیم حجازی ۱۷

نصیر الدین ہاشمی ۱۹۵

نور اسلام ۲۰۴

نیاز الدین خاں ۲۱۳

نیاز علی خاں، چودھری ۷۹، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۸

و

وائٹ ہیڈ ۹۳

ہ

ہادی حسن ۹۸

ہادی سبزواری ۹۱-۱۵۵

ہٹلر ۲۳۷

ہیگل ۱۴۸

ی

یاجوج وماجوج ۲۰۲

یامین ہاشمی ۱۷۲

یزید بن عمر ۲۸۶

یوسف سلیم چشتی ۶۳-۲۱۴

کتب و رسائل

ا

اچھوت اقوام اور اسلام (رسالہ) ۱۷۱
احسان (اخبار) ۲۲۸
اخلاقِ ناصری ۲۷۸
اردو (رسالہ) ۵۸
آزادی کے بارے میں ۲۸۰
ارمغانِ حجاز ۱۱۴-۲۱۴
اسبابِ زوالِ امت ۲۲۵
اسرارِ خودی ۱۵-۳۴-۱۴۵-۱۷۹-۲۲۳-۲۴۱
اسرار الحکم ۱۰۵
اسلام اور تصوف ۲۷۴
اسلام کی ثقافتی تاریخ ۱۸۰
اسلام کی عمرانیات ۲۳۷
اسلام کا معاشی پہلو ۸۱
〃 〃 نظام ۲۳۷
اسلامی تاریخ الٰہیات ۷۸
اسلامی شاعری اور تصوف ۲۵۸
اشعارِ اقبال ۲۶۰
اسلام الموقتین ۹۱
اقبال اور سیاستِ عالیہ ۸۰
اقبال اور فنونِ لطیفہ ۵۸
اقبال ریویو (کراچی) ۲۷۳ (ح)

اقبال کی پیشین گوئیاں ۲۸۰

اقبال کے حضور میں ۹۵ (ح) - ۱۲۱ (ح) - ۱۲۴ (ح) - ۱۳۷ - ۱۹۱ (ح) - ۲۰۵ - ۲۵۲ - ۲۶۶ (ح) - ۲۸۷ - ۲۹۷

اقبال نامہ (حصہ اوّل) ۷۱ (ح) - ۹۹ - ۱۰۲ - ۱۰۶ (ح) - ۱۰۸ (ح) - ۱۰۹ - ۱۲۲ - ۱۲۳ - ۱۳۷ - ۱۴۰ (ح) - ۱۵۵ - ۱۷۹ - ۱۹۲ - ۱۹۲ - ۱۹۵ - ۲۰۴ - ۲۲۲ - ۲۲۳ (ح) - ۲۲۵ - ۲۲۹ (ح) - ۲۵۹

اقبال نامہ (حصہ دوم) ۱۴ - ۱۷ - ۱۸ - ۷۲ - ۱۰۲ - ۱۰۴ - ۱۰۵ - ۱۰۶ - ۱۰۷ - ۱۰۸ - ۱۴۰ - ۱۶۱ - ۱۶۸ - ۱۶۹ - ۱۹۷ - ۱۹۸ - ۱۹۹ - ۲۰۱ - ۲۰۴ - ۲۱۵ - ۲۱۹ - ۲۴۰ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۹۳

البلاغ (روزنامہ) ۲۲۸

التقدیر ۲۰۰

الکتشافات ۲۰۶

الجہاد فی الاسلام ۸۴

العروۃ الوثقیٰ (اخبار) ۲۸۳

الغزالی ۲۷۷

الفاروق ۲۷۷

القانون فی الطب ۱۹۱

المامون ۲۷۷

المعیشت ۱۰۶

امرت بازار پتریکا (اخبار) ۹۶

الموافقات ۱۱۹

انسائیکلو پیڈیا اطالیانہ ۶۲

انقلابِ اسلام ۹۹

انوارِ اقبال ۱۷۰-۱۷۱-۱۷۷-۲۰۰-۲۰۱-۲۲۱-۲۶۵-۲۶۶

اوراقِ گم گشتہ ۱۲-۷۰-۸۰-۸۵-۱۰۳-۱۰۴-۱۲۵-۱۶۸-۲۱۲

اورنگ زیب عالمگیر پہ ایک نظر ۲۷۷

الف لیلہٰ ۹۵

ب :

بادشاہی مسجد۔ تاریخِ فنِ تعمیر ۲۱۵

پاکستان ماضیہا و حاضرہا ۲۲۵

بالِ جبریل ۲۴-۲۷-۲۹-۳۰-۵۱-۵۴-۶۱-۱۱۹-۱۲۵-۱۲۷-۱۳۶-۱۴۶-۱۴۷-۱۸۰-۲۰۶-۲۳۱-۲۴۸-

بانگِ درا ۱۲۵-۲۳۱-۲۳۲

بائبل ۴۸۰

بلوغ الارب ۱۸۴ (ح)

پ :

پیامِ مشرق ۲۳۵

ت :

تاریخ ادبیات ایران ۱۰۶

تاریخ تصوف ۲۵۸

تاریخ سائنس (اوّل) ۲۰۸

تحقیق قربانی ۲۸۰

ترجمان القرآن ۸۴-۸۵-۲۷۸

تذکرہ شعرائے کشمیر ۱۹۴

تسویلاتِ فلسفہ ۲۰۴

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۲۰-۶۹-۱۵۷-۲۰۹

تفسیر جواہر القرآن ۲۸۹

تفسیر کشاف ۲۸۸

تہافتہ الفلاسفہ ۲۸۰

ٹ:

ٹریبیون (اخبار) ۹۶

ج:

جاوید نامہ: ۱۰-۲۰-۹۱-۱۲۰-۱۴۳-۱۹۹-۲۵۰-۲۸۴

ح:

حجتہ اللہ البالغہ ۱۵۲

حدیث اسماء الرجال ۲۹۲

حرفِ اقبال ۷۵-۷۹-۲۵۰-۲۵۴

حیاتِ اکبر ۲۲۰

حیاتِ انور ۲۱۴

حیاتِ جامی ۲۷۹

حیاتِ حافظ ۲۷۹

حیوانات کے نام سامی زبانوں میں ۱۰۸ (ح)

خ:

خطباتِ مدراس ۱۱۷ (ح)-۲۷۸

خوابِ ہستی ۲۸۷

د:

داؤد پوتہ ۱۸۲ (ح)-۱۸۳ (ح)

دکن میں اردو ۱۹۵

دکنی اردو ادبیات ۵۸

ڈ:

ڈیوائن کامیڈی ۲۸۴

ذ :

ذخیرۃ الملوک ۲۰۰
ذکرِ اقبال ۳۶- ۶۵ (ح)

ر :

رامائن ۵۶
رسالہ الحکم الرفاعیہ ۲۷۴
رسالہ ذخیرۃ الدنیہ ۲۰۲
رسالہ طریقت ۲۷۳
رقصِ ابلیس ۲۸۵
رموزِ بے خودی ۳۵
روزنامہ البلاغ ۲۲۸

ز :

زبورِ عجم ۴۴-۲۲۲
زمیندار ۲۲۰-۲۳۴-۲۳۵
زوالِ مغرب ۸۲

س :

سرِ اسرار ۱۹۷
سرودِ رفتہ ۷۷-۷۸
سوانح مولانا روم ۲۷۷
سیارہ (لاہور) ۸۵
سیاحتِ اقبال ۶۴-۲۲۷
سیرۃ النعمان ۲۷۷
سیرۃ النبیؐ ۲۷۷-۲۷۸

سیرۃ عائشہ رضؓ ۲۷۸

ش:

شاہنامہ ۱۸۵

شاطوالمنار ۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸

شعرالعجم ۱۹۴-۲۷۷

ص: صنوسمرتی ۲۷۵

صحیفہ (اقبال نمبر) ۹۸ (ح)

صحیح بخاری ۲۰۳-۲۸۵

صحیح مسلم ۲۷۸

ض:

ضربِ کلیم ۳۵ (ح)-۴۱ (ح)-۵۱ (ح)-۵۳-۵۵ (ح)-۶۱ (ح)-۶۲ (ح)-۱۱۴ (ح)-۱۱۶ (ح)-۱۱۹

ط:

علم الکلام ۲۷۷

علم الاقتصاد ۱۰۶-۲۴۸

ف:

فارسی میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء ۱۵۷

فتاویٰ رضویہ ۲۷۹

فتوحات ۲۰۳

فتوحاتِ مکیّہ ۲۸۷

فصوص الحکم ۲۰۲-۲۸۷

فلسفہ تمدنِ اسلام ۸۲

ق :

قرآن پاک، القرآن، حکیم، شریف ۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-
۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۹-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-
۳۵-۳۶-۳۷-۴۶-۶۳-۸۷-۹۱-۹۲-۱۰۹-۱۱۴-
۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۱-۱۲۵-۱۲۸-۱۳۰-۱۴۲-۱۴۸-
۱۴۹-۱۵۰-۱۵۷-۱۵۸-۱۶۱-۱۸۰-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۲۰۵-
۲۱۲-۲۳۲-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۵۲-۲۶۲-۲۷۵-
۲۷۹-۲۸۰-۲۸۵-۲۸۶-۲۹۰

قرآن و تفسیر ۲۹۳

ک :

کتاب الشفاء ۲۹۰

کتاب الطواسین ۲۵۸

کتاب الفجر ۲۶۱

کتابیات اسلامی معاشیات ۲۳۴

کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم ۱۱۸ (ح)

کلیاتِ فارسی (اقبال) ۳۷-۳۸-۴۱-۱۴۴-۱۴۶-۱۴۷-۱۶۳-۲۵۱-۲۵۶

کیمیائے سعادت ۲۸۹

گ :

گفتارِ اقبال ۲۰-۶۳-۸۱-۸۲-۱۲۱-۱۲۲-۱۵۰-۱۶۰-۱۶۷-
۲۳۸

ل :

لٹریری ہسٹری آف پرشیا ۲۰۱

لطائفِ غیبی ۱۰۵

لمعات ۹۱

م :

مآثرِ عالمگیری ۲۲۵
ماساۃ کشمیر (المیہ کشمیر) ۲۲۵
مخزن ۲۸۷
مرزا جی ۹۶
مثنوی رومی ۲۲-۱۹۱-۱۹۲
مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش ۱۱۵
مطالعۂ اقبال ۱۷۴
معارف ۲۰۰-۲۲۳-۲۳۰
مقالاتِ اقبال ۱۵۲-۱۲۴-۲۸۶
مقدمہ زندگانی محمد ۲۸۰
مکاتیب گرامی ۲۸ (ح)
مکتوبِ اقبال ۳۴ (ح)
ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ۲۲۲-۲۴۰
ملفوظات ۱۲ (ح)۔۲۱ (ح)۔۲۵ (ح)-۲۶ (ح)-۲۸ (ح)-
۲۹-۳۰ (ح)-۳۳ (ح)-۳۵ (ح)-۳۶ (ح)-۵۷ (ح)
۵۸ (ح)-۶۰-۸۲-۱۳۵ (ح)-۱۶۴ (ح)-۲۶۲
۲۶۳ (ح)
موازنہ صلیب و ہلال ۱۶۷-۱۶۸

ن :

نصیحۃ الملوک ۲۶ ۸ (ح)
نفحات الانس ۱۰۶-۲۶۳
نقدِ میر ۲۸۶
نیرنگِ ایران (رسالہ) ۲۶۹

و :

وقت ۹۱
وکیل (اخبار) ۲۵
ولی سے اقبال تک ۲۸۶

ہ :

ہاشمی ۶۴-۶۶-۱۰۰-۱۰۱-۱۵۳-۱۵۵-۱۶۰-۲۲۰-۲۲۷
ہزار داستان ۲۸۰
ہمایوں ۱۰۱

ی :

یادِ رفتگاں ۲۶۳
یورپ میں دکنی مخطوطات ۱۹۵

مقامات اور ادارے

ا :

آسٹریا ۲۰۵
آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ۸۱
آل انڈیا ریڈیو سٹیشن ۲۸۷
" " " لاہور ۲۵۳
آل انڈیا مسلم کانفرنس ۷۵
" محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۲۱۲ (ح)
اٹلی ۶۲-۶۴-۱۳۳-۱۳۴-۱۶۰-۱۶۶
ادارہ معارفِ اسلامیہ ۷۹-۸۱-۲۰۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۹۱
استنبول ۲۸۳
اسعد آباد (کابل) ۲۸۳
اسلامک ایجوکیشن کانگرس لاہور ۲۳۴

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۸۰

اسلامک کلچرل سنٹر حیدر آباد ۲۸۵

اسلامیہ کالج لاہور ۷۷-۷۹-۱۰۰-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۹-۲۱۷-۲۸۶-۲۸۷-۲۹۱

اشبیلیہ ۲۸۷-۲۹۱

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۲۱۴ (ح)

اعظم گڑھ ۲۱۹-۲۳۰-۲۷۷

افریقہ ۹-۵۶-۱۲۲-۱۹۰-۲۰۹-۲۲۹-۲۳۹-

افغانستان ۳۲-۴۳-۴۴-۵۵-۱۲۲-۲۳۸-۲۶۶ —
۲۷۹-۲۹۱

اقوام متحدہ ۲۸۵

الہ آباد ۱۹-۲۲۰-۲۸۸-۲۸۹

الحمراء (غرناطہ) ۶۵

انارکلی (بازار، لاہور) ۵۵

انجمن اتحاد و ترقی ۱۹

انجمن ادبی کابل ۴۳

انجمن اسلامیہ ۲۱۶-۲۱۷

انجمن ترقی اردو ۲۳۴

انجمن تیموریہ ۱۹

انجمن حمایت اسلام ۷۶-۷۸-۹۴-۱۰۳-۱۶۶-۲۱۷-۲۲۷-۲۲۸-۲۸۶

انجمن خدام الدین ۲۱۴-۲۱۶

اندلس، ہسپانیہ، سپین ۶۴-۶۵-۹۲-۱۶۵-۱۶۹-۲۰۵-۲۷۴-۲۸۵

انڈونیشیا ۱۹۰

انٹرکالجیٹ مسلم برادرہڈ ۷۵-۷۶

انگلستان ۴۶-۸۹-۱۳۶-۱۹۰-۲۴۷-۲۷۷-۲۸۶-۲۸۹

انگولا ۲۵۴

امرتسر ۲۵۹-۲۸۰

امریکہ ۳۳-۵۴-۵۵-۲۴۷-۲۷۱-۲۷۲

اورینٹل کالج لاہور ۱۰۶-۲۲۳-۲۸۶

ایران ۳۳-۵۷-۱۰۵-۱۱۵-۱۲۲-۱۲۳-۲۸۳-۲۸۷-۲۹۱

ایشیا ۹-۱۳۴-۱۵۲-۱۵۴-۲۰۹-۲۲۱-۲۴۲-۲۴۹

ایشیا (وسط) ۹۱-۲۷۴

ایشیا (وسطی اور مغربی) ۹۲

ایشیا (مغربی) ۲۷۴

ایشیا (مغربی اور وسط) ۷۱

ایشیائے کوچک ۲۸۷

ب :

بجنور ۲۷۸

بخارا ۱۹-۵۵-۵۶-۲۸۹

برصغیر ۸-۹-۱۳-۴۷-۶۶-۷۴-۷۶-۹۱-۱۰۲-۱۳۳-۱۵۲-۱۶۷-۱۸۹-۱۹۱-۲۳۰-۲۴۳-۲۶۷-۲۸۵

برطانیہ ۲۴۷

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۳۹

برطانوی فوج ۲۷۹

بزمِ اقبال ۳۴(ح) ۶۵(ح)

بغداد ۷۷-۹۵-۲۷۸-۲۸۷-۲۸۹

بلتستان ۲۶۱

بلخ ۲۸۳

بمبئے ۲۲۹

بنگال ۲۰

بنگلور ۱۰۴-۲۱۸

بہار ۱۹۰

بہاولپور ۸۲-۱۹۹-۲۳۰

بیت المقدس ۲۸۱

بریڈلا ہال لاہور ۲۱۵

بیروت ۳۳-۷۹

پ :

پاکستان ۱۹-۱۱۰-۲۲۵-۲۲۶-۲۴۵-۲۸۱-۲۸۵

پٹھانکوٹ ۷۹-۸۳-۸۵-۸۶-۸۹-۲۷۷

پشاور ۲۲۰-۲۳۰

پنجاب ۲۰-۷۵-۷۷-۷۸-۸۳-۸۵-۸۶-۸۷-۱۹۵-
۲۷۲-۲۵۷-۲۶۱-۲۷۹-۲۸۰

پنجاب لیجسلیٹو کونسل ۲۷۹ - ۲۸۰

پنجاب یونیورسٹی ۱۰۰-۲۸۵-۲۸۶

پیرس ۲۱۸-۲۲۵-۲۸۲-۲۸۸

ت :

تاجک ۲۹۳

تاج محل ۵۷-۶۵

تبت ۲۶۸

ترکی، ٹرکی ۳۳-۵۵-۱۳۲-۱۶۷-۲۷۷-۲۸۳-۲۸۹-۲۹۱

تکیہ ساوھواں (اندرون موچی گیٹ رنگ محل لاہور) ۲۱۷

تیونس ۱۷۵

ٹ :

ٹاؤن ہال لاہور ۸۰

ج :

جاپان ۲۱۰

جالندھر ۸۵

جامعہ الازہر، جامعہ عربیہ ۸۶ - ۸۸-۲۲۶ - ۲۲۷- ۲۸۱

جامعہ قرطبہ ۹۵

جامعہ مسجد (دہلی) ۱۹

جامعہ ملیہ ۲۷۹ - ۲۸۶

جاوا ۲۰۲ - ۲۰۵

جرمنی ۶۶

جزائر انڈیمان ۸ - ۲۸۹

جزیرۃ العرب ۲۸۵

جمال پور ۸۹

جمیعت العلماء ہند ۱۲۲- ۲۱۵ - ۲۱۶

جمیعت تبلیغ اسلام ۲۲۷

جموں ۲۰۱

جیراجپور ۲۷۹

چ :

چین ۱۹۵

ح :

حجاز ۱۷۰

حکومت پاکستان ۲۸۷

حکومتِ پنجاب ۹۶

حکومتِ ہند ۲۸۷

حیدرآباد دکن ۱۸-۷۹-۸۶- ۲۰۵-۲۱۸

خ:

خوارزم ۲۸۸

د:

دارالاسلام ۷۹-۸۳-۸۴-۸۵-۸۹-۲۰۵-۲۱۲

دارالمصنفین ۲۲۲-۲۲۳-۲۷۷

دجلہ ۱۶

دریائے کیب ۳۱

دمشق ۲۰۵-۲۸۷

دہلی ۱۹-۵۷-۸۶-۲۱۲ (ح)-۲۲۹-۲۸۵-۲۸۶

۲۸۹

دہلی انجمن رفیق المسلمین ۱۹

دیرہ دون ۲۸۷

دیوبند ۱۶۷-۲۷۸-۲۸۶

ڈ:

ڈابیل ۲۱۶-۲۱۷

ر:

رامپور ۲۰۴

راولپنڈی ۲۶۸

روم ۵۳-۷۷

روح القدس ۶۱

روم دیوناں ۵۰

رے ۲۹۰

س :

سپریم مسلم کونسل ۲۹۱

سرہند شریف ۲۸۲

سسلی ۱۶۵

سنٹرل مسلم یونتھ لیگ ۱۹

سوئٹزرلینڈ ۱۱۹

سہارنپور ۱۶۷

سیالکوٹ ۲۵۱

سینا ۷۶

ش :

شالامار باغ ۶۵

شام ۳۳-۷۷-۲۷۷-۲۸۵

شاہدرہ ۶۵

شاہی مسجد ۱۹-۶۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹

شمال مغربی سرحدی صوبہ ۲۶۷-۲۷۸

ص :

صوبائی مسلم کانفرنس دہلی ۱۹

صیقلیہ ۱۲۹

ط :

طبیہ کالج ۲۸۶

طوس ۲۸۹

ع :

عراق ۳۳

عرب کمیٹی برائے اتحاد ۲۸۱

عثمانی فوج ۲۸۷

علی گڑھ ۶۹-۹۸-۹۹-۱۰۳-۱۰۶-۱۲۳-۱۵۸-۲۱۸-
۲۲۰-۲۷۷-۲۷۹-۲۸۶

علی گڑھ یونیورسٹی ۱۹۸

غ :

غازی پور ۲۸۹

غرناطہ ۷۷

ف :

فرانس ۱۲۴-۲۵۹-۲۸۳

فری میسن تنظیم ۱۵۳

فلسطین ۱۶۵-۱۶۶-۱۹۷-۲۲۶-۲۴۶-۲۸۵

ق :

قاہرہ ۲۲۸

قسطنطنیہ یونیورسٹی ۲۹۳

قصرِ زہرا ۶۵

قومی کتب خانہ لاہور ۱۵۲

ک :

کابل ۲۸۴

کاشغر ۱۶۷

کانگرس (انڈین نیشنل) ۱۹ - ۹۶ - ۱۵۳

کتاب خانہ نورس لاہور ۲۱۵

کراچی ۲۷۸ - ۲۸۱

کشمیر ۲۰۰-۲۰۵-۲۶۷-۲۶۸-۲۸۵

کلیسا ۱۸۹

کوریا ۲۵۴

کعبہ ۳۳-۱۲۰

کوفہ ۲۸۲

کوہ مری ۹۴

کلکتہ ۹۶-۱۴۰

کیٹیا ۶۴

گ :

گورنمنٹ کالج لاہور ۱۰۹

گورنمنٹ کالج کی مجلسِ فلسفہ ۱۶۱

گلگت ۲۶۸ (ح)

ل :

لاہور ۱۴-۱۷-۱۸-۷۵-۷۶-۷۹-۸۰-۸۵-۹۶-
۱۵۷-۱۶۶-۱۹۸-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-
۲۲۲-۲۲۹-۲۳۰-۲۴۲-۲۶۰-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۵-
۲۸۸

لیجسلیٹو کونسل ۲۱۸

لندن ۱۹-۲۱-۱۹۰-۱۹۰-۲۸۶

لندن یونیورسٹی ۲۴۵-۲۷۹

لیبر یونین ۲۳۶

م :

مارسیلز ۶۳

مالٹا ۱۹۰-۲۸۶

مدارس ۲۹-۲۲۸

مدینہ منورہ ۲۷۳

مراکش ۲۸۵

مسجد قرطبہ ۲۸-۳۰-۵۰-۶۳-۶۴-۶۵-۱۶۵-۱۶۹-
۱۷۰-۱۹۰-۲۹۱

مسجد قوتِ اسلام ۵۷

مسلم انڈیا سوسائٹی ۲۳۷

مسلم لیگ ۲۳۷-۲۴۵-۲۴۷-۲۷۸

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۸۹-۲۴۰-۲۹۲

مشرق ۲۳۱-۲۴۹

مشرقِ وسطیٰ ۱۰۲

مصر ۵۶-۷۷-۱۲۲-۱۶۱-۱۶۵-۲۲۶-۲۳-
۲۷۷-۲۸۳-۲۸۷-۲۹۱

مصر و ایران ۱۶۱

مغرب ۹-۲۴-۵۴-۶۳-۹۹-۱۰۱-۱۰۲-۱۱۱-۱۱۲-
۱۱۳-۱۱۷-۱۱۹-۱۲۱-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-
۱۳۲-۱۳۶-۱۳۹-۱۴۵-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۱-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۲-۲۰۹-
۲۱۰-۲۳۶-۲۴۷-۲۴۹-۲۵۰-۲۶۶-۲۹۱

مکہ معظمہ ۲۸۶-۲۸۷

ملتان ۲۸۲
مورس کالج ۱۰۰
موریلینڈ ۲۴۴
موصل ۲۸۷
میرٹھ ۲۸۰
میسور ۲۱۸

ن :

ناگپور ۱۰۰
نجیب آباد ۲۸۸
ندوہ، دارالعلوم ۱۲۳-۲۷۷
نگر ۲۶۸ (ح)
نیشاپور ۲۸۳-۲۸۹
نیل (دریا) ۵۲

و :

وائی ایم سی اے ہال لاہور ۸۰
ورلڈ مسلم کانفرنس ۲۸۱
ویمر ۷۰

ہ :

ہمدان ۲۸۹
ہندوستان ۵۱-۵۲-۵۵-۵۷-۶۲-۶۸-۶۹-۷۲-۷۸-
۸۶-۸۸-۹۹-۱۲۲-۱۲۳-۱۳۲-۱۵۴-۱۵۹-۱۶۱-۱۶۶-۱۶۷-
۱۷۰-۱۷۱-۱۸۷-۱۹۰-۱۹۸-۲۰۳-۲۱۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۷-۲۲۸-
۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۳-۲۳۶-۲۴۱-۲۴۳-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۹-

۲۷۰-۲۷۷-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۶-۲۹۲

ہندوستان (اسلامی) ۲۴۷

ہندوستان (جنوبی) ۸۵-۱۰۴

ہندوستان (شمال مغربی) ۸-۲۴۶

ہندوستان (شمالی) ۸۵

ہوشیار پور ۲۸۸

ی :

یمن ۱۱۸-۱۸۷

یُوپی ۲۷۸

یورپ ۹-۳۳-۳۶-۳۷-۵۷-۹۱-۹۲-۹۷-۱۲۲-۱۲۳-
۱۲۸-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۴-۱۵۵-
۱۵۶-۱۶۵-۱۹۰-۲۰۵-۲۰۸-۲۰۹-۲۲۳-۲۳۵-۲۳۷-۲۶۵-
۲۷۱-۲۷۲-۲۸۵

یونان ۲۳۷

یونیورسٹی، لائبریری ۲۰۱

